احمد یار خان

سنگیتا شراب اور سگریٹ

جذبات کی دنیا میں زلزلے بپا کر دینے والی جرم و سزا کی سچی کہانیاں

مکتبہ داستان

سنگیتا سگریٹ اور شراب

اس نوجوان لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ بڑے بڑے چالاک اور عیار گواہ اور مشتبے میری تفتیشوں میں سے گزر چکے ہیں اور مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ شخص دل کی بات کہہ رہا ہے یا مجھے الو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

میری ڈائریوں میں چند ایک تفتیشیں ایسی ہیں جو میں مختصر سی کہانیوں کی صورت میں نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ ان کی تفصیلات ایسی ہیں جو کتابی صورت میں ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ جو تفتیشی کہانی سنانے لگا ہوں۔

یہ اُسی عرصہ کی واردات ہے جب میں سی آئی اے میں ہوا کرتا تھا۔ اس دور کی پہلے بھی کچھ تفتیشیں سنا چکا ہوں۔ ایک روز ہمارے انگریز ایس پی نے مجھے اور ایک انگریز انسپکٹر اینڈریو کو اپنے دفتر میں بلایا اور ایک قتل کی واردات کی تفتیش ہمیں دی۔ ایک مسلمان نوجوان جس کی عمر بیس اکیس سال تھی دس بارہ دن پہلے قتل ہو گیا تھا۔ متعلقہ تھانہ تفتیش کر رہا تھا لیکن قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ایس پی نے وجہ بتائی کہ یہ کیس سی آئی اے میں کیوں آیا ہے۔

وجہ یہ بتائی کہ مقتول کے باپ نے آئی جی کو درخواست دی تھی اور خود بھی پیش ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ علاقے کا تھانیدار تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا اور جب مقتول کا باپ تھانے جاتا ہے تو تھانیدار اس کے ساتھ بے رخی کا رویہ اختیار کرتا اور کبھی ڈانٹ بھی دیتا ہے۔

مقتول کے باپ نے یہ بھی کہا تھا تھانیدار کے اس رویے کی وجہ یہ ہے کہ مقتول کی دوستی ایک ہندو لڑکی کے ساتھ تھی اور یہ لڑکی مسلمان ہو کر مقتول کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ مقتول کے باپ کو یہ شک تھا ہندوؤں کو لڑکی کے ارادے کا پتہ چل گیا ہو گا اور انہوں نے اس مسلمان نوجوان کو قتل کر دیا ہے۔ تھانیدار بھی ہندو تھا اور وہ صاف طور پر تعصب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ قاتل پکڑا جائے کیونکہ قاتل ہندو ہی ہو سکتا تھا اور تھانیدار ہندوؤں کی وجہ سے قاتل پر پردہ ڈالے رکھنے کی کوشش میں تھا۔

آئی جی انگریز تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کے جو لوگ ابھی زندہ ہیں ان سے پوچھیں، عدل و انصاف کے معاملے میں انگریز بڑا ہی سخت رویہ رکھتا تھا۔ قانون کے آگے کوئی چھوٹا

اور کوئی بڑا نہیں تھا، نہ کوئی حاکم نہ کوئی محکوم۔ قانون سب کے لئے برابر تھا۔ ہمارے آج کے سیاسی حکمرانوں کی طرح نہیں جو تقریریں ہی کرتے رہتے ہیں کہ عام آدمی کو انصاف اس کے دروازے پر ملے گا مگر قانون کا کوئی احترام نہیں نہ انصاف کہیں نظر آتا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے قانون بھی اس کا اور انصاف بھی اسی کے لئے ہے۔

مقتول کے باپ کی درخواست پر آئی جی نے فوری طور پر حکم جاری کر دیا۔ اس نے علاقہ تھانیدار کی کھچائی کرنے کی بجائے کیس کی تفتیش سی آئی اے کے حوالے کر دی۔ اس نے کہا کہ لڑکی ہندو ہے اور وہ مسلمان ہونا چاہتی تھی اور لڑکا مسلمان ہے اس لئے یہ تفتیش دیانتداری سے اور احتیاط سے کی جائے اور یہ پیش نظر رکھا جائے کہ یہ واردات ہندو مسلم فساد کا باعث بن سکتی ہے۔

''دیکھو ملک!'' ــــ ایس پی نے مجھے کہا ــــ ''میں انسپکٹر اینڈریو کے ساتھ تمہیں اس لئے لگا رہا ہوں کہ اس تفتیش میں تم ہی کچھ کر سکو گے لیکن یہ تفتیش اس طرح کرنا کہ یہ بھول جانا کہ تم مسلمان ہو۔ اس وقت قانون کو اپنا مذہب سمجھنا میں اینڈریو کے ساتھ کسی ہندو انسپکٹر کو یہ کیس دے سکتا تھا لیکن ہندو مسلمانوں کے معاملے میں زیادہ متعصب ہوتے ہیں۔ میں تمہیں ذاتی طور پر جانتا ہوں، تم کشادہ ظرف مسلمان ہو''۔

یہ انگریز ایس پی مجھے پھوک نہیں دے رہا تھا۔ انگریز صاف گو ہوا کرتے تھے۔ مجھ میں اگر کوئی خامی یا کمزوری ہوتی تو وہ یوں کہتا کہ تم میں یہ خامی ہے اور اس کا دھیان رکھنا۔ میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ انگریز افسروں نے کم از کم مجھے کبھی اپنا ماتحت یا غلام نہیں سمجھا تھا۔ میں نے کبھی خوشامد نہیں کی تھی، یہ میری دیانتداری اور فرض کی لگن کا صلہ تھا جو انگریز مجھے دیتے رہتے تھے۔ قتل کی تفتیش میں کچھ زیادہ ہی تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ قتل کے زیادہ تر کیس مجھے دیا کرتے تھے۔

اب میں آپ کو واردات سناتا ہوں۔ میں اور انسپکٹر اینڈریو متعلقہ تھانے میں چلے گئے۔ کیس کی فائل کھول کر سامنے رکھی اور ایس ایچ او سب انسپکٹر ہرچرن داس سے کہا کہ پہلے وہ سنائے کہ واردات کس طرح ہوئی اور گزرے ہوئے دس بارہ دنوں میں اس نے کیا تفتیش کی اور کیا سراغ ملا۔

اس نے سنایا کہ دس بارہ روز پہلے علی الصبح اسے اطلاع ملی کہ ایک نوجوان مسلمان کی لاش گراؤنڈ میں پڑی ہے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ تین چار آدمیوں نے اس نوجوان کو قتل

ہوتے دیکھا تھا...... مقتول کا نام تو کچھ اور تھا لیکن میں اسے لطیف لکھوں گا۔ مجھے معلوم تو نہیں، یہ میرا خیال ہے کہ مقتول کا خاندان پاکستان میں آ کر آباد ہو گیا ہو گا اور میں اس خاندان کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا...... تین آدمی تھانے میں اطلاع دینے آئے تھے۔ مقتول کچھ ہی دیر پہلے قتل ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مقتول گراؤنڈ میں دوڑ لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی سٹک تھی۔

یہ ایک کھلا اور ہموار میدان تھا جس کے اردگرد بڑے اچھے درخت تھے۔ اس میدان میں ہاکی گراؤنڈ بنی ہوئی تھی اور ایک فٹ بال گراؤنڈ بھی تھی اور اس سے الگ ہٹ کر ٹینس کورٹ بھی بنی ہوئی تھی۔ صبح منہ اندھیرے کئی لوگ، زیادہ تر ہندو اس میدان میں سیر، دوڑ اور ورزش کے لئے جایا کرتے تھے۔ ان گواہوں نے دیکھا کہ میدان کے ایک کونے میں دو آدمیوں نے ایک نوجوان لڑکے پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھڑی تھی اور دوسرے نے مقتول سے اس کی ہاکی سٹک چھین لی اور اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے ادھر دیکھا لیکن کوئی مدد کو نہ پہنچا۔ کوئی پہنچتا بھی تو حملہ آوروں کو پکڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مقتول گر پڑا اور دونوں حملہ آور بھاگ گئے۔

صبح ابھی ابھی طلوع ہو رہی تھی اور روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ کچھ دور سے نظر آ جاتا تھا۔ میدان سے تھوڑی ہی دور سڑک گزرتی تھی سڑک اور میدان کے درمیان ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ اور گھوڑا تو ٹھیک طرح نظر آتے تھے اور یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ ایک آدمی تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے لیکن اس کا چہرہ ٹھیک طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

مقتول گرا تو حملہ آور تانگے کی طرف دوڑے اور پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ تانگہ فوراً چل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑی تیز رفتاری سے غائب ہو گیا۔ تانگے کی نشانی یہ تھی کہ سیاہ رنگ کا تھا اور گھوڑے کا رنگ سفید تھا اور اس پر بڑے بڑے براؤن یا کچھ اسی رنگ کے دھبے تھے۔ تانگے کے سیاہ رنگ سے ہی ظاہر ہو گیا کہ یہ کسی کا پرائیویٹ تانگہ تھا۔ کرائے والے تانگوں کا وہی رنگ ہوتا تھا جو آج کل شہروں کے تانگوں کا ہوتا ہے۔ ان موقع کے گواہوں نے یہ بھی بتایا کہ گھوڑا بڑا ہی تندرست اور موٹا تازہ تھا۔

لوگ مقتول کی طرف دوڑے اور جا کر دیکھا، وہ مر چکا تھا۔ وہ کاروں اور موٹر سائیکلوں کا زمانہ نہیں تھا۔ کسی بڑے ہی امیر آدمی کے پاس کار ہوتی تھی۔ سکوٹر کا تو ابھی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ موٹر سائیکل بھی کم ہی کسی کے پاس ہو گا۔ اگر وہاں کسی کی کار ہوتی یا موٹر

سائیکل ہوتا تو وہ تانگے کے تعاقب میں جاتا۔ اب یہ لوگ یہی کر سکتے تھے کہ تھانے اطلاع دے دیں۔ اس طرح یہ تین آدمی تھانے جا پہنچے۔

وہاں کچھ ایسے لوگ تھے جو مقتول لطیف کو جانتے تھے۔ وہ ہاکی کا مشہور کھلاڑی تھا اور لڑکوں نے اپنی ٹیم بنا رکھی تھی۔ مقتول ہر صبح منہ اندھیرے اس میدان میں آتا۔ دوڑ لگاتا اور پھر اس کی ٹیم کے تین چار کھلاڑی آ جاتے اور مل کر پریکٹس کیا کرتے تھے۔ مقتول بی اے پاس تھا۔ ایک دو آدمیوں کو اس کے گھر کا بھی علم تھا۔ انہوں نے اس کے گھر جا کر اطلاع دی اور اس طرح اس کا باپ موقعۂ واردات پر پہنچ گیا۔

سب انسپکٹر ہرچرن داس نے وہی کارروائی کی جو میں آپ کو اپنی کہانیوں میں سنایا کرتا ہوں۔ موقعہ واردات پر جا کر لاش دیکھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ دیکھ کر لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ضربوں کی یہ تفصیل آئی تھی کہ مقتول کو ڈنڈوں سے مارا گیا اور ایک ڈنڈا یا ہاکی سٹک کی ضرب کنپٹی پر اتنی زور سے لگی کہ وہاں ابھار پیدا ہو گیا اور اسی ضرب سے دماغ کو ایسا نقصان پہنچا کہ اندر سے خون رسنا شروع ہو گیا۔ اس ضرب سے موت واقع ہوئی تھی۔

''یہ انتقامی قتل ہے''۔۔۔ میں نے انسپکٹر اینڈریو سے کہا۔۔۔ ''بڑی شدید عداوت اس قتل کا باعث ہے''۔

انسپکٹر اینڈریو بچہ یا اناڑی نہیں تھا۔ اس کی رائے بھی یہی تھی۔

لڑکا مسلمان لڑکی ہندو، انجام موت

یہ ساری روئیداد سن کر انسپکٹر اینڈریو نے ہرچرن داس سے پوچھا کہ اس نے اب تک کیا تفتیش کی ہے اور وہ کسی حتمی رائے تک پہنچا ہے یا نہیں...... ہرچرن داس نے بتایا کہ مقتول لڑکا جھگڑالو طبیعت کا شخص تھا اور ذرا ذرا سی بات پر لڑائی مول لے لیتا تھا۔ ظاہری طور پر اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی لیکن ایسے اشارے ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مقتول راہ جاتی لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بدتمیزی کیا کرتا تھا۔ کسی غیرت مند نے اسے اسی وجہ سے مار دیا یا مروا دیا ہو گا۔

میں نے سب انسپکٹر ہرچرن داس کی یہ باتیں تفصیل سے نہیں سنائیں، صرف یہ مختصر سی بات بطور نمونہ سنائی ہے۔ وہ جوں جوں بولتا جا رہا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ یہ ثابت

کرنا چاہتا ہے کہ مقتول اپنی کسی غلطی یا زیادتی کی وجہ سے قتل ہوا ہے اور وہ بداخلاق آدمی تھا۔ ہرچرن کو معلوم نہیں تھا کہ ہمیں اپنا ہی ایس پی بتا چکا ہے کہ ایک ہندولڑکی کے ساتھ مقتول کی دوستی تھی۔

''ایک بات بتاؤ ہرچرن!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''سنا ہے اس واردات میں کسی لڑکی کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ کوئی ہندولڑکی ہے، اس کا کیا چکر ہے؟''

میں نے صاف طور پر دیکھا کہ ہرچرن ذرا چونکا اور کچھ گھبرایا اور پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''ہاں ملک صاحب!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے بھی سنا تھا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مقتول نے ایک ہندولڑکی کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکی اس کے ہاتھ نہ آئی اور یہ بات اسی پر ختم ہوگئی''۔

میں نے اس سلسلے میں دو تین اور سوال کئے اور انسپکٹر اینڈریو نے بھی کچھ پوچھا۔ ہرچرن داس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ سیدھے طریقے سے جھوٹ بھی نہ بول سکا۔ میں نے اور اینڈریو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اینڈریو میرا یہ ردعمل سمجھ گیا تھا۔ میں نے فائل اٹھائی اور ہم دونوں تھانے سے نکل آئے۔

یہ شخص صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ اس ہندولڑکی کا تفتیش میں ذکر یا اشارہ نہ آئے۔ انسپکٹر اینڈریو نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا نوٹ کیا ہے۔ میں نے اسے بتایا۔ یہ بات اینڈریو نے بھی نوٹ کی تھی۔ ہمیں ہرچرن داس کی رہنمائی اور اس کے تعاون کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمیں اپنے کرائمز ہیڈکوارٹر میں بیٹھ کر اپنے طور پر تفتیش کرنی تھی۔

شاید بعض قارئین نہ سمجھ سکے ہوں کہ ہم نے سب انسپکٹر ہرچرن داس پر کیا شک کیا تھا اور کیوں کیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور وہ اگر جھوٹ ہی بول رہا تھا تو کیوں بول رہا تھا۔ میں اس کا پس منظر بیان کرلوں تو پھر کہانی آگے سناؤں گا۔

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کا جانی دشمن ہے اور وہ اسلام کے وجود کو برداشت ہی نہیں کرسکتا۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی جو نفرت اور حقارت پائی جاتی ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے ہندوؤں کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ ایسا ساری دنیا میں ہوتا ہے کہ کسی عورت کو کسی غیر مذہب کا کوئی آدمی اچھا لگتا ہے یا

کسی مرد کو غیر مذہب کی عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو دونوں میں سے ایک اپنا مذہب تبدیل کر لیتا ہے اور ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں لیکن ہندوؤں کے ہاں کوئی اور ہی رواج ہے۔ کوئی ہندو آدمی کسی مسلمان عورت کو اپنے مذہب میں لا کر شادی کرے تو ہندو اسے بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن کوئی ہندو عورت اسلام قبول کر کے کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرنے تو ہندو اس مسلمان کے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ انگریزوں کے وقتوں میں اسی بات پر ہندو مسلم فساد بھی ہوئے ہیں جس میں کئی مسلمان مارے بھی گئے زخمی بھی ہوئے۔

پھر جب 14 اگست 1947ء کے روز ہندوستان تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا تو ہندوؤں نے اس سلسلے میں اپنی پالیسی اور زیادہ سخت کر دی۔ اب تو ہندو کا اپنا راج تھا۔ ایسا کوئی قانون تو نہ تھا لیکن ہندوؤں کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ کوئی مسلمان کسی ہندولڑکی کے ساتھ دوستی پیدا کر لیتا ہے تو یہ ایک جرم سمجھا جاتا ہے جس کی سزا موت ہے۔ وہ مسلمان پراسرار طریقے سے قتل ہو جاتا ہے یا کسی نہ کسی بہانے ہندو اس کے محلے یا آبادی پر ہلہ بول کر متعدد مسلمانوں کو مار ڈالتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کو ہندو امن اور بنی نوع انسان کی محبت کا اوتار کہتے ہیں۔ مہاتما گاندھی اٹھتے بیٹھتے ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کی رٹ لگائے رکھتا تھا لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ کوئی ہندولڑکی کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرے۔

آگے چل کر ہندوؤں نے بلکہ ہندوؤں کے برسراقتدار لیڈروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اچھے اچھے معزز اور خوشحال مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کو کالجوں میں وظیفے دینے شروع کر دیئے اور سرکاری دفتروں میں مسلمان لڑکیوں کو بڑی اچھی ملازمتیں دی جانے لگیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ہندو سرکاری طور پر ان مسلمان لڑکیوں کو بے دریغ مراعات دیتے ہیں اور ان کے والدین پر بھی نوازشات کرتے ہیں اور پھر ان لڑکیوں کو ہندولڑکوں کے ساتھ بیاہ دیتے ہیں۔ ایسے مسلمان والدین ہندوؤں کے احسانات کے نیچے اس قدر دبے ہوتے ہیں کہ وہ اعتراض نہیں کرتے اور اپنی بیٹی ہندوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ لڑکی ہندو ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو یوں ہوتا رہا ہے کہ کسی علاقے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو کئی طریقوں سے اس قدر دہشت زدہ کیا کہ ان کی ایک دو بیٹیاں اڑا لیں یا باقاعدہ حملہ کر کے

دو تین لڑکیاں اغوا کر لیں اور جبراً انہیں ہندو بنا کر ہندوؤں کے ساتھ بیاہ دیا لیکن بھارتی حکومت نے بہتر طریقہ یہ سوچا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے یعنی مسلمانوں کو نوازشات اور مراعات کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے اور ان کی بیٹیاں ہتھیا لی جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں کا یہ طریقہ کار پوری طرح کامیاب ہو رہا ہے لیکن کوئی ہندو لڑکی اپنا مذہب چھوڑ کر کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرے تو میں بتا چکا ہوں کہ اس مسلمان کو کس انجام تک پہنچایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھارت کے بڑے ہی مشہور قانون دان اور سیاستدان تھے۔ کئی سال گزرے انہوں نے وہاں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی جس کا موضوع یہی تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کا کیا رویہ ہے۔ انہوں نے اعداد و شمار اور کچھ زندہ مثالیں پیش کر کے اپنا نکتہ نظر واضح کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب مسلمان لڑکوں اور ہندو لڑکیوں کی آپس میں شادی کے متعلق تھا۔ میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ یہ پورا باب ترجمہ کر کے پیش کروں لیکن میں اصل کہانی سے ہٹ جاؤں گا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی ہندو لڑکی نے کسی مسلمان شخص کے ساتھ شادی کر لی تو یہ معاملہ ہائیکورٹ بلکہ سپریم کورٹ تک پہنچایا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے ہندو جج بھی اس معاملے میں مسلمانوں کے خلاف ہندوانہ تعصب کا مظاہرہ کرتے اور مسلمانوں کے خلاف فیصلے دیتے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ اب یعنی حال ہی میں بھارت کے دو یا تین صوبوں کی حکومتوں نے باقاعدہ قانون بنا دیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا اور یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی کہ ہندو عورت اپنی مرضی سے اس مسلمان کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس جرم کی باقاعدہ سزائیں مقرر کر دی گئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں جو بات واضح کرنا چاہتا تھا وہ واضح ہو گئی ہے۔ میں اور انسپکٹر اینڈریو سب انسپکٹر ہرچرن داس پر جو دروغ گوئی کا شک کر رہے تھے وہ اسی پس منظر میں تھا۔ وہ اس قتل کی واردات میں ہندو لڑکی پر پردہ ڈال رہا تھا اور مقتول کو بہت برا اور بداخلاق ثابت کر رہا تھا۔ اسے یقیناً یہ خیال آ گیا تھا کہ مقتول نے اس ہندو لڑکی کے ساتھ بڑی گہری دوستی چلا رکھی تھی۔ اس لئے اس کے قاتل ہندو ہی ہوں گے، لہٰذا یہ ثابت ہی نہ ہونے دیا جائے کہ واردات کا باعث کوئی ہندو لڑکی تھی ورنہ قتل کا شک اس لڑکی کے لواحقین یا

دیگر ہندوؤں پر ہوگا۔ ہرچرن داس دراصل قتل کی اس واردات کو عدم پتہ قرار دینے کی کوشش میں تھا۔ معلوم نہیں وہ اس خوش فہمی میں کس طرح مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ سی آئی اے کے دو انسپکٹروں کو بے وقوف بنا لے گا جن میں ایک انسپکٹر انگریز تھا۔

یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ ہمارا شک تھا کہ قاتل ہندو ہوں گے اور قتل کا باعث مقتول کی اس ہندو لڑکی کے ساتھ محبت ہوگی۔ قتل کا باعث کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اگر ایک ہی شک کو سامنے رکھ کر تفتیش کی جائے تو اتفاق کی بات ہوتی ہے کہ یہی شک صحیح نکلے لیکن عام طور پر تفتیش میں ناکامی ہوتی ہے۔ یہ تو میں نے اس ہندو تھانیدار کی ذہنیت اور اس کے رویے کی بات سنائی ہے۔

مقتول کے گھر کا ایڈریس فائل میں موجود تھا۔ ہم نے سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلانا بہتر سمجھا اور بلوا لیا...... یہ شخص لباس، ڈیل ڈول اور انداز سے صحیح معنوں میں معزز لگتا تھا اور پھر پتہ چلا کہ یہ معزز آدمی اپنا ایک وقار اور معاشرے میں مقام رکھتا ہے۔ اس نے جب بات شروع کی تو میں نے دیکھا کہ خود اعتمادی سے بولتا تھا۔ نوجوان بیٹے کا غم تو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ کسی وقت بھی جذباتی نہ ہوا۔

پوچھ گچھ کی ابتدا انسپکٹر اینڈریو نے کی۔ یہ انگریز اردو روانی سے بولتا اور سمجھتا تھا، اور اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ مجھ سے وہ پنجابی بول چال بھی سیکھ رہا تھا۔ اس نے مقتول کے باپ سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کے بیٹے کا دشمن کون تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ جہاں تک اسے معلوم ہے، اس کا دشمن کوئی بھی نہیں تھا جو اسے دشمنی کی بنا پر قتل ہی کر دیتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا بیٹا زندہ دل لڑکا تھا۔ مقتول بی اے پاس تھا اور بڑے اچھے نمبروں پر پاس ہوا تھا۔ یہ تو پہلے بتا چکا ہوں کہ مقتول کالج میں ہاکی ٹیم کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا اور تعلیم سے فارغ ہو کر بھی ہاکی کھیلتا تھا۔

''وہ شاید لڑنے جھگڑنے والا لڑکا تھا'' ـــــ اینڈریو نے مقتول کے متعلق پوچھا ـــــ ''کبھی آپ کو ایسی شکایت یا اطلاع ملی ہے کہ آپ کا بیٹا کبھی کسی کے ساتھ لڑائی مار کٹائی کی حد تک لڑا ہو؟''......

''میری ایک بات پر غور کریں صاحب!'' ـــــ مقتول کے باپ نے کہا ـــــ ''یہ آپ میرے بیٹے کے دوستوں سے پوچھیں کہ وہ اخلاقی لحاظ سے کیسا تھا اور اس کا چال چلن کیا تھا۔ ایک تو ہاکی کی پوری ٹیم، بیٹے کے پرانے کلاس فیلو اور دو تین لڑکے اس کے گہرے

دو تین لڑکیاں اغوا کرلیں اور جبراً انہیں ہندو بنا کر ہندوؤں کے ساتھ بیاہ دیا لیکن بھارتی حکومت نے بہتر طریقہ یہ سوچا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے یعنی مسلمانوں کو نوازشات اور مراعات کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے اور ان کی بیٹیاں ہتھیا لی جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں کا یہ طریقہ کار پوری طرح کامیاب ہو رہا ہے لیکن کوئی ہندو لڑکی اپنا مذہب چھوڑ کر کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرے تو میں بتا چکا ہوں کہ اس مسلمان کو کس انجام تک پہنچایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھارت کے بڑے ہی مشہور قانون دان اور سیاستدان تھے۔ کئی سال گزرے انہوں نے وہاں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی جس کا موضوع یہی تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کا کیا رویہ ہے۔ انہوں نے اعداد و شمار اور کچھ زندہ مثالیں پیش کر کے اپنا نکتہ نظر واضح کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب مسلمان لڑکوں اور ہندو لڑکیوں کی آپس میں شادی کے متعلق تھا۔ میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ یہ پورا باب ترجمہ کر کے پیش کروں لیکن میں اصل کہانی سے ہٹ جاؤں گا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی ہندو لڑکی نے کسی مسلمان شخص کے ساتھ شادی کر لی تو یہ معاملہ ہائیکورٹ بلکہ سپریم کورٹ تک پہنچایا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے ہندو جج بھی اس معاملے میں مسلمانوں کے خلاف ہندوانہ تعصب کا مظاہرہ کرتے اور مسلمانوں کے خلاف فیصلے دیتے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ اب یعنی حال ہی میں بھارت کے دو یا تین صوبوں کی حکومتوں نے باقاعدہ قانون بنا دیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا اور یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی کہ ہندو عورت اپنی مرضی سے اس مسلمان کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس جرم کی باقاعدہ سزائیں مقرر کر دی گئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں جو بات واضح کرنا چاہتا تھا وہ واضح ہو گئی ہے۔ میں اور انسپکٹر اینڈریو سب انسپکٹر ہرچرن داس پر جو دروغ گوئی کا شک کر رہے تھے وہ اسی پس منظر میں تھا۔ وہ اس قتل کی واردات میں ہندو لڑکی پر پردہ ڈال رہا تھا اور مقتول کو بہت برا اور بداخلاق ثابت کر رہا تھا۔ اسے یقیناً یہ خیال آ گیا تھا کہ مقتول نے اس ہندو لڑکی کے ساتھ بڑی گہری دوستی چلا رکھی تھی۔ اس لئے اس کے قاتل ہندو ہی ہوں گے، لہٰذا یہ ثابت ہی نہ ہونے دیا جائے کہ واردات کا باعث کوئی ہندو لڑکی تھی ورنہ قتل کا شک اس لڑکی کے لواحقین یا

دیگر ہندوؤں پر ہوگا۔ ہرچرن داس دراصل قتل کی اس واردات کو عدم پتہ قرار دینے کی کوشش میں تھا۔ معلوم نہیں وہ اس خوش فہمی میں کس طرح مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ سی آئی اے کے دو انسپکٹروں کو بے وقوف بنا لے گا جن میں ایک انسپکٹر انگریز تھا۔

یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ ہمارا شک تھا کہ قاتل ہندو ہوں گے اور قتل کا باعث مقتول کی اس ہندو لڑکی کے ساتھ محبت ہوگی۔ قتل کا باعث کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اگر ایک ہی شک کو سامنے رکھ کر تفتیش کی جائے تو اتفاق کی بات ہوتی ہے کہ یہی شک صحیح نکلے لیکن عام طور پر تفتیش میں ناکامی ہوتی ہے۔ یہ تو میں نے اس ہندو تھانیدار کی ذہنیت اور اس کے رویے کی بات سنائی ہے۔

مقتول کے گھر کا ایڈریس فائل میں موجود تھا۔ ہم نے سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلانا بہتر سمجھا اور بلوا لیا...... یہ شخص لباس، ڈیل ڈول اور انداز سے صحیح معنوں میں معزز لگتا تھا اور پھر پتہ چلا کہ یہ معزز آدمی اپنا ایک وقار اور معاشرے میں مقام رکھتا ہے۔ اس نے جب بات شروع کی تو میں نے دیکھا کہ خود اعتمادی سے بولتا تھا۔ نوجوان بیٹے کا غم تو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ کسی وقت بھی جذباتی نہ ہوا۔

پوچھ گچھ کی ابتدا انسپکٹر اینڈریو نے کی۔ یہ انگریز اردو روانی سے بولتا اور سمجھتا تھا، اور اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ مجھ سے وہ پنجابی بول چال بھی سیکھ رہا تھا۔ اس نے مقتول کے باپ سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کے بیٹے کا دشمن کون تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ جہاں تک اسے معلوم ہے، اس کا دشمن کوئی بھی نہیں تھا جو اسے دشمنی کی بنا پر قتل ہی کر دیتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا بیٹا زندہ دل لڑکا تھا۔ مقتول بی اے پاس تھا اور بڑے اچھے نمبروں پر پاس ہوا تھا۔ یہ تو پہلے بتا چکا ہوں کہ مقتول کالج میں ہاکی ٹیم کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا اور تعلیم سے فارغ ہو کر بھی ہاکی کھیلتا تھا۔

’’وہ شاید لڑنے جھگڑنے والا لڑکا تھا‘‘ ـــــ اینڈریو نے مقتول کے متعلق پوچھا ـــــ ’’کبھی آپ کو ایسی شکایت یا اطلاع ملی ہے کہ آپ کا بیٹا کبھی کسی کے ساتھ لڑائی مارکٹائی کی حد تک لڑا ہو؟‘‘......

’’میری ایک بات پر غور کریں صاحب!‘‘ ـــــ مقتول کے باپ نے کہا ـــــ ’’یہ آپ میرے بیٹے کے دوستوں سے پوچھیں کہ وہ اخلاقی لحاظ سے کیسا تھا اور اس کا چال چلن کیا تھا۔ ایک تو ہاکی کی پوری ٹیم، بیٹے کے پرانے کلاس فیلو اور دو تین لڑکے اس کے گہرے

دوست بھی ہیں۔ بہتر ہے آپ ان سے پوچھیں، کچھ کے ایڈریس میں دے دوں گا۔ میں آپ کے سوال کا یہی جواب دوں گا کہ مجھے اس کے خلاف کس کے۔ ساتھ لڑائی جھگڑے کی شکایت یا رپورٹ نہیں ملی تھی''۔

یہ تو ہم نے مختلف ذرائع سے معلوم کرنا ہی تھا کہ مقتول کی دوستی اور دشمنی کس کے ساتھ تھی اور اخلاقی لحاظ سے وہ کیسا تھا۔ اس کے باپ سے ہم نے پوچھا کہ یہ کسی ہندو لڑکی کا معاملہ کیا ہے، کیا مقتول کے کسی ہندو لڑکی کے ساتھ مراسم تھے؟

''ہاں صاحب!''___ اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا___ ''اس سوال کا صحیح جواب دوں گا۔ صحیح اس لئے کہ بیٹے نے خود میرے ساتھ اس لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ اس لڑکی کا نام سنگیتا ہے۔ میرے بیٹے کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ ایک مہینہ اور کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ بیٹے نے پہلے اپنی ماں کو بتایا پھر میرے ساتھ براہ راست بات کی۔ کہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کی کالج کے وقتوں کی پاکیزہ دوستی ہے اور وہ اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہے...... میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ لڑکی کا باپ کون ہے اور وہ کس سٹینڈرڈ کے لوگ ہیں، میں نے اسے یہ خیال ذہن سے نکال دینے کو کہا۔ اسے یہ کہہ کر ڈرایا کہ یہ لڑکی خواہ اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے شادی کرے گی لیکن ہندو برداشت نہیں کریں گے اور میرے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پہلی بات تو یہ دیکھیں کہ میرا بیٹا اتنا برخوردار تھا کہ اس نے میری اجازت ضروری سمجھی۔ میں نے اسے بڑی ہی اچھی طرح سمجھایا اور نتائج سے خبردار کیا۔ اس نے ضد نہیں کی اور کوئی بات نہ کی لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ بیٹے کو مایوسی ہوئی ہے اور اسے شاید میری وارننگ اچھی نہیں لگی۔ اس کے بعد اس نے اس معاملے میں میرے ساتھ یا اپنی ماں کے ساتھ کوئی بات نہیں کی''۔

لڑکی مقتول پر مرمٹی

پھر اس سے پوچھا کہ اس نے سب انسپکٹر ہرچرن داس کو یہ بات بتائی تھی؟...... اس نے فوراً جواب دیا کہ یہ بات بتانے پر ہی یہ تھانیدار اس کے ساتھ بگڑ گیا تھا۔ پہلے تو اس نے ٹال مٹول کی اور جب مقتول کے باپ نے اسی پر زور دیا کہ قتل کا باعث یہ ہندو لڑکی ہو سکتی ہے تو ہرچرن داس نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تمہارا بیٹا بدچلن اور بدمعاش تھا اور اسی وجہ سے قتل ہوا ہے۔ ہرچرن داس نے اس لڑکی کا جیسے کوئی نوٹس ہی نہ لیا ہو۔ اس کے بعد مقتول

کا باپ جب بھی تھانے گیا، ہرچرن داس نے اس کے ساتھ کوئی الٹی ہی بات کی اور باپ نے تنگ آ کر درخواست لکھی اور آئی جی کے دفتر میں چلا گیا۔ اس انگریز آئی جی نے اسے فوراً بلا لیا، درخواست پڑھی اور بڑی شفقت سے اس سے اس ہندو لڑکی کے متعلق پوچھا۔ باپ نے ہرچرن داس کے رویے کی شکایت کی۔ آئی جی نے ذرا دیر نہ لگائی اور کیس سی آئی اے کے سپرد کر دیا۔

ایک اور بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ واردات اس وقت کی ہے جب جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس جنگ نے لوگوں میں ہر طرح کی بیداری پیدا کر دی تھی جس میں سیاسی بیداری خاص طور پر شامل تھی۔ ہندوؤں نے جنگ کے دوران کاروبار، تجارت اور ٹھیکوں سے بے پناہ دولت کمائی تھی۔ اس کے ساتھ ہندو اور مسلمان لیڈر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے محاذ پر سرگرم ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے لیڈروں کے سامنے تو ایک واضح لائحہ عمل تھا جو انہوں نے قرارداد پاکستان 23 مارچ 1940ء کے مطابق طے کر لیا تھا۔ اس کے مطابق پاکستان کا نعرہ بڑی تیزی سے اٹھنے لگا تھا۔

ہندو اور دیگر غیر مسلم لیڈر پہلے تو پاکستان کا مذاق اڑاتے رہے لیکن جوں جوں یہ نعرہ اور مطالبہ پھیلتا گیا اور اس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا تو ہندوؤں کے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے ہندوؤں کی ایسی آوازیں اپنے کانوں سے سنی تھیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ انگریز اتنے بیوقوف نہیں کہ ملک کو تقسیم کر دیں گے اور اگر انہوں نے تقسیم کر ہی دیا اور پاکستان بن گیا تو وہ یعنی ہندو ملک کے تمام مسلمانوں کو مار مار کر یہاں سے بھگا دیں گے اور کہیں گے کہ جاؤ اپنے ملک میں جا کر رہو۔ اس طرح ہندو کچھ زیادہ ہی شیر اور دلیر ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے پہلے سے زیادہ دشمن ہو گئے۔

مقتول کا باپ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور وہ بتا چکا تھا۔ ہمیں اس لڑکی سنگیتا کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ مقتول کے باپ نے مقتول کے دو دوستوں کے نام بتائے جن میں سے ایک کے گھر کا ایڈریس جانتا تھا۔ باپ نے بتایا کہ اس کے بیٹے کے یہ دونوں دوست اس کے گھر آتے رہتے تھے اور ان کی دوستی بہت ہی گہری تھی۔

ہم نے مقتول کے باپ کو فارغ کر دیا اور جس لڑکے کا اس نے ایڈریس اور نام دیا تھا، ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھیج کر اسے بلوایا...... یہ نوجوان لڑکا مقتول کا ہم عمر تھا۔ وہ آیا تو میں

دوست بھی ہیں۔ بہتر ہے آپ ان سے پوچھیں، کچھ کے ایڈریس میں دے دوں گا۔ میں آپ کے سوال کا یہی جواب دوں گا کہ مجھے اس کے خلاف کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑے کی شکایت یا رپورٹ نہیں ملی تھی"۔

یہ تو ہم نے مختلف ذرائع سے معلوم کرنا ہی تھا کہ مقتول کی دوستی اور دشمنی کس کے ساتھ تھی اور اخلاقی لحاظ سے وہ کیسا تھا۔ اس کے باپ سے ہم نے پوچھا کہ یہ کسی ہندو لڑکی کا معاملہ کیا ہے، کیا مقتول کے کسی ہندو لڑکی کے ساتھ مراسم تھے؟

"ہاں صاحب!" ــــ اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا ــــ "اس سوال کا صحیح جواب دوں گا۔ صحیح اس لئے کہ بیٹے نے خود میرے ساتھ اس لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ اس لڑکی کا نام سنگیتا ہے۔ میرے بیٹے کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ ایک مہینہ اور کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ بیٹے نے پہلے اپنی ماں کو بتایا پھر میرے ساتھ براہ راست بات کی۔ کہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کی کالج کے وقتوں کی پاکیزہ دوستی ہے اور وہ اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہے...... میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ لڑکی کا باپ کون ہے اور وہ کس سٹینڈرڈ کے لوگ ہیں، میں نے اسے یہ خیال ذہن سے نکال دینے کو کہا۔ اسے یہ کہہ کر ڈرایا کہ یہ لڑکی خواہ اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے شادی کرے گی لیکن ہندو برداشت نہیں کریں گے اور میرے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پہلی بات تو یہ دیکھیں کہ میرا بیٹا اتنا برخوردار تھا کہ اس نے میری اجازت ضروری سمجھی۔ میں نے اسے بڑی ہی اچھی طرح سمجھایا اور نتائج سے خبردار کیا۔ اس نے ضد نہیں کی اور کوئی بات نہ کی لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ بیٹے کو مایوسی ہوئی ہے اور اسے شاید میری وارننگ اچھی نہیں لگی۔ اس کے بعد اس نے اس معاملے میں میرے ساتھ یا اپنی ماں کے ساتھ کوئی بات نہیں کی"۔

لڑکی مقتول پر مرمٹی

پھر اس سے پوچھا کہ اس نے سب انسپکٹر ہرچرن داس کو یہ بات بتائی تھی؟...... اس نے فوراً جواب دیا کہ یہ بات بتانے پر ہی یہ تھانیدار اس کے ساتھ بگڑ گیا تھا۔ پہلے تو اس نے ٹال مٹول کی اور جب مقتول کے باپ نے اسی پر زور دیا کہ قتل کا باعث یہ ہندو لڑکی ہو سکتی ہے تو ہرچرن داس نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تمہارا بیٹا بدچلن اور بدمعاش تھا اور اسی وجہ سے قتل ہوا ہے۔ ہرچرن داس نے اس لڑکی کا جیسے کوئی نوٹس ہی نہ لیا ہو۔ اس کے بعد مقتول

کا باپ جب بھی تھانے گیا، ہرچرن داس نے اس کے ساتھ کوئی الٹی ہی بات کی اور باپ نے تنگ آ کر درخواست لکھی اور آئی جی کے دفتر میں چلا گیا۔ اس انگریز آئی جی نے اسے فوراً بلا لیا، درخواست پڑھی اور بڑی شفقت سے اس سے اس ہندو لڑکی کے متعلق پوچھا۔ باپ نے ہرچرن داس کے رویے کی شکایت کی۔ آئی جی نے ذرا دیر نہ لگائی اور کیس سی آئی اے کے سپرد کر دیا۔

ایک اور بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ واردات اس وقت کی ہے جب جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی پانچ چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس جنگ نے لوگوں میں ہر طرح کی بیداری پیدا کر دی تھی جس میں سیاسی بیداری خاص طور پر شامل تھی۔ ہندوؤں نے جنگ کے دوران کاروبار، تجارت اور ٹھیکوں سے بے پناہ دولت کمائی تھی۔ اس کے ساتھ ہندو اور مسلمان لیڈر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے محاذ پر سرگرم ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے لیڈروں کے سامنے تو ایک واضح لائحہ عمل تھا جو انہوں نے قرارداد پاکستان 23 مارچ 1940ء کے مطابق طے کر لیا تھا۔ اس کے مطابق پاکستان کا نعرہ بڑی تیزی سے اٹھنے لگا تھا۔

ہندو اور دیگر غیر مسلم لیڈر پہلے تو پاکستان کا مذاق اڑاتے رہے لیکن جوں جوں یہ نعرہ اور مطالبہ پھیلتا گیا اور اس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا تو ہندوؤں کے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے ہندوؤں کی ایسی آوازیں اپنے کانوں سے سنی تھیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ انگریز اتنے بیوقوف نہیں کہ ملک کو تقسیم کر دیں گے اور اگر انہوں نے تقسیم کر ہی دیا اور پاکستان بن گیا تو وہ یعنی ہندو ملک کے تمام مسلمانوں کو مار مار کر یہاں سے بھگا دیں گے اور کہیں گے کہ جاؤ اپنے ملک میں جا کر رہو۔ اس طرح ہندو کچھ زیادہ ہی شیر اور دلیر ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے پہلے سے زیادہ دشمن ہو گئے۔

مقتول کا باپ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور وہ بتا چکا تھا۔ ہمیں اس لڑکی سنگیتا کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ مقتول کے باپ نے مقتول کے دو دوستوں کے نام بتائے جن میں سے ایک کے گھر کا ایڈریس جانتا تھا۔ باپ نے بتایا کہ اس کے بیٹے کے یہ دونوں دوست اس کے گھر آتے رہتے تھے اور ان کی دوستی بہت ہی گہری تھی۔

ہم نے مقتول کے باپ کو فارغ کر دیا اور جس لڑکے کا اس نے ایڈریس اور نام دیا تھا، ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھیج کر اسے بلوایا...... یہ نوجوان لڑکا مقتول کا ہم عمر تھا۔ وہ آیا تو میں

نے اس سے اس کے دوسرے دوست کا ایڈریس پوچھا جو اس نے لکھوا دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے جیپ پر بھیجتا ہوں اور وہ اس دوست کو بھی ساتھ لے آئے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ لڑکا کچھ ڈرا ڈرا سا لگتا ہے، اسے چند منٹ اپنے پاس بٹھایا اور آہستہ سے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھ سے اور اس انگریز انسپکٹر سے بالکل نہ ڈرے، ہم مقتول اور اس ہندو لڑکی کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اس لڑکے کا حوصلہ مضبوط کر کے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ جیپ لے اور اس لڑکے کو ساتھ لے جائے اور اس کے دوست کو لے آئے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد یہ لڑکا بھی آ گیا۔ یہ بھی ان کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ انسپکٹر اینڈریو سے بات کر کے ان دونوں کو اکٹھا ہی بٹھا لیا۔ انہیں کہا کہ وہ جو کچھ بھی بتائیں گے وہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ انہوں نے یہ راز کھولا ہے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ دونوں الگ الگ میرے پاس بیٹھنا چاہیں تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔ دونوں نے یک زبان کہا کہ ان کی دوستی اتنی گہری ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے اور اکٹھے ہی بیٹھ کر ہر سوال کا جواب دیں گے۔ میں نے ان سے سب سے پہلے یہ بات پوچھی کہ مقتول طبیعت، مزاج اور غصے کے لحاظ سے کیسا تھا اور کیا وہ لڑائی جھگڑے مول لینے کا عادی تھا؟

دونوں نے بڑے ٹھوس لہجے میں جواب دیا کہ مقتول کا مزاج ہر وقت شگفتہ رہتا تھا اور غصہ تو اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جہاں تک ان کی یاد پیچھے جاتی ہے، انہیں کوئی ایسا موقع یاد نہیں آتا کہ مقتول نے کسی کے ساتھ زبانی کلامی یا دست و گریبان ہو کر لڑائی جھگڑا کیا ہو۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی اس کے ساتھ لڑنا جھگڑنا چاہتا تو وہ بڑے اچھے انداز سے صلح سمجھوتہ کر لیا کرتا تھا۔

ان سے ہم نے خاصی باتیں پوچھیں جو تمام کی تمام یہاں لکھنا ضروری نہیں۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم بات اس لڑکی کی تھی۔ ان دونوں سے کہا کہ وہ لڑکی کے متعلق جو کچھ بھی جانتے ہوں بتائیں۔ دونوں نے جو کچھ سنایا وہ مختصراً یوں تھا کہ مقتول اور سنگیتا کی دوستی کالج سے شروع ہوئی تھی جب دونوں فورتھ ائیر میں تھے۔

یہ دوستی اس طرح شروع ہوئی تھی کہ دو مسلمان لڑکے اس لڑکی کے پیچھے پڑ گئے تھے اور اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس وقت تک مقتول کی اس لڑکی کی طرف ذرا سی

بھی توجہ نہیں تھی۔ یہ دونوں لڑکے کچھ اوچھے سے تھے اور ان کی چھیڑ چھاڑ بھی بڑی گھٹیا اور اوچھی ہوتی تھی۔ ایک روز ان میں سے ایک لڑکے نے اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادہ ہی بیہودہ مذاق کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لڑکی کو غصہ آ گیا اور اس نے اس لڑکے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ لڑکے نے پہلے سے زیادہ بیہودگی کی باتیں اور حرکتیں کیں۔

مقتول کہیں قریب ہی تھا۔ اسے یہ حرکت ایسی بری لگی کہ اس نے اس لڑکے کو منع کیا لیکن لڑکا بڑھکیں مارنے لگا۔ مقتول ایک تو کھلاڑی تھا اور ورزش بھی باقاعدہ کرتا تھا اس لئے اس کے جسم میں طاقت تھی اور جسم بڑا گٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس بیہودہ لڑکے کو پیٹ پر ایک گھونسہ مارا اور جب وہ لڑکا جوابی حملہ کرنے آیا تو مقتول نے اسے اوپر اٹھا کر زمین پر پھینکا اور پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا۔ باقی لڑکے تماشا دیکھنے لگے۔ وہ سب اس لڑکے کے خلاف تھے۔

مقتول کے دوستوں نے کہا کہ مقتول لڑنے جھگڑنے والا لڑکا تھا ہی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ بزدل تھا اور کہیں جائز لڑائی سے بھی گھبراتا تھا۔ وہ تو بڑے مضبوط دل گردے والا نوجوان تھا۔ اس نے اس ایک لڑکے کی پٹائی کر دی تو اس کا دوسرا ساتھی اس سے ڈر گیا اور اس روز کے بعد انہوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔

لڑکی مقتول کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن مقتول نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ اس واقعہ کے ساتھ اس لڑکی کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

اگلے روز لڑکی کالج بند ہونے کے وقت مقتول کے راستے میں آ گئی اور بولی کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ مقتول نے بڑی سنجیدگی سے اسے کہا کہ اس میں شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ اس کی اپنی فطرت ہے کہ نہ خود کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے نہ کسی کو ایسا کرتے دیکھ کر برداشت کرتا ہے۔ مقتول کا یہی کردار تھا جس سے لڑکی اتنی متاثر ہوئی کہ مقتول کے قریب ہونے لگی اور آخر ان کی دوستی ہو گئی۔

دوستی بھی ایسی ہوئی کہ نوبت شادی کے وعدوں تک بلکہ شادی کے فیصلے تک جا پہنچی۔ لڑکی کہتی تھی کہ اسے مسلمان اچھے لگتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمان ہو جائے گی اور گھر سے بھاگ کر مقتول کے ساتھ شادی کر لے گی اور پھر مقتول اسے جہاں بھی رکھے گا وہ ہنسی خوشی رہے گی۔

مقتول کے دوستوں نے بتایا کہ لڑکی نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن یہ

نے اس سے اس کے دوسرے دوست کا ایڈریس پوچھا جو اس نے لکھوا دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے جیپ پر بھیجتا ہوں اور وہ اس دوست کو بھی ساتھ لے آئے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ لڑکا کچھ ڈرا ڈرا سا لگتا ہے، اسے چند منٹ اپنے پاس بٹھایا اور آہستہ سے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھ سے اور اس انگریز انسپکٹر سے بالکل نہ ڈرے، ہم مقتول اور اس ہندو لڑکی کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اس لڑکے کا حوصلہ مضبوط کر کے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ جیپ لے اور اس لڑکے کو ساتھ لے جائے اور اس کے دوست کو لے آئے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد یہ لڑکا بھی آ گیا۔ یہ بھی ان کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ انسپکٹر اینڈریو سے بات کر کے ان دونوں کو اکٹھا ہی بٹھا لیا۔ انہیں کہا کہ وہ جو کچھ بھی بتائیں گے وہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ انہوں نے یہ راز کھولا ہے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ دونوں الگ الگ میرے پاس بیٹھنا چاہیں تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔ دونوں نے یک زبان کہا کہ ان کی دوستی اتنی گہری ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے اور اکٹھے ہی بیٹھ کر ہر سوال کا جواب دیں گے۔ میں نے ان سے سب سے پہلے یہ بات پوچھی کہ مقتول طبیعت، مزاج اور غصے کے لحاظ سے کیسا تھا اور کیا وہ لڑائی جھگڑے مول لینے کا عادی تھا؟

دونوں نے بڑے ٹھوس لہجے میں جواب دیا کہ مقتول کا مزاج ہر وقت شگفتہ رہتا تھا اور غصہ تو اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جہاں تک ان کی یاد پیچھے جاتی ہے، انہیں کوئی ایسا موقع یاد نہیں آتا کہ مقتول نے کسی کے ساتھ زبانی کلامی یا دست و گریبان ہو کر لڑائی جھگڑا کیا ہو۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی اس کے ساتھ لڑنا جھگڑنا چاہتا تو وہ بڑے اچھے انداز سے صلح سمجھوتہ کر لیا کرتا تھا۔

ان سے ہم نے خاصی باتیں پوچھیں جو تمام کی تمام یہاں لکھنا ضروری نہیں۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم بات اس لڑکی کی تھی۔ ان دونوں سے کہا کہ وہ لڑکی کے متعلق جو کچھ بھی جانتے ہوں بتائیں۔ دونوں نے جو کچھ سنایا وہ مختصراً یوں تھا کہ مقتول اور سنگیتا کی دوستی کالج سے شروع ہوئی تھی جب دونوں فورتھ ایئر میں تھے۔

یہ دوستی اس طرح شروع ہوئی تھی کہ دو مسلمان لڑکے اس لڑکی کے پیچھے پڑ گئے تھے اور اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس وقت تک مقتول کی اس لڑکی کی طرف ذرا سی

بھی توجہ نہیں تھی۔ یہ دونوں لڑکے کچھ اوچھے سے تھے اور ان کی چھیڑ چھاڑ بھی بڑی گھٹیا اور اوچھی ہوتی تھی۔ ایک روز ان میں سے ایک لڑکے نے اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادہ ہی بیہودہ مذاق کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لڑکی کو غصہ آ گیا اور اس نے اس لڑکے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ لڑکے نے پہلے سے زیادہ بیہودگی کی باتیں اور حرکتیں کیں۔

مقتول کہیں قریب ہی تھا۔ اسے یہ حرکت ایسی بری لگی کہ اس نے اس لڑکے کو منع کیا لیکن لڑکا بڑھکیں مارنے لگا۔ مقتول ایک تو کھلاڑی تھا اور ورزش بھی باقاعدہ کرتا تھا اس لئے اس کے جسم میں طاقت تھی اور جسم بڑا گٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس بیہودہ لڑکے کو پیٹ پر ایک گھونسہ مارا اور جب وہ لڑکا جوابی حملہ کرنے آیا تو مقتول نے اسے اوپر اٹھا کر زمین پر پھینکا اور پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا۔ باقی لڑکے تماشا دیکھنے لگے۔ وہ سب اس لڑکے کے خلاف تھے۔

مقتول کے دوستوں نے کہا کہ مقتول لڑنے جھگڑنے والا لڑکا تھا ہی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ بزدل تھا اور کہیں جائز لڑائی سے بھی گھبراتا تھا۔ وہ تو بڑے مضبوط دل گردے والا نوجوان تھا۔ اس نے اس ایک لڑکے کی پٹائی کر دی تو اس کا دوسرا ساتھی اس سے ڈر گیا اور اس روز کے بعد انہوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔

لڑکی مقتول کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن مقتول نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ اس واقعہ کے ساتھ اس لڑکی کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

اگلے روز لڑکی کالج بند ہونے کے وقت مقتول کے راستے میں آ گئی اور بولی کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ مقتول نے بڑی سنجیدگی سے اسے کہا کہ اس میں شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ اس کی اپنی فطرت ہے کہ نہ خود کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے نہ کسی کو ایسا کرتے دیکھ کر برداشت کرتا ہے۔ مقتول کا یہی کردار تھا جس سے لڑکی اتنی متاثر ہوئی کہ مقتول کے قریب ہونے لگی اور آخر ان کی دوستی ہو گئی۔

دوستی بھی ایسی ہوئی کہ نوبت شادی کے وعدوں تک بلکہ شادی کے فیصلے تک جا پہنچی۔ لڑکی کہتی تھی کہ اسے مسلمان اچھے لگتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمان ہو جائے گی اور گھر سے بھاگ کر مقتول کے ساتھ شادی کر لے گی اور پھر مقتول اسے جہاں بھی رکھے گا وہ ہنسی خوشی رہے گی۔

مقتول کے دوستوں نے بتایا کہ لڑکی نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن یہ.

ارادہ اس لئے ملتوی ہوا کہ پہلے دونوں بی اے کر لیں۔ دونوں نے بی اے کر لیا اور اب لڑکی نے گھر سے بھاگنا تھا اور مقتول کے ساتھ کہیں اور چلے جانا تھا لیکن کوئی ایسی جگہ اور کوئی ایسا شہر ذہن میں نہیں آ رہا تھا جہاں جاتے ہی مقتول کو نوکری مل جاتی اور دونوں وہاں جا کر آباد ہو جاتے۔ مقتول اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن محبت دل میں ایسی گہری اتری تھی کہ وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا پھر بھی اس نے گھر والوں کی اجازت ضروری سمجھی۔ یہ مقتول کی شرافت تھی۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مقتول نے اپنے باپ سے اجازت طلب کی تھی اور باپ نے اسے نتائج سے ڈرایا تھا۔ باپ نے ہی نہیں، ان دوستوں نے بھی مقتول کو اس محبت اور اپنے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کر ڈالی تھی اور اسے اکثر خبردار کرتے رہتے تھے کہ ہندوؤں کو پتہ چل گیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا لیکن مقتول کو اس لڑکی نے بہت پابند اور مجبور کر دیا تھا۔

میں نے ان دوستوں سے پوچھا کہ مقتول اور اس لڑکی کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہوں گی اور یہ کہاں اور کس طرح ملتے ملاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ملنے ملانے کے معاملے میں دونوں محتاط نہیں تھے۔ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور لڑکی کی بے تابی کا یہ عالم تھا کہ مقتول کی ٹیم کا جہاں کہیں میچ ہوتا تھا وہ وہاں پہنچ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز شاہدرہ میں پولیس کی ٹیم کے ساتھ مقتول کی ٹیم کا میچ تھا اور لڑکی وہاں بھی پہنچ گئی تھی۔ ان میچوں میں تماشائی کوئی ہزاروں یا سینکڑوں کی تعداد میں نہیں ہوتے تھے۔ یہی کوئی چند ایک لوگ میچ دیکھنے رک جاتے تھے۔ اتنے تماشائیوں میں ایسی نوجوان گوری چٹی خوبصورت لڑکی سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ میچ کے بعد مقتول اور لڑکی کچھ دیر اکٹھے رہتے اور انہیں سب دیکھتے تھے۔

دونوں لڑکے باری باری بول رہے تھے، کبھی میں ان سے کوئی بات پوچھ لیتا اور کبھی انسپکٹر اینڈریو کوئی سوال کرتا اور اس طرح بات لمبی بھی ہوتی گئی اور واضح بھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے؟

''لطیف کی کسی کے ساتھ دشمنی تو تھی نہیں'' ـــــ ایک دوست نے جواب دیا ـــــ ''اسے ہندوؤں نے قتل کیا ہے یا لڑکی کے باپ نے قتل کروایا ہے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ ان کی محبت اور ملاقاتیں ڈھکی چھپی نہیں تھیں''۔

''لڑکی کا باپ کوئی بڑا لیڈر تو نہیں'' ـــــ دوسرے دوست نے کہا ـــــ ''لیکن سیاست میں اس کا مقام ذرا اونچا ہے اور وہ ہندو مہاسبھائی ہے''۔

مہاسبھائی نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ یوں تو ہر ہندو ہر مسلمان کا دشمن ہے لیکن مہاسبھائی تو اعلانیہ مسلمانوں کے قتل کی باتیں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے معاملے میں مہاسبھائی انتہا پسند ہیں۔ انسپکٹر اینڈریو بھی مہاسبھائیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم دونوں کے سامنے یہ شک زیادہ پختہ ہو کر آ گیا کہ قتل کا باعث یہی لڑکی ہے اور قاتل ہندو ہیں۔

بھینسے جیسا منگیتر

یہ شک پختہ ہو جانے کے باوجود ہم نے اسی شک کو ذہن میں نہ رکھا۔ قاتل کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ ہم ان دونوں دوستوں کو اور زیادہ کریدنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ایک اور شک پیدا کر دیا۔ یہ بات لڑکی نے مقتول کو تفصیلاً بتائی تھی اور مقتول نے اپنے ان دوستوں کو بتا دی تھی۔ بات یہ تھی کہ لڑکی کا ایک منگیتر تھا۔ ان کی منگنی کئی سال پہلے ہو چکی تھی اور شادی اس لئے ملتوی ہوئی کہ لڑکی بی اے کر لے لیکن بی اے کر لینے کے بعد بھی شادی نہ ہوئی۔

لڑکی نے مقتول کو بتایا تھا کہ لڑکی کو یہ منگیتر نہ صرف یہ کہ پسند نہیں تھا بلکہ اسے بہت برا لگتا تھا۔ پھر یہ وجہ پیدا ہو گئی کہ لڑکی مقتول کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ منگیتر کا حلیہ یہ بتایا گیا کہ پکا کاروباری آدمی تھا اور جسم موٹا اور پیٹ بڑھا ہوا اور چہرے سے بھی بھدا اور فضول سی صورت کا آدمی تھا۔ طبعاً بھی خالص کاروباری ہندو تھا۔

ان دوستوں کے بیان کے مطابق، لڑکی نے مقتول کو بتایا تھا کہ اس نے ایک روز منگیتر کو کسی جگہ اتفاقیہ آمنے سامنے آ جانے پر صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور وہ کوئی اپنا انتظام کر لے۔

یہ منگیتر ایک تو جسمانی لحاظ سے بھینسا لگتا تھا اور وہ اپنے آپ کو غنڈہ اور بدمعاش بھی سمجھتا تھا اور اسی قماش کے دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کا دوستانہ تھا۔ غالباً شراب بھی پیتا تھا...... اس کے متعلق ہم نے اپنے خفیہ ذرائع سے معلوم کر لینا تھا، ابھی ہم ان دونوں لڑکوں کی رپورٹ لے رہے تھے۔ لڑکے یہ نہ بتا سکے کہ منگیتر کو پتہ چل گیا تھا یا نہیں کہ لڑکی مقتول کو چاہتی ہے اور اس سے ملتی رہتی ہے۔ بہرحال یہ منگیتر ہمارا ایک اور مشتبہ تھا۔

رات ہوگئی تھی۔ان دونوں لڑکوں کو ہم نے جیسے نچوڑ ہی لیا تھا۔انہوں نے کوئی بات چھپائی نہیں اور پورا پورا تعاون کیا۔انہیں ہم نے گھر بھیج دیا۔

دن کے وقت ہم نے تھانیدار ہرچرن داس کو فون پر کہا تھا کہ کل صبح موقعہ کے وہ تینوں گواہ ہمارے پاس بھیج دے۔ہم مقتول کی ہاکی ٹیم کے تمام کھلاڑیوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے۔مقتول کے ان دو دوستوں کے ساتھ بات ہوئی تھی۔انہوں نے بتایا تھا کہ ہاکی کی ٹیم ہر روز چار بجے یا اس سے ذرا بعد گراؤنڈ میں پریکٹس کے لئے آتی ہے۔ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اگلے روز شام کو وہیں گراؤنڈ میں چلے جائیں گے۔

اگلے روز ہم اپنے ہیڈکوارٹر میں گئے تو موقعہ کے تینوں گواہ پہلے سے وہاں موجود تھے اور سب انسپکٹر ہرچرن داس بھی ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔مجھے بازو سے پکڑ کر الگ برآمدے میں لے گیا۔وہ تو منت سماجت پر اتر آیا تھا۔کہتا تھا کہ میں اس کا خیال رکھوں۔اسے اپنی فریب کاری کا احساس ہوگیا تھا۔میرا اور انسپکٹر اینڈریو کا یہ شک صحیح ثابت ہوا کہ ہرچرن دانستہ تفتیش میں گڑبڑ کر رہا ہے تاکہ ہندوؤں پر یا لڑکی کے مہاسبھائی باپ پر شک نہ ہو اور وہ پکڑے نہ جائیں۔اسے معلوم تھا کہ سی آئی اے کے پاس جو تفتیش جاتی ہے وہ دودھ الگ اور پانی الگ کر دیا کرتی ہے۔وہ میری منت کر رہا تھا کہ میں اپنی تفتیش کروں اور یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ اس سے کوئی کوتاہی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ہوئی تھی۔

ہرچرن داس مکار اور عیار ہندو تھا۔وہ ایک مسلمان نوجوان کے قتل کی واردات گول کر رہا تھا۔میں نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ اس کے خلاف تو ہم رپورٹ ضرور ہی لکھیں گے۔انسپکٹر اینڈریو تو اور ہی زیادہ غصے میں تھا۔بہرحال ہرچرن کو میں نے جھوٹی تسلیاں دیں اور کہا کہ اسے سزا دلوا کر مجھے کچھ نہیں ملے گا اور میں ایسی حرکت بالکل نہیں کروں گا۔اس نے کہا کہ میں اس پردہ ڈالے رکھوں تو وہ میری کچھ خدمت بھی کر دے گا۔اس کا مطلب رشوت سے تھا۔میں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور جھوٹا وعدہ کیا کہ میں بغیر کسی خدمت کے اسے بچائے رکھوں گا...... جھوٹے کے ساتھ بہترین رویہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ جھوٹ بولا جائے۔

ہم نے موقعہ کے تینوں گواہوں کو اکٹھے ہی بٹھا لیا۔ان میں دو ہندو تھے اور ایک مسلمان۔یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان تینوں نے پہلے روز تھانے میں کیا بیان دیا تھا۔یہ ہمیں تھانے سے معلوم ہو چکا تھا اور فائل میں بھی موجود تھا پھر بھی ہم نے انہیں کہا کہ وہ یاد کر

کے اور ذہن پر زور دے کر بتائیں کہ انہوں نے مقتول کو کس طرح قتل ہوتے دیکھا تھا۔

انہوں نے بالکل وہی بیان دیا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔میں نے اور انسپکٹر اینڈریو نے کئی سوال پوچھے اور بہت کریدا، جسے بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں، انہوں نے کوئی نئی بات نہ بتائی۔

میں نے ان قاتلوں کی شناخت کی بات کی تو انہوں نے بتایا کہ دونوں نے اپنے منہ اور ناک رومالوں سے اس طرح ڈھانپے ہوئے تھے کہ رومال چہروں پر بندھے ہوئے تھے۔شناخت نہ کر سکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ کچھ دور تھے اور صبح کی روشنی ابھی سفید نہیں ہوئی تھی۔یہی نظر آتا تھا کہ دو آدمی ایک آدمی کو مار پیٹ رہے ہیں اور وہ بھاگے جا رہے ہیں اور دور تانگہ کھڑا ہے۔حملہ آور جب تانگے کی طرف بھاگ رہے تھے تو یہ تینوں اور کچھ آدمی بھی مقتول کی طرف دوڑے۔اس طرح یہ تینوں قریب آگئے اور وہاں سے تانگے اور گھوڑے کو اتنا اچھی طرح دیکھ لیا کہ تانگے کا رنگ اور گھوڑے کا رنگ بھی انہیں ٹھیک نظر آیا لیکن تانگے میں جو آدمی بیٹھا تھا اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ان سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ہرچرن داس نے انہیں پھر کبھی تھانے بلایا ہی نہیں تھا۔تینوں کو ہم نے فارغ کر دیا۔

تانگے اور گھوڑے کی نہایت اچھی اور واضح نشانیاں مل گئی تھیں۔یہ کسی کا پرائیویٹ تانگہ تھا۔دلی جیسے بڑے شہر میں ایک خاص رنگ کے تانگے کو ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ہمیں ناممکن کو ممکن کر دکھانا تھا۔تانگہ کرائے کے لئے ہو یا پرائیویٹ اس کا لائسنس بنوانا پڑتا ہے۔اس زمانے میں کاریں بہت ہی کم تھیں اور بعض امیر لوگ اپنے پرائیویٹ تانگے رکھ لیتے تھے اور ان کے باقاعدہ لائسنس بنوائے جاتے تھے۔ہم دونوں نے اس سلسلے میں یہ کارروائی کی کہ میونسپل کارپوریشن کے اس دفتر میں چلے گئے۔جہاں سے تانگوں کے لائسنس بنوائے جاتے تھے۔

ہم نے اپنا تعارف کرایا تو فوراً تمام ریکارڈ ہمارے آگے رکھ دیا گیا۔میں نے متعلقہ اہلکار سے کہا کہ وہ پرائیویٹ تانگوں کا ریکارڈ دکھائے۔وہ دیکھا تو کل ساٹھ یا غالباً پینسٹھ پرائیویٹ تانگے لائسنس یافتہ تھے۔میں نے یہ سارا ریکارڈ چیک کیا۔میں دیکھ رہا تھا کہ سنگیتا کے باپ کا پرائیویٹ تانگہ ہے یا نہیں۔اس ریکارڈ میں اس کا نام نہیں تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوؤں کے نام پر بہت ہی کم تانگے تھے۔زیادہ تر

مسلمانوں کے نام تھے یا چند ایک پارسی تھے یا انگریز یا اینگلو انڈین تھے۔ مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ اس ریکارڈ میں تانگے کی اتنی سی ہی تفصیل تھی کہ یہ تانگہ کرائے کے لئے چلایا جا رہا ہے یا پرائیویٹ ہے، اس میں تانگے کے رنگ اور قسم اور گھوڑے کی کوئی نشانی نہیں دی گئی تھی۔ ان تفصیلات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بہرحال یہ اطمینان ہو گیا کہ ریکارڈ موجود ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے گا۔

وہاں سے اٹھے اور ہم ٹریفک پولیس کے ہیڈ کوارٹر چلے گئے۔ ایک ایس پی سے ملے۔ خوش قسمتی سے وہ انگریز تھا۔ انسپکٹر اینڈریو نے اسے واردات سنا کر بتایا کہ قاتل ایک پرائیویٹ تانگے میں بیٹھ کر بھاگے تھے۔ تانگے اور گھوڑے کے رنگ بھی بتائے۔ اس انگریز ایس پی نے کہا کہ وہ تمام ٹریفک پولیس کو یہ حکم دے گا کہ اس رنگ کا تانگہ اور اس رنگ کا گھوڑا نظر آئے تو اسے پکڑ لیں۔

میرا خیال یہ تھا اور اینڈریو کی بھی یہی رائے تھی کہ قاتل اگر عقل مند ہوئے تو وہ اس تانگے اور گھوڑے کو کچھ عرصہ باہر نہیں لائیں گے۔ ہمیں اس کے باوجود ملزم کا سراغ لگانا تھا...... یہ تفتیش ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ میں لکھ تو رہا ہوں لیکن پتہ چل رہا ہے کہ کچھ باتیں چھوڑتا جا رہا ہوں مثلاً اپنے دفتر میں آ کر جب ہم میونسپل کارپوریشن کے دفتر کو چلے تھے تو اس سے پہلے اپنے دو مخبروں کو بلوایا تھا اور انہیں کہا تھا کہ وہ سنگیتا کے منگیتر کے متعلق تفصیلات فراہم کریں۔ ایسی ہی کچھ اور چھوٹی چھوٹی کارروائیاں تھیں جن کا میں ذکر نہیں کر رہا۔

اسی روز شام چار بجے کے بعد ہم دونوں انسپکٹر ہاکی گراؤنڈ میں چلے گئے۔ بہت سے لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے۔ ہم دونوں پرائیویٹ کپڑوں میں تھے۔ ہمارے پاس اپنے کارڈ تو تھے پھر بھی ہم ایک باوردی ہیڈ کانسٹیبل اور تین باوردی کانسٹیبلوں کو ساتھ لیتے گئے جس سے ہمارا مطلب یہ تھا کہ پولیس کا کچھ رعب ہو۔ پاکستان اور بھارت کے لوگ پولیس کی وردی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ ہم نے کھیل رکوا دیا اور مقتول کی ٹیم کے لڑکوں کو اپنے پاس بلایا۔ تمام لڑکے پڑھے لکھے تھے۔ ہم نے ان پر کوئی رعب نہ جھاڑا بلکہ بااخلاق طریقے سے اپنا تعارف کرا کے انہیں اپنے کارڈ بھی دکھا دیئے۔ انہیں کہا کہ ان سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔

ہم یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ تمام لڑکے کنی کترانے کی بجائے تعاون کے لئے تیار ہو

گئے۔ ٹیم کا کیپٹن ایک جواں سال ہندو تھا۔ اس نے اپنی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ہم جیسا کہیں گے وہ ویسا ہی کریں گے اور ہم انہیں بتائیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کل صبح نو بجے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں۔ انہیں دفتر کا اتا پتا اور محل وقوع بتا دیا۔

ابھی ہم سنگیتا اور اس کے باپ کو نہیں چھیڑنا چاہتے تھے۔ پہلے ان کے لئے مضبوط جال تیار کرنا ضروری تھا۔ ہم نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا کر اپنے مخبری کے نظام کو ایک لائن دے کر مصروف کر دیا اور کچھ ہدایات دیں۔

اگلی صبح ہاکی ٹیم کے تیرہ چودہ لڑکے آ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمریں کم سے کم اٹھارہ انیس سال اور زیادہ سے زیادہ پچیس چھبیس سال تھیں۔ ان کا کیپٹن پچیس چھبیس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ شخص مجھے کچھ زیادہ ہی اچھا اور عقل والا لگتا تھا۔ ٹیم میں ایک سکھ تھا، پانچ چھ مسلمان تھے باقی سب ہندو۔ ہم نے سب کو الگ الگ اپنے تفتیشی کمرے میں بٹھایا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔

میں یہ لکھنے میں وقت ضائع نہیں کروں گا کہ ہر ایک سے ہم نے کیا پوچھا اور اس نے کیا جواب اور کیا بیان دیا۔ ان سے کوئی سراغ والی بات معلوم نہ ہو سکی، یہ تصدیق ہو گئی کہ مقتول لڑنے جھگڑنے والا لڑکا نہیں تھا البتہ کسی کی مدد کرنے کو کسی سے ٹکر لینی پڑتی تو پھر مقتول یہ لحاظ نہیں رکھتا تھا کہ مدمقابل کوئی چھوٹا آدمی ہے یا کتنی بڑی حیثیت والا ہے۔ یہ سن کر میں نے تقریباً ہر لڑکے سے پوچھا تھا کہ قتل سے کچھ دن پہلے مقتول کی کسی بڑی حیثیت والے آدمی کے ساتھ لڑائی تو نہیں ہوئی تھی؟...... سب نے یہی ایک جواب دیا کہ ایسا بالکل نہیں ہوا۔

سب نے بتایا کہ مقتول بڑے اچھے خاندان کا لڑکا تھا اور اس کا اخلاق اونچے خاندان والا ہی تھا۔ ہنسی مذاق اور زندہ دلی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ دو مسلمان لڑکوں نے بتایا کہ ایک ہندو لڑکی کے ساتھ مقتول کے مراسم تھے اور جہاں کہیں میچ ہوتا تھا لڑکی وہاں موجود ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ یہ لڑکے کچھ نہ بتا سکے۔

ٹیم کے کیپٹن کو میں نے سب سے آخر میں رکھا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے توقع تھی کہ اس سے کوئی خاص بات معلوم ہو جائے گی۔ اس سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ مقتول کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق کچھ زیادہ جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سنگیتا نام کی ایک ہندو لڑکی

مقتول سے محبت کرتی ہے اور ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہ شخص جس کا نام رمیش تھا، اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا جو ہم پہلے ہی زیادہ تفصیل سے سن چکے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ عقل والا لگتا ہے۔ آخر اس نے کوئی تو رائے قائم کی ہو گی کہ قاتل کون ہے۔

''ہوں تو میں بھی ہندو ہی'' ___ اس نے کہا ___ ''لیکن میں اور میرا خاندان بھی نام کے ہندو ہیں۔ میرا باپ فوج میں کرنل ہے اور وہ باہر کے دو تین ملکوں میں رہ چکا ہے۔ پوری طرح روشن خیال آدمی ہے اور ہم میں ہندوؤں والی کوئی خصلت نہیں پائی جاتی۔ ہمارا باپ کسی مذہب کا پابند نہیں اور پوری طرح روشن خیال ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ قاتل کون ہے لیکن یہ یقین سے کہتا ہوں کہ قاتل ہندو ہیں۔ سنگیتا نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی سزا لطیف کو ملی کہ اسے قتل ہی کر دیا گیا......

''ہندو قوم بڑی ہی تنگ نظر قوم ہے۔ سنگیتا کا باپ کا تو برہمن ہے اور دوسرے مہا جائی ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا اور اس نے اس لڑکے کو ہی دنیا سے اٹھوا دیا جس کے پیچھے اس کی بیٹی مسلمان ہو رہی تھی۔ میں نے لطیف کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہ لے اور اس لڑکی سے پیچھا چھڑا لے لیکن ان کی محبت ان کے دلوں میں اتنی گہری اتری ہوئی تھی کہ اس نے میری وارننگ کی پرواہ نہ کی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ سنگیتا کا باپ ایسا کٹر برہمن ہے کہ اس کی بیٹی اس کی بات نہیں مانے گی تو اسے بھی قتل کروا دے گا......

''پھر لطیف کا دوسرا بڑا دشمن سنگیتا کا منگیتر تھا۔ میں ان لوگوں کے کچھ قریب ہوں یا قریب سے جانتا ہوں۔ منگیتر کو سنگیتا نے کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ منگیتر نے سنگیتا کے ماں باپ کو یہ بات بتائی تھی یا نہیں۔ میں یہ کر سکتا ہوں کہ سنگیتا کے اس منگیتر کے ساتھ گپ شپ لگا کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس کا ردعمل کیا تھا۔ ایسا تو یقین نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ اندر کی کوئی بات بتا دے گا لیکن مجھے کچھ پتہ چلا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا''۔

اس کے بعد رمیش نے اپنی روشن خیالی کی بات شروع کر دی، جو مختصراً یوں ہے کہ اسے اگر کوئی مسلمان لڑکی اچھی لگی تو وہ سیدھا اس کے ماں باپ سے ملے گا اور کہے گا کہ میں مسلمان ہو جاتا ہوں، اپنی لڑکی کی شادی میرے ساتھ کر دو، اور اگر اس کی سگی بہن کو کوئی مسلمان اچھا لگا تو میں بلکہ میرا باپ بھی اسے کہے گا کہ جاؤ مسلمان ہو جاؤ اور اس کے ساتھ

شادی کر لو۔

وہ دراصل یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ہندو بہت ہی تنگ نظر ہوتے ہیں اور وہ خود ہندو ہوتے ہوئے کشادہ ظرف ہے۔

بڑی ہی حسین لڑکی میرے کمرے میں آئی

اب ہم اس واردات اور تفتیش کے بڑے کرداروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سنگیتا کو شامل تفتیش کرنا ضروری تھا لیکن ہم شہادت اکٹھی کر رہے تھے۔ شہادت اتنی تو نہ مل سکی جتنی مطلوب تھی لیکن اس لڑکی کو بلانا مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا۔ اگلے روز یا شاید اس سے اگلے روز اپنے ایک اے ایس آئی کو بھیجا کہ وہ اس لڑکی کو ساتھ لے آئے۔

ہمیں یہ سہولت حاصل تھی کہ ہمارے محکمے میں جیپیں اور دوسری گاڑیاں بھی تھیں۔ اے ایس آئی کو جیپ میں بھیجا اور ایک گھنٹے سے پہلے پہلے سنگیتا آ گئی اور اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ ہمارے آفس میں پہنچ کر باپ نے لڑکی کو باہر بٹھایا اور خود اندر آیا۔ ہم سے اپنا تعارف کرایا اور بڑے رعب دار لہجے میں پوچھا کہ ہم نے اس کی بیٹی کو کیوں بلایا ہے۔

انسپکٹر اینڈریو نے پہلے کہہ دیا تھا کہ لڑکی اکیلی نہیں آئے گی، اس کا باپ یا کوئی بھائی اس کے ساتھ ضرور آئے گا۔ اینڈریو نے جانے کیا سوچ کر کہا تھا کہ اس کے ساتھ باپ آئے تو میں ہی بات کروں۔ وہی ہوا، لڑکی کے ساتھ باپ آ گیا اور جب وہ اندر آیا تو انسپکٹر اینڈریو لاتعلق سا ہو کر الگ بیٹھا رہا۔

میں نے پہلے تو اس شخص کی ڈیل ڈول اور سراپا دیکھا۔ وہ وائل کے سفید لمبے کرتے میں ملبوس تھا، نیچے ہندوؤں والی سفید دھوتی تھی اور سر پر ہندوؤں والی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ شکل وصورت سے وہ صاحب حیثیت لگتا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا تھا کہ اس کی بیٹی کو کیوں بلایا گیا ہے۔

''مہاراج!'' ___ میں نے کہا ___ ''ہم نے آپ کی بیٹی کو بلایا ہے آپ کو نہیں۔ باہر نکل جائیں اور اپنی بیٹی کو بھیج دیں''۔

میں نے رسماً بھی نہ کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ ایک تو میرے دل میں اس کی نفرت بھری ہوئی تھی دوسرے یہ کہ اسے ہم نے بلایا ہی نہیں تھا اور وہ رعب جھاڑنے آ گیا تھا۔

"دیکھئے نا صاحب!"— اب کے اس نے اپنا رعب ذرا کم کر کے کہا— "میں اس لڑکی کا باپ ہوں۔ بجا طور پر خیال آتا ہے کہ لڑکی کو پولیس نے طلب کیا ہے تو میں جا کر معلوم کروں کہ بات کیا ہے"۔

"لالہ جی مہاراج!"— میں نے ذرا طنزیہ سے لہجے میں کہا— "ایک انسان کا بچہ قتل ہو گیا ہے۔ یہ کیس تھانے سے ہٹا کر کرائمز برانچ کے حوالے برائے تفتیش کیا گیا ہے۔ اس کی آخر کوئی وجہ ہے۔ آپ پڑھے لکھے اور ذمہ دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تعاون کریں ورنہ ہم تعاون لینا جانتے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی عزت اور آبرو کے ذمہ دار ہم ہیں۔ جتنی دیر وہ ہمارے ساتھ رہے گی آپ بڑے شوق سے باہر بیٹھے رہیں اور جب ہم اجازت دیں تو بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں"۔

"آپ میرے ہندوستانی بھائی ہیں"— اس نے ہندوؤں والی منافقت کو پیار میں چھپانے کے لئے کہا اور میرے قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنکھ سے ہلکا سا اشارہ اینڈریو کی طرف کر کے آہستہ سے بولا— "یہ گورا اردو تو نہیں جانتا ہوگا!"

"نہیں!"— میں نے جھوٹ بولا— "یہ صرف انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے، اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا"۔

میں نے پہلے لکھا ہے کہ انسپکٹر اینڈریو روانی سے اردو بولتا اور سمجھتا تھا اور مجھ سے پنجابی بول چال سیکھ رہا تھا۔ سنگیتا کے باپ نے میری بات کو سچ سمجھ کر میری چاپلوسی شروع کر دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا آخر مطلب کیا ہے...... وہ چاہتا یہ تھا کہ اس کی بیٹی کو شامل تفتیش نہ کیا جائے جو میں مان نہیں رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اس انگریز انسپکٹر کو میں کسی طرح سمجھا دوں اور وہ مجھے کچھ رشوت دے دے گا اور میں اس کی بیٹی کو باہر ہی سے چھٹی کرا دوں۔

"یہ کیا چاہتا ہے؟"— اینڈریو نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا اور بناوٹی غصے سے کہا— "اسے کہو باہر نکل جائے اور لڑکی کو اندر بھیجے"۔

میں نے سنگیتا کے باپ سے کہا کہ وہ فوراً باہر چلا جائے ورنہ یہ انگریز انسپکٹر اس کی بے عزتی کر کے باہر نکال دے گا۔ لالہ بڑی تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"مجھے اس پر شک ہے"— اینڈریو نے مسکراتے ہوئے کہا— "اگر میں نہ بول پڑتا تو یہ تمہارے ہاتھ میں کچھ رقم دے دیتا۔ تم نے یہ اچھا مذاق کیا ہے کہ میں اردو نہیں

جانتا"۔

ہم ہنس رہے تھے کہ ایک بڑی ہی حسین اور بڑے ہی دلکش جسم والی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے نقش و نگار میں بڑی جاذبیت تو تھی ہی، میں اس کے جسم کی ساخت سے زیادہ متاثر ہوا۔ بڑا موزوں قد اور جسم کی بناوٹ میں ایک خاص کشش تھی۔ اسے ہم نے اپنے پاس بٹھا لیا اور میں نے کہا کہ وہ دل سے گھبراہٹ اور خوف نکال دے اور بالکل فری ہو کر بات سنے اور کرے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس پر کوئی الزام نہیں، کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔

انسپکٹر اینڈریو نے میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے سر اوپر نیچے نہایت آہستہ سے ہلایا تو اینڈریو اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں لڑکی سے اکیلے بات کروں۔ اینڈریو کے ساتھ میں نے اس سے پہلے کچھ وارداتوں کی تفتیش کی تھی اس لئے وہ میرا اسٹائل سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سنگیتا جیسے گواہ یا مشتبہ سے میں ہی راز کی بات اگلوا سکتا ہوں۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ اینڈریو مجھے سنگیتا کے ساتھ اکیلا چھوڑ دے۔

"آپ مجھ سے کس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"— سنگیتا نے ذرا دبی دبی آواز میں پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا ایک کلاس فیلو قتل ہو گیا ہے؟"— میں نے کہا— "تم جانتی ہو اس کا نام لطیف تھا"۔

"میں کسی لطیف کو نہیں جانتی"— سنگیتا نے کہا— "جسے میں جانتی ہی نہیں اس کے قتل کے متعلق میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی"۔

اس نوجوان لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ بڑے بڑے چالاک اور عیار گواہ اور مشتبے میری تفتیشوں میں سے گزر چکے ہیں اور مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دشواری پیش نہیں آتی کہ یہ شخص دل کی بات کہہ رہا ہے یا مجھے الو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے سنگیتا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بات کرنے کا قدرتی انداز کیا ہے لیکن میں نے محسوس کر لیا کہ یہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے یہ اسے مجبور کر کے کہلوایا جا رہا ہے اور اس کا یہ انداز قدرتی نہیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی دشواری نہ ہوئی کہ باپ نے اسے ذرا دھمکا کر کہا ہوگا کہ وہ ایسا بیان دے جس سے اس کا مقتول کے ساتھ کوئی تعلق ظاہر نہ ہو۔

''سنگیتا!''—— میں نے اپنی کرسی اس کی کرسی کے قریب کر کے پیار سے کہا—— ''میں مسلمان ہوں۔ میرا نام ملک احمد یار خان ہے۔ میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس وقت بھول جاؤ کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ تمہاری پردہ پوشی کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تم نے شاید دیکھا نہیں کہ میں نے اس انگریز انسپکٹر کو اشارہ کر کے کمرے سے باہر بھیج دیا ہے۔ یہ میرا ساتھی ہے پھر بھی اسے وہ ساری باتیں نہیں بتاؤں گا جو تم مجھے بتاؤ گی''۔

سنگیتا نے میرے منہ پر نظر ڈالی اور پھر اس نے سر جھکا لیا۔ اگر اس کا واقعی مقتول کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا اور میں اسے کہتا کہ مقتول کو وہ جانتی تھی اور اس کے قتل کی بیک گراؤنڈ کو جانتی ہے تو وہ تڑپ تڑپ کر اور اچھل اچھل کر انکار کرتی اور کہتی کہ میں اس پر بے بنیاد شک کر رہا ہوں لیکن اس کا انداز کچھ اور تھا اور یہ انداز اس کا اپنا نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ اب میں نے اس کی آنکھوں میں ایسی سرخی دیکھی جو آنسوؤں کا پیش خیمہ تھی۔ وہ رونے پر آ گئی تھی اور آنسو روکنے کی بے انتہا کوشش کر رہی تھی۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں سنگیتا!''—— میں نے مشفقانہ اور دوستانہ لہجے میں کہا—— ''میں جانتا ہوں کہ تم لطیف کو کس حد تک چاہتی تھیں اور لطیف کس طرح تم پر دیوانہ تھا۔ تم نے مسلمان ہو کر لطیف کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور لطیف تمہاری خاطر اپنا گھر بار اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر تمہارے ساتھ جا رہا تھا لیکن وہ تمہیں بھی چھوڑ کر اکیلا چلا گیا اور گیا بھی ایسی جگہ جہاں وہ تمہیں نہیں لے جا سکتا تھا''۔

میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی لطیف کے لئے اندر سے اس قدر جذباتی ہو گی۔ اس وقت کی اس کی ذہنی حالت کو میں بھانپ چکا تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ جس کی خاطر وہ اپنا مذہب اور اپنا اتنا امیر خاندان بھی چھوڑ رہی تھی اس کے لئے وہ کس قدر جذباتی ہو گی۔ میری یہ بات سن کر اس نے سر جھکایا پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور جھک گئی۔ اس کا جسم اس طرح ہل رہا تھا جیسے وہ سسکیاں اور ہچکیاں لے لے کے رو رہی ہو۔ میرے الفاظ اور بولنے کے انداز نے اس کی جذباتی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔

''سنگیتا!''—— میں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اور ذرا اوپر اٹھا کر کہا—— ''کھل کر رو لو اور لطیف کے لیے جتنے بھی آنسو بہا سکتی ہو بہاؤ پھر بھی کم ہوں گے...... اس وقت مجھے اپنا بھائی سمجھو، باپ سمجھو، میرے سوا تمہارا کوئی ہمدرد نہیں۔ میں تمہاری محبت کی ساری داستان جانتا ہوں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ لطیف کو تمہاری محبت نے

قتل کروایا ہے''۔

اب جو وہ روئی ہے تو میں سمجھا کہ اسے میں سنبھال نہیں سکوں گا۔ یہ تو میں نے آپ کو بڑی مختصر باتیں بتائی ہیں جو میں نے کہی تھیں، میں نے اس سے زیادہ ہی جذباتی باتیں کی تھیں اور اس طرح یہ حسین و جمیل لڑکی میرے قبضے میں آ گئی۔

''میں ایک اور بات بھی جانتا ہوں سنگیتا!''—— میں نے جذباتی سے لہجے میں یہ جھوٹ بولا—— ''میں نے تمہارے منگیتر کو دیکھا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اچھے اخلاق کا آدمی نہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ یہ شخص اس قابل بھی نہیں کہ سنگیتا کے گھر کا نوکر بنے۔ میں اسے تمہارے جوتے صاف کرنے کے بھی قابل نہیں سمجھتا۔ اگر میں کہوں کہ اس شخص نے لطیف کو قتل کروایا ہے تو تم کیا کہو گی؟''

حقیقت یہ تھی کہ میں نے اس کے منگیتر کو دیکھا ہی نہیں تھا، اس کے متعلق صرف سنا تھا۔

''مجھے بھی اس بھدے سانڈ پر شک ہے''—— سنگیتا نے کہا۔

''میں تمہارا مشکور ہوں!''—— میں نے کہا—— ''میں یہی چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کھل کر دل کی بات کرو پھر میرا اخلوص اور میری ہمدردیاں دیکھ لینا...... کیا تم نے منگیتر کو بتا دیا تھا کہ تم اسے پسند نہیں کرتیں اور تم کسی اور کو چاہتی ہو؟...... اگر تم مجھے صحیح اور سچا جواب دے دو تو پھر دیکھنا کہ میں تمہارے منگیتر کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دوں گا کہ یہ اشارہ تم نے مجھے دیا تھا''۔

''میں آپ کو صحیح جواب دوں گی''—— سنگیتا نے کہا—— ''اور میری پردہ پوشی کا وعدہ پورا کرنا آپ کا کام ہے...... میں نے منگیتر کو ایک بار نہیں دوبارہ کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی اور مجبوراً کر دی گئی تو میں گھر سے ہی بھاگ جاؤں گی یا خودکشی کر لوں گی۔ میں نے اپنی ماں کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنے ایک مسلمان کلاس فیلو کو چاہتی ہوں اور اسی کے ساتھ شادی کروں گی۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں اس لڑکے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑ رہی ہوں۔ ماں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ اپنے باپ کو پتہ نہ چلنے دینا ورنہ وہ تمہیں نہیں تو اس مسلمان لڑکے کو قتل کروا دے گا یا اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس پر ایسا الزام عائد کرا دے گا کہ وہ بیچارہ جیل میں گلتا سڑتا رہے گا۔ اگر تمہارے باپ نے یوں نہ کیا تو تمہاری ہڈی پسلی ایک کر کے اس منگیتر کے ساتھ تمہیں بیاہ دے گا......

"میں تو اپنے باپ کو بھی بتا دینے پر تلی بیٹھی تھی لیکن ماں کے منع کرنے پر میں چپ رہی۔ باپ کو پھر بھی پتہ چل گیا۔ وہ اس طرح کہ میرے منگیتر نے میرے باپ کو بتا دیا کہ میں نے اسے کیا کہا ہے۔ باپ سخت غصے میں گھر آیا۔ مجھے اور میری ماں کو الگ بٹھا کر مجھ سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے۔ مجھ پر لطیف کی محبت ایسی بری طرح سوار تھی کہ میں نے صاف الفاظ میں باپ کو بتا دیا کہ میں ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ شادی کر رہی ہوں اور اس منگیتر کو کہہ دیا ہے...... باپ نے مجھے مارا پیٹا نہیں لیکن اس نے کسر کوئی نہیں چھوڑی۔ باپ نے کہا کہ وہ اس مسلمان لڑکے کا سراغ لگائے گا اور اسے ایسا غائب کرائے گا کہ پھر کبھی وہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ ایسی دھمکیاں میرے منگیتر نے بھی مجھے دی تھیں"۔

ماں، بیٹی سے زیادہ خوبصورت اور......

میں نے اس لڑکی سنگیتا کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ میری ایکٹنگ اور زبان کا کمال تھا۔ اسے یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ اس کی محبت کے متعلق مجھے ہر بات پہلے ہی معلوم ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب اس کے باپ کو پتہ چل گیا کہ اس کی یہ بیٹی ایک مسلمان کے ساتھ شادی کر رہی ہے اور منگیتر کو اس نے کہہ دیا ہے کہ وہ اسے پسند نہیں تو پھر بھی وہ مقتول سے ملتی ملاتی رہی تھی؟

"نہیں!" ـــــ سنگیتا نے جواب دیا ـــــ "مجھے گھر میں قید کرلیا گیا تھا اور یوں سمجھیں کہ مجھ پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے۔ باپ نے تو میرے ساتھ بول چال بند کر دی تھی اور میرے دونوں بھائی اور ایک بہن مجھ سے ناراض ناراض رہنے لگے تھے، صرف ماں تھی جو میری دلجوئی کرتی تھی۔ لطیف کے ساتھ میرا رابطہ کٹ گیا تھا"۔

"پھر تمہیں لطیف کے قتل کا کس طرح پتہ چلا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"اخبار میں خبر پڑھی تھی" ـــــ سنگیتا نے جواب دیا ـــــ "اس خبر کے ساتھ لطیف کی فوٹو بھی چھپی تھی۔ میں چھپ چھپ کر روتی رہی اور یہ سوچتی رہی کہ لطیف کی قبر کا اتہ پتہ کس سے پوچھوں، میں اس کی قبر پر جانے کو بے تاب ہوتی رہی"۔

اس طرح وہ اپنے زخمی جذبات کا اظہار کرتی اور روتی رہی۔ میں اس کے جذبات کا ساتھ اس طرح دیتا رہا جیسے اس کے ساتھ میری رازدارانہ دوستی ہو۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ وہ اپنی ماں کی تعریفیں کرتی تھی۔ ماں کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا اور ماں

کے متعلق سنگیتا کی رائے یہ تھی کہ وہ اس کی ماں نہیں بلکہ ہم راز اور ہمدرد سہیلی ہے۔

مجھے اس کی ماں پر بھی شک ہونے لگا۔ ماں اس سے بھید لیتی ہوگی۔ وہ بھی آخر ہندو تھی اور ایسے ہندو کی بیوی تھی جس کا معاشرے اور سیاست میں ذرا اونچا مقام تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ماں نے اپنی بیٹی کا یہ جرم معاف کر دیا ہو کہ وہ مسلمان ہو رہی تھی۔

میں نے سنگیتا کے ساتھ اس کی ماں کے متعلق بچ بچ کر دو چار باتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ماں پر ذرا سا بھی شک برداشت نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ ماں نہ ہوتی تو وہ لطیف کے قتل کی خبر سن کر ہی خودکشی کر لیتی۔

اس نے کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو تھیں تو اس کی ماں کی تعریفیں لیکن ماں کے خلاف میرا شک مزید پختہ ہو گیا۔ میں اٹھا اور اس کمرے میں چلا گیا جہاں انسپکٹر اینڈریو میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ لڑکی میرے قبضے میں آ گئی ہے اور اس کی ماں کو بلانا ضروری ہو گیا ہے۔ اینڈریو نے کہا کہ اس لڑکی کے باپ کو میں باہر بیٹھا رہنے دوں اور اے ایس آئی کو بھیج کر لڑکی کی ماں کو بلوا لوں۔

میں نے ایسے ہی کیا اور پھر سنگیتا کے پاس جا بیٹھا۔ میرے ہمدردانہ رویے اور خوش مزاجی سے سنگیتا اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ اب وہ میرے ساتھ وہ باتیں بھی بے تکلفی سے کر رہی تھی جو سہیلیاں الگ بیٹھ کر آپس میں کیا کرتی ہیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ سنگیتا کا دل زخمی ہو گیا تھا اور اس کے جذبات لہولہان ہو گئے تھے اور وہ شدت سے ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ کسی ہمدرد کو پاس بٹھا کر سینے کا غبار نکالے۔

اس کے ساتھ ابھی تانگے اور گھوڑے کی بات نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سنگیتا اس تانگے کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ یہ کس کا تھا۔ اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو جہاں اس نے میرے ساتھ دل کی ہر بات کر لی تھی وہ مجھ سے یہ بھی پوچھ لیتی کہ تانگہ کس کا تھا جس پر قاتل آئے اور بھاگے تھے۔

سنگیتا کی باتیں سنتے اور کچھ اپنی کہنے اور اپنی ضرورت کے سوال پوچھتے اتنا وقت گزر گیا جس کا احساس ہی نہ ہوا۔ اے ایس آئی نے آکر بتایا کہ لڑکی کی ماں آگئی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اس عورت کو پچھلے گیٹ سے اندر لائے تاکہ اس لڑکی کا باپ اسے دیکھ نہ سکے۔ اے ایس آئی نے ایسے ہی کیا تھا اور سنگیتا کی ماں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ یہ بات سنگیتا کو بھی نہیں بتائی تھی۔ میں اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر اے ایس آئی کے ساتھ اس

کمرے میں چلا گیا جس میں سنگیتا کی ماں کو بٹھایا گیا تھا۔

اس کی ماں کو میں نے بڑے اچھے انداز سے تسلی دی کہ یہاں گھبرانے اور ڈرنے والی کوئی بات نہیں اور اس کی بیٹی میرے پاس ہے، بالکل ٹھیک ہے اور اس پر کوئی الزام نہیں نہ ہی میں اس پر کوئی الزام آنے دوں گا...... اس طرح کچھ اور باتیں کہہ کر میں نے اس عورت کو مطمئن اور پُرسکون کر دیا اور پھر اسے کہا کہ وہ کچھ دیر یہاں انتظار کرے اور میں اسے اپنے پاس بلوا لوں گا۔

سنگیتا کے پاس واپس آکر میں نے کوئی بات کی اور اس کے جواب میں اس نے کچھ کہا اور پھر میں نے کہا کہ اس کی ماں تو مذہب کی خاصی پابند ہوگی۔

''مذہب!''۔۔۔ سنگیتا نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگی۔۔۔ ''جہاں میں نے آپ کو ہر بات بتا دی ہے یہ بھی بتا دیتی ہوں۔ اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو اس بات پر بھی پردہ ڈالے رکھنا...... میری ماں نام کی ہندو ہے۔ وہ مسلمانوں کو اچھا سمجھتی ہے اور ایک بات تو اس نے یہ بھی کہہ دی تھی کہ معلوم نہیں کیوں اس نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میری ماں بڑی ہی زندہ مزاج عورت ہے اور اس میں ہندوؤں والی گھٹن اور منافقت ہے ہی نہیں۔ میں نے اسی کا اثر قبول کیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے ایک مسلمان اچھا لگا اور میں نے اسی کا مذہب اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کی کبھی میری ماں سے ملاقات ہو جائے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ یہ عورت ہندو نہیں مسلمان ہے''۔

سنگیتا نے کوئی عجیب بات نہیں کی تھی۔ گو ایسے ہندو بہت ہی کم تھے لیکن تھے ضرور جو برائے نام ہندو تھے اور مسلمانوں کی دوستی اور ان کے طرز بود و باش کو اچھا سمجھتے تھے۔ ہندو گوشت نہیں کھاتے۔ میں نے ایسے تین ہندو دیکھے تھے جو اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ گوشت بھی کھاتے، شراب بھی پیتے تھے اور ایک ہندو تو گائے کا گوشت بھی کھا لیتا تھا جو ہندوؤں کے ہاں بہت ہی بڑا گناہ تھا کیونکہ گائے کو وہ گئو ماتا کہتے ہیں اور گائے کو دیوی کا درجہ دیتے ہیں۔

میں نے سنگیتا کو ایک اور کمرے میں بٹھا دیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اس کے لئے چائے اور ساتھ کھانے کے لئے کچھ لے آئے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر میں اس کی ماں کو اپنے تفتیشی کمرے میں لے آیا۔ یہاں میں تفصیل نہیں سناؤں گا کہ اس سے کیا کچھ پوچھا

اور اس نے کیا کچھ بتایا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ عورت فطری طور پر کیسی ہے؟ کیا یہ چالاک اور مکار عورت ہے یا کیا یہ ویسی ہی کشادہ ظرف ہے جیسے سنگیتا نے بتائی تھی۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے اس عورت کے ساتھ تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلی بات یہ دیکھی کہ خوبصورت عورت تھی اور جوانی میں تو اپنی بیٹی سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔

میں نے بات بالکل اسی طرح شروع کی جس طرح سنگیتا کے ساتھ کی تھی۔ زبان کا ویسا ہی جادو چلایا اور ہمدردی اور اپنائیت کی ایکٹنگ کی اور ایسے پیار کا تاثر پیدا کر دیا کہ یہ عورت کھل کر بولنے پر آگئی۔ جب اس نے بات شروع کی تو یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ خود اعتمادی سے بولتی ہے اور یہ عورت لگی لپٹی نہیں رکھے گی۔ میں اگر اس کی اور اپنی گفتگو لکھ ڈالوں تو یہ ویسی ہی ہوگی جیسی سنگیتا کے ساتھ ہوئی تھی اس لئے میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔

''میں یہ تو جانتی ہوں کہ آپ پولیس آفیسر ہیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اگر آپ برا نہ سمجھیں تو میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ آپ مسلمان ہیں، عیسائی یا ہندو!''

میں نے جیب سے اپنا سی آئی اے والا شناختی کارڈ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ کارڈ انگریزی میں تھا اور یہ عورت انگریزی پڑھ سکتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس نے سکون کی آہ بھری اور گردن کو کچھ اور ہی طرح خم دیا جیسے اس کی کوئی اذیت ختم ہوگئی ہو۔

جس طرح میں نے سنگیتا کو بتایا تھا کہ مجھے ہر بات معلوم ہے اسی طرح اس عورت کو بتایا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کچھ دیر بعد میں اسے اس کی بیٹی سے ملوا دوں گا اور وہ بیٹی سے پوچھے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔

''یہ تو میں دیکھ چکی ہوں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''کسی بھی انسان کو ایک نظر میں بھانپ لیتی ہوں لیکن صرف ایک ڈر دل میں رہتا ہے کہ آپ پولیس کے آفیسر ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں آپ کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کرتی، ابھی تو یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ نے میری بیٹی کو اور مجھے کیوں بلایا ہے''۔

میں نے اس کے سوال کا جو جواب دیا اس سے باتوں کا ایک اور ہی سلسلہ نکل آیا جس کا اس واردات کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق نہیں تھا لیکن میں نے یہ سلسلہ چلتا رہنے دیا تاکہ کوئی ایسا اشارہ مل جائے جو مجھے قاتل تک پہنچا دے لیکن یہ عورت بات کو کسی اور طرف لے گئی۔

لڑکی نے دوستی بدل لی

میں نے آپ کو تفصیلی طور پر نہیں بتایا کہ میں کس طرح خود ہی اسے اس بات پر لے آیا تھا۔ میں نے اس پر ایسا اثر پیدا کر دیا تھا کہ وہ مجھے پولیس آفسر کی بجائے ایک مسلمان سمجھنے لگی تھی اور مجبور ہوگئی تھی کہ دل کی بات کہہ ڈالے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہ نوعمر لڑکی نہیں تھی کہ شرم وحجاب کرتی جوان اولاد کی ماں تھی اور اس میں جرأت سے بات کرنے والا وصف موجود تھا۔

''آپ یہ بتائیں کہ آپ کو شک کس پر ہے''۔۔۔ اس نے پوچھا۔۔۔ ''پھر میں آپ کو اپنا شک بتاؤں گی''۔

''اگر یہی بات میں تم سے پوچھوں تو کیا جواب دوگی؟''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ میں اس وعدے پر پوچھ رہا ہوں کہ میرے سوا کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم نے یہ شک ظاہر کیا تھا۔ میری دوستی پر اب تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے''۔

''مجھے دو آدمیوں پر شک ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ایک میرا خاوند اور دوسرا میری بیٹی کا منگیتر''۔

اس نے اس شک کی وجہ یہ بتائی کہ اس کا خاوند اثر ورسوخ والا آدمی ہے اور کٹڑ برہمن ہے اور وہ کسی کو بھی قتل کروانے کی طاقت اور ذرائع رکھتا ہے۔ بیٹی کے منگیتر کے متعلق اس نے وہی بات بتائی جو میں پہلے دوسروں کی زبانی بتا چکا ہوں۔

اس نے یہ وجوہات تو بتا دیں لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے خلاف کیوں ہے۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ اپنی بیٹی کا منگیتر اسے بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں نے براہِ راست سوال کرنے کی بجائے ذرا لمبا راستہ اختیار کیا اور آخر اسے اس مقام پر لے آیا جہاں اس نے دل کی وہ بات کہہ ڈالی جس کا اشارہ پہلے دے چکی تھی۔

''میرا خاوند اثر ورسوخ والا ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اپنی قوم میں اور سوسائٹی میں ایک اونچا درجہ حاصل کر رکھا ہے اور دولت مند بھی ہے لیکن میرے دل میں اس شخص کے خلاف اگر نفرت نہیں تو ناپسندیدگی بھری ہوئی ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ اس میں ہندوؤں والی ذہنی گھٹن اور عیاری اور منافقت ہے...... جوانی کے وقتوں کی بات ہے کہ مجھے مسلمان اچھے لگتے ہیں۔ میں ظاہری طور پر ہندو عورتوں سے ملتی تو ہوں لیکن دلی سکون

مسلمان عورتوں کے پاس بیٹھ کر ملتا ہے۔ بیٹی نے میرا اثر قبول کیا تھا اور ایک مسلمان لڑکے ساتھ دل لگا لیا''۔

میں نے اسے اسی موضوع پر جکڑ لیا اور ایسے دوستانہ انداز سے باتیں کیں کہ وہ مکمل طور پر میرے ساتھ بے تکلف ہوگئی۔ بولتے بولتے اس نے بے اختیار میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑا نہیں لیا بلکہ اس کے ذریعے اور زیادہ بے تکلفی پیدا کر لی۔ کچھ دیر گفتگو چلی۔

''میرے اس راز کو اگر آپ راز ہی رکھیں تو ایک اور بات بھی بتا دیتی ہوں''۔۔۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں آہستہ آہستہ ملتے ہوئے کہا۔۔۔ ''میں نے اس خاوند کی موجودگی میں ایک مسلمان کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ میرا ایک بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے سنگیتا کو جنم دیا لیکن یہ میرے خاوند کی بیٹی نہیں بلکہ میرے اس دوست کی ہے۔ میں نے سنگیتا کو آج تک نہیں بتایا کہ وہ ایک مسلمان کی بیٹی ہے۔ اس کے بعد میرا یہ دوست دلی سے ایسا گیا کہ پھر واپس ہی نہیں آیا''۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کا یہ راز میرے دل میں ہمیشہ کے لئے دفن رہے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنا دوست بنانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے مایوس نہ کیا۔ وہ عملاً محبت کا اظہار کر رہی تھی اور میں اس کا اظہار عملاً قبول کر رہا تھا۔ میں دراصل اس کوشش میں تھا کہ یہ کوئی ایسا اشارہ دے دے جس سے میں اس کے خاوند کو مشتبہ کی حیثیت سے شامل تفتیش کرلوں لیکن اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اپنے خاوند کی اس قسم کی مجرمانہ سرگرمیوں سے واقف نہیں تھی۔ سنگیتا کے منگیتر کو تو میں نے لپیٹ میں لے ہی لینا تھا اور سی آئی اے کا طریقہ کار استعمال کر کے اس سے اقبال جرم کروا لینا تھا لیکن پہلے اس کے خلاف کوئی شہادت فراہم کرنی ضروری تھی۔

اب مجھے اس ماں بیٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر طریقہ اختیار کر کے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دل کی ہر بات اگل ڈالی تھی لیکن مجھے جس سراغ یا اشارے کی ضرورت تھی وہ نہ ملا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری تفتیش ابھی وہیں تھی جہاں سے شروع کی تھی۔ بات ابھی شک اور شبے میں ہی تھی۔ یہ تفتیش مشکل ترین تفتیشوں میں سے تھی۔

میں نے سنگیتا کی ماں کو ساتھ لے جا کر دوسرے کمرے میں بٹھا دیا اور سنگیتا کو تفتیشی کمرے میں لے آیا۔ پھر انسپکٹر اینڈریو کے پاس چلا گیا اور اسے بتایا کہ میں نے کیا کچھ کہا

ہے اور کیا حاصل ہوا۔ سنگیتا سے ایک دو باتیں پوچھ کر ماں بیٹی کو رخصت کر دینا تھا۔ اینڈریو نے کہا کہ میں انہیں فارغ کر دوں تو ساری روئیداد سن لوں گا۔ میں سنگیتا کے پاس جا بیٹھا۔

سنگیتا کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی ماں بھی آئی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ بڑی لمبی باتیں ہو چکی ہیں۔ میں۔ نے سنگیتا سے معذرت کی کہ میں ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا اور اسے اکیلا بیٹھنا پڑا۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی'' ــــ سنگیتا نے کہا ــــ ''میں تو کہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ ہی رہوں اور قاتل گرفتار ہو جائے تو اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دوں...... کیا آپ قاتل کو جلدی گرفتار کر لیں گے؟''

''مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اگر اس تانگے کے مالک کا سراغ مل گیا تو قاتل پکڑا جائے گا''۔

''کون سا تانگہ؟'' ــــ سنگیتا نے پوچھا۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں؟'' ــــ میں نے کہا ــــ ''قاتلوں کو لوگوں نے بھاگتے اور ایک تانگے میں سوار ہو کر جاتے دیکھا تھا''۔

سنگیتا نے بتایا کہ اخبار کی خبر میں کسی تانگے کا ذکر نہیں تھا۔ میں اخبار تو باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا لیکن قتل کی یہ خبر نہ پڑھ سکا تھا۔ سنگیتا نے بتایا کہ خبر میں یہی تھا کہ لوگوں نے دو آدمیوں کو ایک نوجوان پر حملہ کرتے دیکھا اور اسے قتل کر کے بھاگ گئے۔

میں نے اسے بتایا کہ قاتل ایک تانگے میں بیٹھ کر بھاگے تھے اور یہ بھی بتایا کہ تانگہ پرائیویٹ تھا اور اس کا رنگ گہرا نیلا یا کالا تھا۔

''ٹھہریں!'' ــــ سنگیتا نے چونک کر کہا اور پوچھا ــــ ''اس کے گھوڑے کا رنگ سفید اور براؤن تو نہیں تھا؟''

میں نے اسے گھوڑے کا وہ رنگ بتایا جو موقعہ کے گواہوں سے پوچھا تھا، وہ سفید اور براؤن ہی تھا۔ سنگیتا نے کہا کہ یہ سواریوں والے تانگوں جیسا دبلا پتلا گھوڑا نہیں تھا بلکہ سواری والے گھوڑوں جیسا تھا جو گھوڑوں کے شوقین لوگوں کے رکھے ہوتے ہیں۔ بڑا موٹا تازہ گھوڑا ہوگا...... میں نے اسے بتایا کہ وہ ویسا ہی تھا جیسا وہ بتا رہی ہے۔

''میں جانتی ہوں یہ تانگہ کس کا ہے'' ــــ سنگیتا نے یوں کہا جیسے کوئی غصے کو دباتے ہوئے دانت پیس کر بات کرتا ہے ــــ ''وہی تھا...... وہی تھا...... میں آپ کو بتاتی ہوں

اور اسے فوراً پکڑیں۔ میں کورٹ میں اس کے خلاف گواہی دوں گی''۔

سنگیتا نے دلی کے ایک جاگیردار کا نام لے کر کہا کہ یہ اس کا تانگہ ہے اور اس کے تانگے کو اس کا اکلوتا بیٹا ارشادالحسن استعمال کیا کرتا ہے...... میں دوسرے کمرے میں جا کر انسپکٹر اینڈریو کو بلا لایا اور اسے بتایا کہ تانگے کا سراغ مل گیا ہے۔ سنگیتا انگریز کو دیکھ کر ذرا جھینپی لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ اس انگریز کو یہ انکشاف معلوم ہونا چاہئے پھر قاتل آسانی سے گرفتار کیا جا سکے گا۔ اسے کہا کہ وہ اسی طرح بے تکلفی سے سارا بیان دے جس طرح میرے ساتھ باتیں کرتی رہی ہے۔

اب دیکھئے اس اللہ کی ذاتِ باری کس طرح مدد کرتی ہے جس پر میں ہر صورتِ حال میں بھروسہ کیا کرتا تھا اور کر رہا ہوں۔ سنگیتا نے جو قدرے لمبی کہانی سنائی وہ مختصراً یوں تھی کہ اسے ہمیشہ مسلمان اچھے لگا کرتے تھے۔ اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ شادی کسی مسلمان کے ساتھ ہی کرے گی۔ اسے ارادہ کہیں یا خواہش کہیں، ہوا یہ کہ وہ جب تھرڈ ائیر میں پڑھتی تھی تو اس کی دوستی اپنے اس کلاس فیلو ارشادالحسن کے ساتھ ہو گئی جس کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ یہ تانگہ اس کا ہے۔ ارشاد خوبرو لڑکا تھا اور دولت مند جاگیردار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سنگیتا بھی دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔

ارشاد سنگیتا کو اتنا اچھا لگا کہ باقاعدہ محبت اور ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ یہ خوش طبع لڑکا تھا اور کبھی کسی بات پر سنجیدہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس پیسے ہوتے تھے اس لئے سنگیتا کو وہ کسی بڑے ہوٹل میں لے جا کر کھلاتا پلاتا تھا۔ سنگیتا نے بلا جھجک ہمیں بتایا کہ اس نے ارشاد سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی اور مسلمان ہو جائے گی۔ خود ارشاد بھی یہی چاہتا تھا۔

سنگیتا بہت خوش تھی کہ وہ جس قسم کا مسلمان لڑکا چاہتی تھی وہ اسے مل گیا ہے۔ ارشاد کبھی کبھی اسے اپنے تانگے میں بٹھا کر نئی دلی سے باہر کسی خوبصورت سیرگاہ میں لے جاتا اور کبھی جمنا کے کنارے جا بیٹھتے اور ایک دوسرے میں گم ہو جاتے تھے۔ اس طرح سنگیتا اس تانگے اور اس گھوڑے سے پوری طرح واقف تھی۔

ان کی دوستی چھ سات مہینوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ بات بھی سنگیتا نے بلا شرم وحجاب کہی کہ ارشاد اس کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ ہمیں میاں بیوی تو بننا ہی ہے اور شادی قبولیت کا ہی مسئلہ ہوتی ہے جو ہم میں موجود ہے تو اس میں کوئی

قباحت نہیں کہ با قاعدہ شادی سے پہلے ہی میاں بیوی والا کھیل کھیلنا شروع کر دیں۔ یہ بات سنگیتا کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھی۔ وہ پاک محبت چاہتی تھی اور پھر اس محبت کو شادی تک پہنچانا تھا۔

سنگیتا نے ارشاد کا یہ مطالبہ ٹھکرانا شروع کر دیا اور اسے صاف کہہ دیا کہ وہ جسمانی محبت نہیں رکھے گی۔ ارشاد نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا اور ایک روز یہ بھی کہا کہ سنگیتا نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اسے اغوا کر کے زبردستی کرے گا یا اسے غائب ہی کر دے گا۔ سنگیتا وقار والی آبرومند لڑکی تھی۔ اس نے ارشاد کو چیلنج کے انداز میں کہا کہ وہ اسے اغوا کرے پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اس چپقلش پر آکر ان کی دوستی ٹوٹ گئی۔

سنگیتا کو اس کا بہت دکھ تھا لیکن وہ گندی ذہنیت والے لڑکوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ فورتھ ائیر میں جا کر وہ واقعہ ہوا جو میں نے پہلے سنایا ہے۔ دو بدمعاش قسم کے لڑکے سنگیتا کو چھیڑتے تھے اور ایک روز مقتول لطیف نے دیکھ لیا اور ایک لڑکے کو پھینٹی لگا دی۔ سنگیتا نے بتایا کہ لطیف نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اب لطیف نے اسے ان دو لڑکوں کی بے ہودگی سے نجات دلا دی تو سنگیتا کے دل میں لطیف داخل ہونے لگا۔ اس نے لطیف کا شکریہ ادا کیا تو لطیف اور سنگیتا کی محبت شروع ہوگئی۔

آگے چل کر صرف ایک بار ارشاد نے سنگیتا سے کہا تھا کہ اس لڑکے کی خیریت چاہتی ہو تو تعلق توڑ لو۔ سنگیتا نے بڑے ہی نازیبا الفاظ کہہ کر ارشاد کو دھتکار دیا تھا پھر جس طرح لطیف کے دوستوں نے مجھے بتایا تھا اس طرح لطیف اور سنگیتا کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ سنگیتا نے بتایا کہ لطیف میں خاندانی شرافت تھی، جرأت بھی تھی اور اس نے کبھی کوئی بیہودہ بات یا حرکت نہیں کی تھی۔ انہوں نے شادی کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

سنگیتا نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ لطیف نے اسے بتایا تھا کہ اس نے اپنے والدین کے ساتھ شادی کی بات کی ہے لیکن وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے سے ڈرتے ہیں۔ اس کے باوجود لطیف نے سنگیتا سے کہا تھا کہ دور کسی شہر میں کوئی ٹھکانہ بن جائے تو دونوں بھاگ کر وہاں چلے جائیں گے اور اتنے میں لطیف قتل ہو گیا۔

انسپکٹر اینڈریو کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سنگیتا نے کہا کہ قتل سے چھ سات روز پہلے مقتول لطیف نے اسے بتایا تھا کہ آج ارشاد نے اسے روک کر کہا تھا کہ سنگیتا کی دوستی ترک کر دو ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ لطیف نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا انجام دیکھ کر

دوستی ترک کرے گا اور ارشاد اسے پہلے اس انجام تک پہنچائے۔

مجھے امید ہے کہ میں نے بات اتنی مختصر کر کے اصل بات اور بیک گراؤنڈ ٹھیک طرح واضح کر دی ہے۔ وہ سارا دن ماں بیٹی کے ساتھ ہی گزر گیا۔ سنگیتا کا باپ سارا دن باہر بیٹھا رہا۔ آخر ہم نے اسے اندر بلایا پھر سنگیتا کی ماں کو دوسرے کمرے سے بلایا تو باپ اپنی بیوی کو دیکھ کر حیران ہو گیا کہ یہ کس وقت آئی ہے۔ میں نے اس پر ساری بات واضح کر دی اور پھر کہا کہ ہمیں قاتل کا سراغ مل گیا ہے اور سنگیتا کی ہمیں شناخت کے لئے ضرورت پڑے گی۔ وہ یعنی باپ پریشان ہوئے بغیر ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ اس طرح اس کی کچھ دلجوئی کر کے اس کی بیوی اور بیٹی کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔

ہم نے اسی وقت ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر تینوں موقعہ کے گواہوں کے ایڈریس دیئے اور کہا کہ انہیں یہ تحریری اطلاع دے آئے کہ صبح نو بجے سے پہلے یہاں حاضر ہو جائیں۔ اس کے بعد ہم نے اس جاگیردار کے گھر چھاپہ مارنے کے انتظامات کئے۔ پولیس کی چھوٹی سی گارد کا بندوبست بھی کر لیا۔ تانگے کی شناخت کے لئے سنگیتا کو ساتھ ہونا چاہئے تھا لیکن ہم نے دانستہ اسے اس موقعہ پر ساتھ نہ رکھا۔ موقعہ کے تینوں گواہ تانگہ اور گھوڑا پہچانتے تھے۔

اگلی صبح تینوں گواہ نو بجے سے کچھ پہلے آگئے۔ باوردی پولیس کے آٹھ کانسٹیبل اور دو ہیڈ کانسٹیبل بھی آگئے۔ ہم نے چھاپہ مارنے اور خانہ تلاشی کا وارنٹ علاقہ مجسٹریٹ سے لے لیا تھا۔ اس وقت پولیس کی یہ کارروائیاں بڑی ہی تیزی سے ہوا کرتی تھیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کچہری جا کر یہ پتہ چلے کہ مجسٹریٹ صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ ہم نے مطلوبہ وارنٹ رات مجسٹریٹ کے گھر سے بنوا لیا تھا۔ ارشاد کے گھر کا ایڈریس سنگیتا سے معلوم کر لیا تھا۔

اگلی صبح نو بجے گارد اور گواہوں کو بڑی گاڑی پر سوار کیا، میں اور اینڈریو جیپ میں بیٹھے اور چل پڑے۔ اپنے ٹارگٹ پر پہنچے تو جاگیردار کی کوٹھی دیکھ کر ہم پر رعب طاری ہو گیا۔ وہ تو ایک محل تھا جس کے چاروں طرف تقریباً پانچ فٹ اونچی اور بڑی خوبصورت دیوار تھی۔

ایک کش سگریٹ، دو گھونٹ شراب

کانسٹیبلوں کو ہم نے یہ کہہ کر کوٹھی کے چاروں طرف پھیلا دیا کہ کسی کو باہر نہ جانے

دیں۔ باہر سے کوئی آدمی اندر آنا چاہے تو اسے پہلے ہمارے پاس لے آئیں۔ کوٹھی کا باہر والا گیٹ بند تھا۔ ہم نے گیٹ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ چوکیدار نے اندر سے گیٹ کھول دیا۔ اس سے جاگیردار اور اس کے بیٹے ارشادالحسن کا پوچھا کہ گھر میں ہیں یا نہیں۔

''سب سوئے ہوئے ہیں''۔۔۔ چوکیدار نے کہا۔۔۔ ''وہ تو گیارہ بجے کے قریب اٹھا کرتے ہیں''۔

میں نے چوکیدار کو بتایا کہ ہم پولیس کے انسپکٹر ہیں، سب کو جگا دو۔ وہ چلنے لگا تو میں نے اس سے پوچھا کہ ان کا تانگہ اور گھوڑا کہاں ہے۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اصطبل میں ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ دو گھوڑے سواری والے ہیں اور تیسرا تانگے کا گھوڑا ہے۔

چوکیدار چلا گیا اور کچھ دیر بعد جاگیردار باہر نکلا۔ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی یا گھبراہٹ کی بجائے غصے کا تاثر تھا۔ ہم اس کی طرف چلے اور وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا اور پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ ہم دونوں انسپکٹروں نے اسے اپنے کارڈ دکھائے پھر خانہ تلاشی کا وارنٹ دکھایا اور ساتھ یہ کہا کہ آپ کی کوٹھی پولیس کے گھیرے میں ہے۔

''یہ معاملہ کیا ہے؟''۔۔۔ اس چوہدری نے بہت بڑے افسروں کی طرح پوچھا اور کہا۔۔۔ ''میں آئی جی صاحب کو فون کرتا ہوں''۔

''ہم آپ کو فون کرنے کی فرصت نہیں دے سکتے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ انگریز انسپکٹر ابھی خاموش ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ یہ خاموش ہی رہے اس لئے میں آپ کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ ہم چھاپہ مارنے آئے ہیں۔ ہمیں اپنا تانگہ اور تانگے کا گھوڑا دکھا دیں اور اپنے بیٹے ارشادالحسن کو باہر لے آئیں ورنہ ہم خود اندر جا کر اسے باہر لے آئیں گے''۔

یہ چوہدری ان جاگیرداروں وغیرہ میں سے تھا جنہوں نے جنگ عظیم میں انگریزوں کو جنگی فنڈ میں بہت رقمیں دی تھیں۔ یہ چوہدری انگریزوں کا پالا ہوا اور بنایا ہوا جاگیردار تھا۔ اسے یہ توقع تھی کہ انگریز اسے ہر مشکل اور مصیبت سے بچائے رکھیں گے لیکن اسے یہ احساس نہیں تھا کہ انگریز اپنے قانون کی قربانی نہیں دیا کرتا۔ انگریز اپنے خوشامدیوں کو انعام دے دیا کرتے تھے لیکن کتنا ہی بڑا کوئی خوشامدی کیوں نہ ہوتا اس کا کوئی جرم معاف

نہیں کرتے تھے۔

مختصر بات یہ کہ یہ شخص پہلے اپنی جاگیرداری کا اور انگریزوں سے وفاداری کا رعب دکھاتا رہا اور پھر ذرا نرم ہوا تو انسپکٹر اینڈریو نے گرج کر کہا کہ ملک اسے کہو ہم جو کہتے ہیں وہ کرے اور اپنی زبان بند رکھے...... یہ سن کر چوہدری صاحب کچھ اور نرم ہوئے اور ہمیں اصطبل میں لے گئے۔ یہ اصطبل کوٹھی کے احاطے میں ہی تھا۔

اس سے پہلے ہمیں جو چیز نظر آئی وہ تین گھوڑے تھے جن میں ایک کا رنگ بالکل وہی تھا جو ہمیں بتایا گیا تھا۔ تینوں گواہ ہمارے ساتھ تھے۔ ایک نے ذرا بلند آواز میں کہا کہ وہ رہا تانگہ، یہی تھا۔ ایک اور گواہ بولا کہ گھوڑا یہ تھا۔

اتنے میں کوٹھی کے عقب سے ہمیں کچھ شور شرابہ سا سنائی دیا۔ ہم ادھر متوجہ ہوئے تو ایک کانسٹیبل دوڑا آیا کہ ایک آدمی کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔ اسے پکڑا تو وہ لڑنے پر اتر آیا ہے اور کانسٹیبلوں کو گالیاں دیتا ہے۔

ہم دونوں انسپکٹر اصطبل سے نکلے تو دیکھا کہ تین کانسٹیبل ایک بڑے ہی خوبرو نوجوان کو گھسیٹتے اور دھکیلتے ہوئے لا رہے تھے۔ چوہدری نے دیکھا تو بولا، چھوڑ دو اسے یہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے بیٹے کا نام پوچھا تو اس نے ارشادالحسن بتایا۔

''ارشاد!''۔۔۔ میں نے اسے بڑے آرام سے کہا۔۔۔ ''انسان کے بچے بنو، تم ہم سے آزاد تو ہو نہیں سکتے۔ اپنے معزز باپ کی بے عزتی نہ کراؤ اور آرام سے ہمارے ساتھ چلے چلو ورنہ ہتھکڑیوں میں باندھ کر گاڑی میں پھینک دیں گے اور لے جائیں گے''۔

اس کا باپ الگ احتجاج اور غصے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ منظر خاصا دلچسپ تھا لیکن میں بات مختصر رکھنے کے لئے یہ بیان نہیں کر رہا۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ ہم نے قانون شہادت کے مطابق ساتھ والی دو کوٹھیوں سے ایک ایک آدمی بلا کر تانگہ اور گھوڑا باقاعدہ برآمد کروائے اور کاغذات تیار کئے۔

اس گھر کی عورتیں بھی باہر آ گئی تھیں۔ انہوں نے الگ شور مچا رکھا تھا اور ارشادالحسن کی ماں اس کے باپ پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھی کہ وہ آئی جی کو فون کیوں نہیں کرتا کہ اس کی پولیس ہم شریف لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ جاگیردار میرے پاس آیا اور بازو سے پکڑ کر الگ لے گیا۔ کہنے لگا کہ آپ میرے ہندوستانی بھائی ہیں، میں آپ کی جھولی سونے اور چاندی سے بھر دوں گا، میری عزت کا کچھ خیال کریں اور میرے بیٹے نے جو کچھ بھی کیا ہے یہ گول

کر دیں۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کا جرم کیا ہے۔

"چوہدری صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آپ نے مجھے ہندوستانی بھائی کہا ہے۔ میں ہندوستانی ضرور ہوں اور آپ کا مسلمان بھائی بھی ہوں لیکن اس وقت میں صرف ہندوستانی مسلمان ہوں اور بھائی کسی کا بھی نہیں۔ میں اس قوم کے قانون کا پابند ہوں جس قوم سے مجھے تنخواہ مل رہی ہے اور جس کا میں نمک کھا رہا ہوں اور یہ مسلمان کے کردار کے منافی ہے کہ میں نمک حرامی کروں"۔

ہم اس کے شہزادے بیٹے کو گاڑی میں ڈال کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ اس شہزادے نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ہم نے اسے ناشتہ پیش کرنا بھی نہیں تھا۔ تانگہ اور گھوڑا بھی ہمارے پیچھے آرہے تھے۔

"دیکھ ارشاد بھائی!"۔۔۔ میں نے اپنے کمرے میں بٹھا کر اسے کہا۔۔۔ "تمہارا باپ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ انگریز کسی کا خون معاف نہیں کیا کرتے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ تم نے دو دوستوں کے ساتھ لطیف نام کے ایک لڑکے کو قتل کیا ہے۔ اس واردات میں تم نے اپنا تانگہ استعمال کیا تھا۔ ہزار کوشش کرو۔ باپ کی دولت لٹا دو تم بچ نہیں سکتے۔ اقبال جرم کر لو پھر ہم تمہیں اچھی خاصی رعایت دلا دیں گے"۔

انسپکٹر اینڈریو نے بھی اسے ایسی ہی باتیں کہیں، کچھ لالچ دیا اور کچھ ڈرایا دھمکایا لیکن اسے اپنے باپ کی جاگیرداری پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ ہماری بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی نشاندہی کر دے لیکن وہ انکار کر رہا تھا۔

ہم نے اسے اپنی حوالات میں بند کر دیا۔ وہ ناشتہ مانگ رہا تھا لیکن ہم اسے سارا دن بھوکا رکھنا چاہتے تھے...... ہم نے سنگیتا کو بلوایا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ آگئی۔ باپ کو الگ بٹھا دیا اور سنگیتا کو تانگہ اور گھوڑا دکھایا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا یہ تانگہ ارشاد کا ہے اور یہی گھوڑا اس تانگے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں سنگیتا کو حوالات کے دروازے پر لے گیا جس میں ارشاد بند تھا۔ قانونی طور پر ملزموں کی شناخت کا طریقہ کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں یہ طریقہ اپنے طور پر اختیار کر رہا تھا تا کہ ارشاد اور سنگیتا کا آمنا سامنا ہو جائے۔ سنگیتا نے ارشاد کو دیکھا تو اسے گالیاں دینی شروع کر دیں اور کہا کہ تم نے لطیف کو قتل کیا ہے اور اب تم پھانسی چڑھو گے۔

سنگیتا کو ہم نے گھر بھیج دیا۔ میں آپ کو رات تقریباً دس بجے کی بات سناتا ہوں۔

رات کو ہم نے ارشاد الحسن کو حوالات سے نکلوا کر تفتیشی کمرے میں بٹھایا اور اسے اقبال جرم پر آمادہ کرنے لگے۔ اس کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ سوائے پانی کے اس کے اندر کچھ نہیں گیا تھا لیکن اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ایک سگریٹ اور وہسکی کے دو پیگ پلا دو پھر وہ رو پڑا۔

غور فرمائیں کہ یہ تھی ایک مسلمان کی اولاد۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دولت اور جاگیر مل گئی تو خدا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں میں افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ پاکستان کی قسمت بھی ایسے ہی جاگیرداروں کی مٹھی میں آگئی...... اس نوجوان ملزم کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ وہ ایک سگریٹ اور دو پیگ شراب کے عوض اپنا ایمان بھی دینے پر تیار ہو گیا لیکن اس کے پاس ایمان تو تھا ہی نہیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ہماری بات مان لے اور اسے نہایت اعلیٰ کھانا کھلائیں گے، سگریٹ بھی دیں گے اور دو پیگ نہیں بلکہ وہسکی کی بوتل اس کے آگے رکھ دیں گے۔

انسپکٹر اینڈریو نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سامنے رکھ لیا پھر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ کہیں سے تھوڑی سی ولایتی شراب لے آئے۔ شراب کوئی نایاب چیز نہیں تھی۔ فون کر کے کہیں سے بھی منگوائی جا سکتی تھی اور منگوالی گئی۔

اب سگریٹ اور شراب کا کرشمہ دیکھیں۔ شراب آنے سے پہلے ہی اشاد الحسن نے سگریٹ پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اینڈریو نے پیکٹ پیچھے کر کے کہا کہ پہلے اقبال جرم!

"ہاں صاحب!"۔۔۔ ارشاد نے کہا۔۔۔ "لطیف کو میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ قتل کیا تھا اور ایک دوست تانگے میں بیٹھا رہا تھا"۔

انسپکٹر اینڈریو نے سگریٹ پیکٹ اور ماچس اس کی طرف سرکا دی۔ ہم نے اس کے لئے کھانا منگوالیا اور ساتھ شراب اور گلاس بھی رکھ دیا۔ کھانے اور شراب پر تو وہ ٹوٹ پڑا اور جوں جوں کھانا اس کے اندر جا رہا تھا اس کی زبان میں روانی آتی جا رہی تھی۔ کچھ شراب بھی اس کے اندر گئی تو وہ یوں بولنے لگا جیسے دوستوں میں بیٹھا کوئی دلچسپ بات سنا رہا ہو۔ مطلب یہ کہ وہ کھانے کے دوران اپنے جرم کی بیک گراؤنڈ اور پھر واردات کا طریقہ سنا رہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ایک مسلمان کا اتنا خوبرو بیٹا اخلاقی تباہی میں جا پڑا تھا۔ یہی ایک نہیں نہ جانے اس جیسے کتنے بیٹے تباہ و برباد ہو رہے تھے۔

میں اس کا پورا اقبال جرم نہیں سنا رہا، یہ تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ قتل کا باعث کیا تھا۔

ارشاد نے بتایا کہ دوست اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ ایک لڑکی اسے دھتکار گئی ہے اور کسی اور کو دوست بنا لیا ہے۔ پھر سنگیتا نے بھی اس کی بے عزتی کر دی تھی۔

ارشاد کو معلوم تھا کہ مقتول ہر صبح اس میدان میں ورزش اور پھر ہاکی کی پریکٹس کے لئے جایا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ وہ اسے صرف مارنا پیٹنا چاہتا تھا لیکن ہاکی سٹک اس کی کنپٹی پر لگی تو اس سے وہ مر گیا۔ ارشاد کا خیال تھا کہ وہ مرا نہیں اور کل صبح اسے نظر آئے گا لیکن اسے ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد پتہ چل گیا کہ لطیف مر گیا ہے۔

اس کے بعد اس نے اپنے دونوں دوستوں کی بھی نشاندہی کر دی اور ان دونوں کو اسی روز گرفتار کر لیا گیا۔

میں نے یہ کہانی بہت مختصر کر کے سنائی ہے اور اتنا ہی کافی سمجھوں گا کہ ارشاد الحسن اور اس کے دوست کو جس نے ارشاد سے مل کر لطیف کو قتل کیا تھا، سزائے موت دی گئی اور جو دوست تانگے میں بیٹھا تھا اسے اعانت جرم میں چار سال سزائے قید بامشقت دی گئی۔ ہائیکورٹ میں اپیل ہوئی تو ہائیکورٹ نے ملزموں کی نوعمری دیکھتے ہوئے سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی اور تیسرے دوست کی سزا برقرار رکھی۔

سنگیتا کورٹ میں پیش ہوئی تھی اور اس نے بڑی دلیری سے ارشاد کے خلاف بیان دیا اور ثابت کر دیا تھا کہ قتل کا باعث کیا تھا۔ سزائے موت دینے والا سیشن جج ایک اینگلو انڈین تھا۔ اس نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ یہ دولت مند جاگیردار اور ان کی اولاد عام آدمی کو اپنی رعایا اور غلام سمجھتے ہیں اور جاگیردار دولت کے نشے میں جہاں ہر طرح کی بداخلاقی اور بدی کا ارتکاب کرتے ہیں وہاں قتل تک بھی کر گزرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔

سب انسپکٹر ہرچرن داس کے خلاف ہم نے تفصیلی رپورٹ لکھی تھی کہ اس نے تفتیش میں اس طرح دانستہ کوتاہی کی تھی۔ اس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی اور اسے سب انسپکٹر سے اے ایس آئی بنا دیا گیا۔ عام فہم زبان میں یوں کہیں کہ اسے بڑا تھانیدار سے چھوٹا تھانیدار بنا دیا گیا۔

+++

مریضہ اور مسیحا

چرن جیت سنگھ اس کے آگے بچھ بچھ جاتا تھا اور کبھی تو وہ ایسی حرکتیں کرتا تھا جیسے وہ اس کا خاوند نہیں بلکہ غلام ہے۔ امرت کور کو ایسا خاوند بہت ہی برا لگتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مرد کا ساتھ چاہتی تھی جس میں مردوں والا رعب، دبدبہ اور خود اعتمادی ہو

قتل کی یہ واردات ان وارداتوں میں سے ہے جنہیں میں نے خاص طور پر ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔ ویسے بھی یہ تفتیش مجھے کبھی کبھی یاد آ جاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ خیال آتا ہے کہ اس کی تفتیش تو میں نے بڑی آسانی سے کر لی تھی۔ میری تفتیشی کہانیاں پڑھنے والے خواتین و حضرات یہ کہانی پڑھیں گے تو شاید وہ بھی یہ سوچیں لیکن میں جب اس کی تفتیش پر غور کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ کسی اور تفتیش میں مجھے اس سے زیادہ دماغ سوزی نہیں کرنی پڑی تھی۔ یہ دماغ کا ہی کھیل تھا۔ میرے ساتھ ایک تو انگریز انسپکٹر پولیس تھا، ایک میجر ملٹری پولیس کا تھا اور ایک میجر انٹیلی جنس کا تھا۔ یہ دونوں میجر بھی انگریز تھے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ میں اپنے دماغ کے زور پر ان سب پر چھا گیا تھا۔ اس تمہید سے میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے ہیرو سمجھیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسان میں فرض شناسی ہو اور کام کرنے کی لگن ہو تو وہ ناممکن کو ممکن کر کے دکھا سکتا ہے۔

یہ دوسری جنگ عظیم کے آخری سال کی واردات ہے۔ ابھی ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ ابھی یہ خطرہ موجود تھا کہ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں نے اپنی بعض کہانیوں میں یہ ذکر کیا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوس اور تخریب کار خاصے زیادہ ہو گئے تھے اور ان کی سرگرمیاں اور کامیابیاں تشویشناک ہو گئی تھیں۔ یہ جاسوس اور تخریب کار جرمنی اور جاپان سے نہیں آئے تھے، یہ سب ہندوستانی تھے جن میں ہر مذہب کا ہندوستانی شامل تھا...... یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر میں بڑے لمبے لمبے مضمون لکھ سکتا ہوں اور ان دیسی جاسوسوں کی چند ایک کہانیاں بھی سنا سکتا ہوں لیکن ابھی یہ واردات اور اس کی تفتیش سناؤں گا جس کا میں نے اس تمہید میں ذکر کیا ہے۔

جاسوسی اور تخریب کاری اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس نے سول انٹیلی جنس کے علاوہ پولیس کا تعاون بھی حاصل کر لیا تھا۔ ایسے کیس سی آئی اے کے پاس آیا

کرتے تھے۔ میں اُس وقت سی آئی اے برانچ میں تھا جب ملٹری والوں نے ہم سے مدد مانگی۔ مجھے اور انگریز انسپکٹر کو حکم ملا کہ ہم ملٹری انٹیلی جنس والوں کے ساتھ لگ جائیں۔ میرے ساتھ جو انگریز آفیسر گیا، اس کا نام انسپکٹر راجرز تھا لیکن میں اسے راجر لکھوں گا کیونکہ ہم اسے اسی طرح بلایا کرتے تھے۔ یہ جاسوسی اور تخریب کاری کا اتنا پھیلا ہوا اور دور دور زمین کے نیچے تک گیا ہوا کیس تھا کہ ہمیں اپنے ہیڈکوارٹر، نئی دلی سے نکل کر دو اور شہروں اور پھر دیہاتی علاقے تک جانا پڑا۔ اس میں شہری تو تھے ہی، انڈین آرمی کے ایک دو افسر بھی شامل تھے لیکن ابھی ان کا سراغ نہیں ملا تھا نہ ان دو ملزموں میں سے کسی نے ان کی نشاندہی کی تھی جنہیں ملٹری انٹیلی جنس نے پکڑا تھا۔

یہ جرمنی کے جاسوسوں کا رنگ تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ جاپان کے ہندوستانی ایجنٹ بھی اس رنگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی تھی کہ اس وقت جاپان بری طرح شکست کھا کر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا لیکن اس کی بری اور بحری فوج جہاں جم جاتی وہاں سے اسے پیچھے ہٹانا بظاہر ناممکن ہو جاتا تھا۔

یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس رنگ کے پروگرام بڑے ہی خطرناک ہیں۔ ان تخریب کاروں نے ہندوستان میں بڑے بڑے ایمونیشن ڈمپ (ذخیرے) اڑانے تھے۔ یہ بھی کام انہیں دیا گیا تھا کہ تیل پٹرول کا جہاں کہیں بھی ذخیرہ نظر آئے، اڑا دو۔ ایک کام یہ تھا کہ انڈین آرمی میں بددلی اور بدامنی پھیلائی جائے اور فوجیوں کے دلوں میں انگریزوں کی نفرت پیدا کی جائے۔ یہ کام تو پہلے ہی ہو رہا تھا، اب اسے تیز کرنا تھا۔

ایک نشاندہی میرٹھ چھاؤنی کی ہوئی تھی۔ ہم میرٹھ چلے گئے اور چھاؤنی میں فوج نے ہماری رہائش کا نہایت اعلیٰ انتظام کر دیا۔ ہمارے ساتھ جو ہیڈ کانسٹیبل اور تین چار کانسٹیبل تھے، انہیں بھی بڑی اچھی اور باعزت رہائش دی گئی۔ ہم تین دن وہاں مصروف رہے۔ ایک ہندو لیفٹیننٹ کو ہم Shadow کر رہے تھے یعنی چوری چھپے اس کا پیچھا اس طرح کر رہے تھے کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے اور عموماً کس وقت جاتا ہے۔ وہ اکثر رات کو ایک کانگرسی لیڈر کے گھر جایا کرتا تھا۔ ہم اسے عین موقع پر پکڑنا چاہتے تھے۔ میں اس تفصیل میں جا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کہ انٹیلی جنس کا طریقہ کار کیا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ فلاں شخص مشتبہ یا ملزم ہے، اسے فوراً پکڑا کیوں نہیں جاتا۔

لاش اور نیند کی دوائی والی شیشی

ایک رات نو بجے ملٹری پولیس کے میجر نے ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا ایک سکھ کیپٹن چرن جیت سنگھ بھنڈاری قتل ہو گیا ہے۔ اسے گولی ماری گئی تھی۔ یہ کیس ملٹری پولیس کا تھا اور اس علاقے کے تھانے کا تھا۔ اس میجر نے ہمیں اس خیال سے اطلاع دی تھی کہ ہو سکتا ہے یہ جاسوسوں کی کارروائی ہو۔ ملٹری پولیس کے اس آفیسر کو یہ خیال ویسے ہی نہیں آ گیا تھا، اس کی ایک وجہ تھی جو یہ تھی کہ کیپٹن چرن جیت سنگ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی انٹیلی جنس برانچ کا آفیسر تھا اور جب سے ہم یہاں آئے تھے، وہ ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اچھا خاصا ذہین آفیسر تھا اور اپنے کام کو خوب سمجھتا تھا۔ بجا طور پر شک کیا جا سکتا تھا کہ اسے جاسوسوں نے گولی ماری ہے۔ وہ کسی یا ایک سے زیادہ جاسوسوں کو جان گیا ہو گا۔

میں اور انسپکٹر راجر اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر بھاگم بھاگ موقعہ واردات پر پہنچے۔ مقتول کو گھر میں گولی ماری گئی تھی۔ یہ گھر شہر میں نہیں بلکہ ہماری رہائش کے قریب ہی چھاؤنی میں آفیسرز فیملی کوارٹر میں تھا۔

یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ مقتول نے رات نو بجے ہمارے پاس آنا تھا اور ہم نے نہ جانے رات کس وقت تک مصروف رہنا تھا لیکن اس سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ کسی دشمن کی گولی کا شکار ہو گیا۔

یہ افسروں کا فیملی کوارٹر تھا جو ایک چھوٹی کوٹھی کی طرح نہایت اچھا تھا۔ اس سے تھوڑا ہی پرے ہٹ کر ایک اور کوارٹر تھا۔ دونوں کے سامنے گھاس کے لان تھے اور ان سے آگے چھوٹی یعنی کم بلند فصیل کی طرح دیوار تھی اور اس میں پھاٹک تھا۔ ہم کیپٹن چرن جیت سنگھ کے کوارٹر میں گئے تو وہاں جو افراد ملے ان میں ایک ہندو میجر تھا جو ساتھ والے کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ مقتول کا سکھ اردلی بھی تھا اور بائیس تیئس سال عمر کی ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی بھی تھی جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ مقتول کی بیوی تھی۔ نام امرت کور تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ لاش بیڈ روم میں پڑی ہے۔

ہم بیڈ روم میں گئے۔ وہاں دو پلنگ ایک دوسرے کے ساتھ بچھے ہوئے تھے۔ ایک

پلنگ اور دیوار کے درمیان لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے لاش کو اچھی طرح اِدھر اُدھر کر کے دیکھا۔ گولی ایک کنپٹی میں لگی تھی اور کھوپڑی کی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس سے یہ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل مقتول کے سامنے اور ذرا ایک طرف کھڑا تھا۔ اپنے تجربے کی بناء پر میں یہ بھی سمجھ گیا کہ گولی قریب سے ماری گئی ہے۔ جسم پر کسی اور چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا۔ میرے ساتھ انسپکٹر راجر نے دیوار دیکھی تو اسے ایک جگہ گولی کا نشانہ نظر آیا۔ وہاں ایک تپائی پڑی تھی۔ انسپکٹر راجر نے تپائی ہٹا کر نیچے دیکھا تو اسے فائر کی ہوئی گولی جو پچک گئی تھی مل گئی۔

ہم وردی نہیں پہنتے تھے، سویلین کپڑے پہنا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کے جو افسر تھے وہ بھی وردی نہیں پہنتے تھے۔ مقتول نے گرم سوٹ یعنی کوٹ اور پتلون پہن رکھا تھا۔ نکٹائی بھی بندھی ہوئی تھی اور اس کے سر پر پگڑی تھی۔ گولی پگڑی میں سے گزری تھی۔ اس کے اس لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہمارے پاس آنے کے لئے تیار تھا۔

لاش کے ایک ہاتھ کے قریب فرش پر درمیانے سائز کی ایک شیشی یعنی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ڈھکنا اترا ہوا تھا اور اس کے اندر جو دوائی تھی وہ فرش پر بہہ گئی تھی اور کچھ دوائی ابھی تک شیشی میں موجود تھی۔ شیشی کھڑی نہیں بلکہ پہلو پر گری ہوئی تھی۔ میں نے شیشی اٹھا لی اور اس پر جو لیبل تھا وہ پڑھنے لگا۔

یہ کوئی نیند کی دوائی تھی۔ یہ میں اس لئے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اس کا نام آج کی نیند کی دوائیوں سے ملتا جلتا تھا۔ مثلاً آج کل گولیوں کی شکل میں نیند کی جو دوائیاں ملتی ہیں ان میں ایک ڈائزی پام ہے اور آکسازی پام بھی ہے اور اسی طرح کچھ اور دوائیاں ہیں۔ اس دوائی کا نام مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا، کوئی پام ہی تھا۔ وہ دوائی گولیوں کی بجائے سیرپ کی صورت میں تھی۔ انسپکٹر راجر نے شیشی میرے ہاتھ سے لے کر لیبل پڑھا تو اس نے بھی کہا کہ یہ نیند کی دوائی ہے۔ راجر نے ہی دیکھا کہ شیشی کا ڈھکنا تپائی پر پڑا ہوا تھا۔ شیشی میں چند ایک چمچ دوائی رہ گئی تھی۔ راجر نے ڈھکنا شیشی پر چڑھا دیا اور شیشی بھی قبضے میں لے لی۔

لاش کی دوسری طرف ایک بڑا چمچ پڑا تھا جسے ٹیبل سپون کہتے ہیں۔ کھلی ہوئی شیشی اور اس چمچ سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول یہ دوائی پینے لگا تھا یا پی چکا تھا لیکن مجھے یہ خیال آیا

کہ مقتول کو ہمارے پاس آنا تھا اور یہ ایک میٹنگ تھی جس میں ہم سب کو اپنے دماغ پوری طرح بیدار رکھنے تھے، تو کیا مقتول نیند کی دوائی پی کر ہمارے پاس سونے کے لئے آرہا تھا؟

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانا تھا۔ میں لاش سے ہٹا اور پلنگ کی دوسری طرف پہنچا تو ساتھ والے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اور انسپکٹر راجر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجر نے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا تو میں اس کمرے میں ٹیلیفون سننے چلا گیا۔ ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو میں نے دانستہ ہیلو نہ کہا کہ فون کرنے والا بولے۔ تین چار سیکنڈ بعد کسی آدمی کی مدھم سی آواز آئی ـــــ ''امر!'' ـــــ یہ لہجہ رازداری والا تھا۔ میں نے کہا ـــــ ''ہولڈ کریں، میں بات کرواتا ہوں'' ـــــ لیکن فون کرنے والے نے میری بات نہ سنی، صرف اتنا سن کر، ہولڈ کریں، اس نے فون بند کر دیا۔ یہ فون مقتول کی بیوی کے لئے تھا۔ اس کا نام امرت کور تھا اور اس آدمی نے اسے امر کہا تھا۔ یہ کوئی امرت کور کا بے تکلف دوست تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مسز چرن جیت کہتا یا ذرا احترام سے اس کا پورا نام لیتا۔

یہ فون کہیں باہر سے یعنی شہر سے نہیں آیا تھا۔ چھاؤنی کا اپنا الگ ایکسچینج تھا۔ زیرو ڈائل کرتے تو آپریٹر بولتا تھا اور اسے کہتے تھے کہ فلاں نمبر ملا دے۔ یہ ایکسچینج شہر کے ایکسچینج کی طرح مصروف نہیں ہوتا تھا۔ میں نے فون بند کر کے پھر ریسیور اٹھایا اور زیرو ڈائل کیا۔ آپریٹر بولا تو میں نے اپنا تعارف کرا کے پوچھا کہ ابھی ابھی کیپٹن چرن جیت سنگھ کے گھر کس کا فون آیا تھا۔ اس نے فوراً بتا دیا کہ میڈیکل آفیسر کیپٹن سخاوت علی خان نے یہ نمبر مانگا تھا۔

میں نے انسپکٹر راجر کو الگ کر کے فون کے متعلق بتایا اور ہم نے اس میڈیکل آفیسر کا نام ذہن میں محفوظ کر لیا۔ راجر نے کہا کہ میڈیکل آفیسر کو یہاں ہونا چاہئے تھا، وہ ابھی تک آیا نہیں۔ میرے دماغ میں ایک بات آ گئی۔ میں نے راجر سے کہا کہ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو۔ مجھے کچھ شبہ ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ امر کا خاوند قتل ہو گیا ہے۔ اسے یہ پتہ ہو گا کیپٹن چرن جیت سنگھ آج رات نو بجے انٹیلی جنس ڈیوٹی پر جا رہا ہے اور یہ ایک لمبی میٹنگ ہو گی۔ میڈیکل آفیسر یہ معلوم کرنا چاہتا ہو گا کہ چرن جیت سنگھ چلا گیا ہے یا ابھی نہیں۔ میڈیکل آفیسر نے امرت کور کے ہاں آنا ہو گا یا اسے کہیں بلانا ہو گا۔

قاتل جن بھوت نہیں تھا

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی اور یہ بات میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ مقتول کی عمر اگر 35 سال نہیں تھی تو ایک دو سال ہی کم ہو گی۔ امرت کور کی عمر بائیس تئیس سال تھی۔ مقتول نہایت معمولی سی شکل وصورت والا آدمی تھا اور اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ویسے بھی وہ سکھ تھا اور اس کا چہرہ داڑھی سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کی یہ بیوی بہت ہی خوبصورت تھی۔ میں اس کی خوبصورتی میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا وہ واقعی بڑی خوبصورت اور بے پناہ کشش والی لڑکی تھی۔ اگر وہ اس خاوند کو پسند کرتی تھی تو اس کی ایک وجہ مجبوری ہی ہو سکتی تھی یا اسے ڈرا دھمکا کر رکھا جاتا تھا۔

انسپکٹر راجر نے ملٹری پولیس کے میجر سے کہا کہ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے سی ایم ایچ بھجوا دے۔ میجر نے اسی وقت فون کیا اور میڈیکل آفیسر کو بلایا۔ یہ میڈیکل آفیسر صرف بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے افسروں اور دیگر نفری کے لئے تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی تھی کہ لاش سی ایم ایچ میں لے جائے۔

میں نے مقتول کی بیوی سے پہلی بات یہ پوچھی کہ یہ دوائی مقتول خود پیا کرتا تھا؟

''نہیں!'' ـــــ امرت کور نے جواب دیا لیکن یک لخت جھجک سی گئی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں...... ہاں جی...... وہ خود پیتا...... اور کبھی کبھی پیا کرتا تھا''۔

''کیا آج رات نو بجے اس نے ڈیوٹی پر نہیں جانا تھا؟'' ـــــ میں نے پوچھا اور اس کا جواب سنے بغیر کہا ـــــ ''یہ بڑی اہم میٹنگ پر جا رہا تھا۔ اس نے اسی لئے یہ کپڑے پہنے تھے اور یہ تیار ہو کر جا رہا تھا۔ میں کس طرح تسلیم کر لوں کہ یہ نیند کی دوائی لے کر ڈیوٹی پر جا رہا تھا!''

''میں اسے منع کر رہی تھی'' ـــــ امرت کور نے ہکلاتی ہوئی زبان میں رک رک کر کہا ـــــ ''مجھے کہتا تھا تم بھی پی لو، نیند بڑی ٹھیک آئے گی...... وہ خود پینے لگا تھا''۔

اس لڑکی کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس عمر میں ہاتھ نہیں کانپا کرتے۔ اس کے تو ہاتھ صاف طور پر کانپتے نظر آرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اندر سے بھی بری طرح کانپ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے خاوند کو گولی کس نے ماری ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ باتھ روم میں تھی جب اس نے گولی کی آواز سنی۔ وہ بڑی تیزی سے

باہر نکلی، ڈرائنگ روم میں دیکھا اور پھر بیڈ روم میں آئی تو اس کا خاوند فرش پر پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ اسے کچھ پتہ نہیں وہ کون تھا۔

''کیا اس وقت یہ زندہ تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''میں نے یہ نہیں دیکھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے صرف یہ دیکھا کہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں اتنی ڈری اور گھبرائی کہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور میجر ورما کو جا کر بتایا کہ میرے گھر آ کر دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ میجر ورما یہیں ہیں۔ انہوں نے آ کر دیکھا اور بتایا کہ یہ تو مر گیا ہے۔ میجر ورما نے ہی جہاں جہاں فون کرنے تھے کئے''۔

میں نے اس کی یہ بات اس طرح لکھی ہے جیسے وہ روانی سے بولی ہو گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ صرف رک رک کر ہی نہیں بولتی تھی بلکہ دوسرے یا تیسرے لفظ پر اٹک جاتی اور ایک دو الفاظ منہ سے نکال کر ان کی تردید کر دیتی اور کچھ اور کہتی اور اس نے بری طرح ہکلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

انسپکٹر راجر پاس کھڑا سن رہا تھا، وہ میرے سوالوں سے شاید اتنا مطمئن تھا کہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا...... میں نے دماغ کو اتنا زیادہ حاضر اور مرکوز رکھا ہوا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکنے لگا۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ یہ کہہ رہی ہے کہ باتھ روم میں تھی جب گولی چلی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مقتول دوائی پینے لگا تھا اور اس نے اسے دوائی پینے سے روکا تھا اور یہ بھی اس لڑکی نے کہا کہ مقتول نے اسے کہا تھا کہ وہ یہ دوائی پی لے...... اس کا مطلب یہ تھا کہ جب مقتول دوائی ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اس وقت گولی چلی، وہ گرا اور شیشی الٹ گئی لیکن اس کی بیوی کہہ رہی تھی کہ وہ باتھ روم میں تھی۔

امرت کور نے اپنے خلاف اچھا خاصا شک پیدا کر دیا تھا۔ جس عورت کا خاوند اس طرح مارا جائے، اسے صدمے سے اس سے بھی زیادہ بری حالت میں ہونا چاہئے لیکن یہ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ وہ صدمہ کسی اور طرح ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اس لڑکی کی حالت کچھ اور ہی ہو رہی تھی۔

اتنے میں ایک باوردی کیپٹن کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا میڈیکل آفیسر کیپٹن سخاوت علی خان تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ میں نے اسے پولیس والوں کی خاص نظر سے اور خاصا غور سے دیکھا۔ اس کا قد بت نہایت اچھا تھا، رنگ گورا اور خوبرو جوان تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیوٹ کیا۔ وہاں سب افسر رینک

میں اس سے سینئر تھے۔ اسے دیکھ کر میں نے فوراً امرت کور کو دیکھا اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کے چہرے پر تبدیلی سی آئی تھی یا یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔

ملٹری پولیس کے آفیسر نے اسے کہا کہ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانے کا بندوبست کرے۔ میں اور انسپکٹر راجر ڈرائنگ روم میں گئے۔ ابھی امرت کور ہمارے ساتھ تھی۔ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار دو دو قسم کی باتیں کرتی تھی۔ اسے ہم نے ایک اور کمرے میں بٹھا دیا اور اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو ہدایات دے کر دروازے میں کھڑا کر دیا۔ مقتول کے اردلی کو بلایا۔

اردلی آ گیا۔ وہ سکھ تھا اور جوانی کی عمر میں تھا۔ وہ سویلین نہیں بلکہ فوج کا سپاہی تھا۔ اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ وہ گولی چلتے وقت کہاں تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ اردلی ہر وقت گھر میں موجود رہتا ہے۔ اس کوارٹر کے پیچھے ایک کمرہ تھا جس میں اردلی رہتا تھا۔

اس نے بتایا کہ آٹھ سوا آٹھ بجے اس نے مقتول اور امرت کور کو کھانا کھلایا تھا اور پھر برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا، برتن دھوئے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مقتول سے جانے کی اجازت لی تھی۔ مقتول نے اسے کہا تھا کہ میں باہر جا رہا ہوں اور پیچھے ٹھیک طرح خیال رکھنا، بالکل ہی سو نہ جانا۔

پھر اردلی نے بتایا کہ اس نے خود کھانا کھایا اور ذرا سا لیٹا ہی تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ وہ چونکا تو ضرور لیکن اسے ایسا شک نہیں ہوا کہ کسی نے کسی کو گولی مار دی ہو گی۔ پھر بھی وہ باہر نکلا۔ اس کا کمرہ پیچھے کی طرف تھا۔ گھر کے اندر خاموشی تھی۔ اگر اس گولی سے کوئی مارا گیا ہوتا تو اندر شور شرابہ یا کوئی ہلچل ضرور ہوتی جو نہیں تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کے باہر والے دروازے تک گیا اور آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا کہ دروازہ اندر سے بند تھا یا نہیں۔ اس نے بتایا کہ اندر سے بند نہیں تھا اور ایک کواڑ دو تین انچ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر دیکھا تو اسے امرت کور کی پیٹھ نظر آئی۔ وہ فون سن رہی تھی یا کر رہی تھی۔ اس سے اردلی کو تسلی ہو گئی کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ چونکہ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اس لئے امرت کور جب فون سے فارغ ہوئی تو دروازے کی طرف مڑی۔ اردلی نے دروازہ کھولا، اس وقت امرت کور تیزی سے دروازے کی طرف دوڑی اور یہ کہتی ہوئی میجر ورما کے گھر چلی گئی کہ کیپٹن صاحب کو کوئی گولی مار گیا ہے۔

اردلی نے مزید بتایا کہ یہ الفاظ سن کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ چرن جیت کہاں ہے۔

وہ اس کمرے میں نہیں تھا۔ اردلی بیڈروم میں چلا گیا اور وہاں اس نے چرن جیت سنگھ کو فرش پر پڑے دیکھا۔ اتنے میں میجر ورما اور اس کی بیوی دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے بھی مقتول کو دیکھا۔ میجر ورما نے لاش کے پاس بیٹھ کر نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ یہ تو ختم ہو چکا ہے۔

''تم فوجی جوان ہو'' ـــ میں نے اردلی سے کہا ـــ ''یہ بتاؤ کہ باہر کا کوئی آدمی آ کر تمہارے کپتان صاحب کو بیڈروم میں گولی مار جاتا تو کیا تم اس کو بھاگتا دیکھ نہیں سکتے تھے؟...... تم یہ سوچ کر جواب دو کہ تم اپنے کمرے میں سے کتنی دیر میں ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچے تھے؟''

میں اس سے اتنی باریک ذہانت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ ایک تو وہ سکھ تھا دوسرے ان پڑھ تھا اور تیسرے یہ کہ فوجی تھا۔ اس وقت کے فوجیوں کو لوگ بڑی بے تکلفی سے ''فوجی بے وقوف'' کہا کرتے تھے۔ میں اور راجر اٹھے اور اسے اس کے کمرے میں لے گئے۔ اسے سوچنے میں، میں نے بہت مدد دی۔ اسے کہا کہ جب گولی چلی تھی تو وہ جس طرح اٹھا اور باہر نکلا تھا اس طرح اتنا ہی وقت لگا کر اٹھے اور باہر نکلے...... اس نے ہمیں وہ ایکشن ری پلے کر کے دکھایا تو مجھے ایک خاص بات نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر اس کوارٹر کے پہلو میں آیا تو وہاں سے کوارٹر کے سامنے سارا علاقہ اچھی طرح نظر آتا تھا اور وہاں سڑک کی روشنی بھی تھی۔ اگر کوئی مار کر بھاگتا تو وہ بیڈروم سے ڈرائنگ روم میں جاتا وہاں سے نکل کر بھاگتا تو اتنا وقت لگتا کہ اردلی اسے کوارٹر کے برآمدے میں ہی دیکھ لیتا۔

''میری بات سنیں صاحب!'' ـــ اردلی نے ٹھیٹھ پنجابی میں کہا ـــ ''باہر کا کوئی آدمی اتنی جلدی گولی چلا کر اور ایک بندہ مار کر بھاگ نہیں سکتا یا غائب نہیں ہو سکتا۔ کوارٹر سے سڑک تک علاقہ خالی ہے۔ بھاگتا تو مجھ کو نظر آ جاتا''۔

فون پر راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی

انسپکٹر راجر ابھی اردلی سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے گھر کے اندر کی اور میاں بیوی کے آپس کے سلوک کی باتیں بھی پوچھ لی جائیں لیکن میں نے اسے کہا کہ ابھی یہیں تک رہنے دو، اسے پھر بلائیں گے۔ ہم آپس میں جب کوئی بات کرتے تھے تو وہ انگریزی زبان میں کرتے تھے۔ اردلی سے میں نے کہا کہ وہ برآمدے میں

موجود رہے کہیں جائے نہیں۔

اس کے جانے کے بعد مجھے خودکشی کا بھی خیال آیا اور یہی شک انسپکٹر راجر نے بھی کیا لیکن ہم دونوں نے آپس میں تبادلہ خیال اور تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہوتی تو امرت کور فوراً کہتی کہ اس نے اپنے سر میں خود گولی ماری ہے۔ اس لڑکی نے خودکشی کا اشارہ تک نہیں دیا تھا۔

میں نے امرت کور کو پھر بلایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ میں نے اسے نارمل حالت میں لانے کے لئے اور اس کا دل پرچانے کے لئے بہت سی باتیں کیں اور اسے یہ تاثر دیا کہ اتنا بھی نہ گھبرائے کہ دماغ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ میں نے کہا کہ ہمیں وہ اپنا دشمن نہ سمجھے۔ اس طرح کچھ شفقت کی اور کچھ پیار کی باتیں کرتے کرتے میں نے پوچھا کہ اس نے فوراً اردلی کو کیوں نہیں بلایا یا اس کا اردلی گولی کا دھماکہ سن کر فوراً کیوں نہیں آیا؟

''مجھے اردلی کا خیال ہی نہیں آیا'' ـــ اس نے کہا ـــ ''وہ گھر کے کام سے چھٹی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کمرے میں تھا یا ذرا باہر نکل گیا تھا''۔

''کیا وہ فوراً نہیں پہنچ گیا تھا؟'' ـــ میں نے پوچھا اور اسے دھوکے میں رکھنے کے لئے کہا ـــ ''بڑا نکما اور غیر ذمہ دار اردلی ہے۔ اسے تو فوراً پہنچنا چاہئے تھا۔ اس کی رپورٹ کر کے اسے اس کوتاہی کی سزا دلوانا''۔

میری اس بات سے یہ نوعمر لڑکی اس دھوکے میں آ گئی کہ اردلی نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ ایک دو اور باتیں کہہ سن کر میں نے اس طرح پوچھا جیسے میرے اس سوال کی کوئی اہمیت نہ اور ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ ایسی بات ایک خاص لہجے میں پوچھی جاتی ہے جو صرف پولیس والے ہی جانتے ہیں۔

''اس وقت فون کس کا آیا تھا؟'' ـــ میں نے پوچھا ـــ ''یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کسی نے اپنا آپ ظاہر کئے بغیر فون پر کوئی دھمکی تو نہیں دی تھی؟ اکثر ہوتا ہے کہ اس طرح قاتل وار کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر مقتول کے گھر والوں کو دھمکیاں دیتے ہیں کہ انہوں نے کوئی قانونی کارروائی کی کوشش کی تو اس گھر کے ایک دو اور بندوں کو قتل کر دیا جائے گا''۔

''فون!'' ـــ امرت کور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ـــ ''فون تو شاید نہیں

آیا...... شاید آیا تھا...... کچھ ہوش نہیں تھا''۔

''تم میجر ورما کے گھر کو دوڑ پڑی تھیں''___ میں نے کہا اور پوچھا___ ''کیا اس وقت بھی اردلی نظر نہیں آیا؟''

''نہیں!''___ اس نے جواب دیا___ ''شاید آیا تھا...... یاد نہیں......''

یہ لڑکی تو بہت ہی نادان تھی۔ اس کی عقل میں باریکی اور گہرائی بالکل ہی نہیں تھی۔ کبھی سوچتا ہوں شاید میرا دماغ تیز ہو گیا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف لگتی تھی، بہرحال میرے ذہن سے یہ شک نکل گیا کہ یہ خودکشی کی واردات ہو سکتی ہے اور یہ شک بھی تقریباً صاف ہو گیا کہ باہر کے کسی آدمی نے آکر یہ واردات کی اور جنوں کی طرح غائب ہو گیا۔ مجھے اردلی بھی مشتبہ نظر آنے لگا۔ امرت کور کو پھر دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور میں انسپکٹر راجر کو بتانے لگا کہ میرے شکوک کیا ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ واردات اگر دشمن کے جاسوسوں کی ہے تو اس میں مقتول کی بیوی بھی شامل ہے اور اردلی بھی۔ میں نے راجر کو بتایا کہ اردلی بھی مشکوک ہے اور میں نے کہا کہ قاتل اس گھر میں موجود ہے۔

میں نے دوسرے شک کا اظہار اس طرح کیا کہ مقتول کی بیوی نے اپنے اردلی کے ساتھ ناجائز مراسم بنا لئے ہوں گے اور مقتول کو پتہ چل گیا ہو گا اور یہ باعث بنا اس کے قتل کا۔ انسپکٹر راجر نے میرے اس شک کی تائید کی۔ وہ ہندوستانیوں کی نفسیات سے بڑی اچھی طرح واقف تھا اور سکھوں کے معاشرتی حالات ان کی عادات اور دیگر باتوں کو بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔

میں نے ٹیلیفون اٹھایا اور زیرو ڈائل کیا۔ آپریٹر بولا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اسے معلوم ہے یا نہیں کہ کیپٹن چرن جیت سنگھ قتل ہو گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میجر ورما صاحب نے تین چار افسروں کو فون کیا تھا تو اسے پتہ چل گیا تھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ میجر ورما کے فون کرنے سے پہلے کیپٹن چرن جیت کے گھر کے لئے کسی کا فون آیا تھا یا یہاں سے کسی نے فون کیا تھا؟

آپریٹر نے ذرا دیر سوچ کر اور یاد کر کے پُراعتماد لہجے میں بتایا کہ اس وقت کیپٹن چرن جیت سنگھ کی بیوی نے میڈیکل آفیسر سخاوت علی خان کے گھر کا نمبر مانگا تھا...... میں نے اس سے پوچھا کہ اس میڈیکل آفیسر کے گھر میں اور بھی کوئی ہو گا، بیوی یا کوئی بچہ۔

آپریٹر نے بتایا کہ میڈیکل آفیسر صاحب اکیلے رہتے ہیں اور وہ سنگل رہائش کا کمرہ ہے۔

میں نے اسے کہا کہ وہ سوچ کر میرے ہر سوال کا جواب بالکل صحیح دے کیونکہ ہو سکتا ہے اسے کورٹ میں گواہی دینی پڑے۔ میں نے اس کا نام لکھ لیا۔ وہ نائیک تھا۔ اس نے کہا کہ لوگ یعنی فوجی ایک دوسرے کے نمبر اس سے ملوا کر باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن اسے افسروں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کسی افسر کی بیوی کہیں فون کرے تو وہ اور زیادہ محتاط ہو جاتا ہے...... میں اس کی یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ دوسرے فوجیوں کی نسبت افسر بہت ہی تھوڑے تھے۔ انہیں وہ نہیں بھول سکتا تھا۔

میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کیپٹن چرن جیت سنگھ کی بیوی کیا اکثر کیپٹن سخاوت علی خان کے ساتھ فون پر بات کرتی رہتی ہے؟

''کم از کم آدھا گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ!''___ آپریٹر نے بلا جھجک جواب دیا___ ''دوسرے تیسرے دن ان کی بات ہوتی ہے اور بڑی دیر فون انگیج رکھتے ہیں''۔

''کیا تم نے کبھی ان کی باتیں سنی ہیں''___ میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب!''___ اس نے جواب دیا___ ''یہ سول کا ایکسچینج نہیں۔

اگر میں دوسروں کی اور خاص کر افسروں کی باتیں سنتے پکڑا جاؤں تو سیدھا کورٹ مارشل ہو گا''۔

آپریٹر کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ میں نے انسپکٹر راجر کو سنائیں۔ ایک بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ امرت کور کی دوستی کیپٹن ڈاکٹر سخاوت علی خان کے ساتھ تھی۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ گولی چلنے کے فوراً بعد امرت کور نے کیپٹن سخاوت علی کے ساتھ کیا بات کی تھی۔ کیا اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ کیپٹن چرن جیت سنگھ کا کام تمام کر دیا گیا ہے؟...... میں اور راجر اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کرنے لگے۔

انسپکٹر راجر نے بڑی اچھی بات کہی۔ اس نے کہا کہ امرت کور نے اگر کیپٹن سخاوت کو یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے خاوند کو کوئی گولی مار کر بھاگ گیا ہے تو کیپٹن سخاوت دوڑتا پہنچتا اور وہ اس صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا لیکن وہ آیا بھی تو اس حکم پر آیا کہ لاش پوسٹمارٹم کے لے کے جاؤ۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ کیپٹن سخاوت اس خبر کے انتظار میں تھا۔

یہ شک تو امرت کور نے اپنے خلاف پکا کر دیا تھا۔ یہ اس طرح کہ اس نے میرے پوچھنے پر جواب دیا تھا کہ اسے یاد نہیں کہ کس کا فون آیا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ اس نے کسی کو فون کیا تھا۔

امرت کور اور ریوالور

ابھی ہم نے میجر ورما اور اس کی بیوی سے بھی پوچھ گچھ کرنی تھی لیکن ہم دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات آ گئی کہ ہم بیڈ روم میں چلے گئے۔ غالباً بستر دیکھنا تھا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ کیا اس پر کوئی لیٹا تھا یا نہیں۔ بہر حال کسی خاص مقصد کے لئے ہم دونوں بیڈ روم میں گئے تو میں بیڈ کو دیکھنے لگا۔ پلنگ پوش پر ابھی کوئی نہیں لیٹا تھا۔ ذرا سی بھی سلوٹ نہیں تھی۔

میں کچھ اور دیکھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ انسپکٹر راجر نے میرا نام لے کر بلایا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک بیلٹ تھی جس کے ساتھ پستول یا ریوالور رکھنے کا ہولسٹر لگا ہوتا ہے اور اس میں گولیاں رکھنے کے لئے چمڑے کے خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ نے ایسی بیلٹ آج کل اکثر دیکھی ہو گی۔ یہ کمر کے ساتھ بھی باندھی جا سکتی ہے اور کندھے کے ساتھ لٹکائی بھی جاتی ہے۔ اکثر لوگ کندھے کے ساتھ لٹکا کر رکھتے ہیں۔

یہ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ مقتول کو میں نے دو تین بار یہ بیلٹ کندھے میں ڈالے دیکھا تھا۔ شام کے بعد جب وہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا تو یہ بیلٹ اس کے ساتھ ضرور ہوتی تھی۔ ہم اپنے ریوالور اپنے کپڑوں کے اندر رکھتے تھے لیکن مقتول یہ بیلٹ باہر رکھتا تھا۔

انسپکٹر راجر نے بتایا کہ اسے یہ بیلٹ ڈریسنگ ٹیبل کے پیچھے پڑی ملی ہے۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور نہیں تھا۔ گولی والے خانے میں بارہ گولیاں پڑی ہوئی تھیں اور چھ خانے خالی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چھ گولیاں ریوالور کے سلنڈر میں تھیں لیکن ریوالور کہاں تھا؟

انسپکٹر راجر نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی؟ یہ تو پہلا کام تھا جو ہم لوگ لاش کو دیکھ کر کیا کرتے تھے یعنی جامہ تلاشی۔ میں نے راجر کو بتایا کہ میں نے جامہ تلاشی لی تھی اور کسی جیب میں ریوالور نہیں تھا۔

پہلے ہمیں یہ بیلٹ نظر ہی نہیں آئی تھی۔ یہ تو ویسے ہی کمرے میں ٹہلتے ہوئے راجر کو نظر آ گئی تھی۔ پلنگوں سے ذرا ہٹ کر ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل رکھا ہوا تھا۔ یہ ٹیبل عام میز جتنا اونچا نہیں تھا بلکہ نصف اونچائی تھی۔ اس کے سامنے کرسی سے کم اونچائی والا اسٹول رکھا تھا۔ آئینہ قد آدم تھا اور میز کے دائیں اور بائیں درازیں تھیں جو نیچے فرش تک چلی گئی تھیں۔ پچھلی طرف نیچے ایک اور تختہ لگا ہوا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ بیلٹ اس تختے اور دیوار کے درمیان گری پڑی تھی اور نظر نہ آئی۔

میں نے بیلٹ اور ہولسٹر کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اسے پالش کیا گیا ہے۔ میں نے بیلٹ ناک سے لگائی تو بوٹوں والی پالش کی بڑی صاف بو آئی۔ مجھے کچھ خوشی ہوئی کہ تازہ پالش پر انگلیوں کے نشان بڑے صاف ہوں گے۔ ہم دونوں نے بیلٹ کو اس طرح پکڑا تھا کہ پالش کی ہوئی سائیڈ پر اور خصوصاً ہولسٹر پر ہماری انگلیاں نہ لگیں۔

میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ دوڑ کر جائے اور بکس اٹھا لائے۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا...... یہ ایک بکس تھا جو تفتیش میں ہر تفتیشی افسر کے ساتھ جاتا تھا۔ ہم چونکہ انٹیلی جنس کے سلسلے میں تفتیش کرنے نکلے تھے اس لئے ہمارے بکس میں کچھ زیادہ ہی سامان تھا۔ اس میں ایک تو آتشی شیشہ تھا جس سے چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہے۔ انگلیوں کے نشان محفوظ اور واضح کرنے کا سامان بھی تھا۔ یہ ایک خاص کاغذ اور پاؤڈر وغیرہ ہوتا ہے۔

امرت کور کو بلایا اور بیلٹ اسے دکھا کر پوچھا کہ اس کے خاوند کا ریوالور کہاں ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس میں چھ گولیاں لوڈ ہوں گی لیکن اب پانچ ہوں گی۔

''ریوالور؟''___ امرت کور نے اکھڑی اور ڈری ہوئی آواز میں کہا___ ''کہاں ہے؟...... ہاں...... ہونا تو چاہئے تھا...... کہاں ہے...... معلوم نہیں''۔

اب تو امرت کور کی حالت تشویش ناک ہو گئی تھی اور میں یہ خدشہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ لڑکی غش کھا کر گر پڑے گی یا اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

اسے پھر اسی کمرے میں بھیج دیا گیا اور ایک کانسٹیبل کو دروازے میں کھڑا کر دیا۔ پہلے یہ ڈیوٹی ہیڈ کانسٹیبل دے رہا تھا اور اب وہ بکس لانے چلا گیا تھا۔ میں نے اردلی کو بلایا اور بیلٹ اسے دکھا کر پوچھا کہ یہ کہاں رکھی تھی اور اسے کس وقت پالش کیا گیا تھا۔

اس نے بتایا کہ مقتول نے اسے خاص طور پر کہا تھا کہ بیلٹ کو پالش سے چمکا دینا

کیونکہ وہ خاص میٹنگ پر جا رہا تھا۔ اردلی نے بیلٹ اور ہولسٹر کو حکم کے مطابق خوب چمکایا تھا اور یہ کام اس نے سورج غروب ہونے کے وقت کیا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ بیلٹ مقتول نے دیکھی تھی اور اس کی یعنی اردلی کی موجودگی میں ریوالور کے سلنڈر میں چھ گولیاں ڈالی تھیں اور ریوالور ہولسٹر میں ڈال کر بیلٹ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے ایک کونے کے ساتھ لٹکا دی تھی۔ اردلی نے ہمیں آئینے کے اس کونے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ بیلٹ یہاں لٹکائی گئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کا یہ آئینہ کم و بیش سوا گز لمبا تھا اور اڑھائی یا تین فٹ چوڑا تھا۔ اردلی نے یہ بھی بتایا کہ مقتول جب بھی یہ بیلٹ ساتھ لے کر نکلنا چاہتا تو تیار ہوتے وقت بیلٹ یہیں لٹکا دیا کرتا تھا۔

اردلی کو ہم نے برآمدے میں بھیج دیا اور میں انسپکٹر راجر کو ساتھ لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں امرت کور بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیاں باری باری اپنی ناک سے لگائیں تو ان سے مجھے پالش کی بو آئی۔ راجر نے بھی اس کی ہتھیلیاں سونگھیں تو میری طرف دیکھ کر اس نے تائید میں سر ہلایا۔ مطلب یہ کہ اسے بھی پالش کی بو آئی تھی۔

میں ایک بات ذرا واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے امرت کور کے ہاتھ سونگھے اور بو محسوس کی تھی اس طرح کوئی عام آدمی بو محسوس نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے بڑے تجربے کی اور بڑی حساس ناک کی ضرورت ہوتی ہے۔ بو کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس طرح پیاز کی یا کسی اور بدبودار چیز کی بو کچھ دور سے ہی محسوس ہو جاتی ہے۔ سونگھنے کی حس اگر تیز ہوتی ہے تو وہ جانوروں کی ہوتی ہے یا بوگیر کتوں کی ناک بہت ہی حساس ہوتی ہے۔ پولیس میں ایسے آدمی بھی تھے جو بوگیر کتوں کی طرح سونگھ لینے کی مہارت رکھتے تھے۔ میری یہ حس اس لئے زیادہ تیز تھی کہ میں سگریٹ اور حقہ نہیں پیتا تھا اور اپنی صحت کو آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ انسپکٹر راجر نے میری طرح بو سونگھنے کی خاص پریکٹس کی ہوئی تھی۔

میں نے اب زیادہ انتظار نہ کیا۔ انسپکٹر راجر سے مشورہ بھی نہ کیا۔ اپنے آپ اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ اس لڑکی کو مزید ڈھیل نہ دی جائے۔

''امرت کور!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ریوالور جہاں چھپا کر رکھا ہے، وہاں سے نکال کر میرے حوالے کر دو''۔

''ریوالوارا''۔۔۔ امرت کور آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔۔۔ ''وہ تو...... ریوالور...... وہ شاید ساتھ لے گیا ہے...... ریوالور!''۔۔۔ وہ پوری طرح اٹھی نہیں تھی کہ پھر اس طرح بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہو۔

اب تو مجھے یہ ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ایک ڈاکٹر بلانا پڑے گا جو اس لڑکی کو کوئی دوائی پلا دے یا کوئی ایسا انجکشن دے دے کہ یہ بے ہوش نہ ہو جائے اور اس کا دل مضبوط ہو جائے۔ اس کا رنگ لاش جیسا ہو گیا تھا، ہونٹ خشک اور آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ یہ علامات اچھی نہیں ہوتیں۔

راجر نے مسکراتے ہوئے مجھے انگریزی زبان میں کہا کہ اب اس سے جرم کا اقبال کروانا اور ریوالور برآمد کروانا تمہارا کام ہے۔ ایسے لوگوں کو تم ہی اچھی طرح سمجھتے ہو...... حقیقت یہ تھی کہ انسپکٹر راجر ہندوستانیوں کو مجھ سے بھی زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے جب انگریزی میں بات کی تو امرت کور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ انگریزی سمجھتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ اس نے بارہ جماعتیں پڑھی تھیں۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا''۔۔۔ امرت کور نے مجھے کہا۔۔۔ ''آپ کا صاحب مجھ سے کس جرم کا اقبال کروانا چاہتا ہے؟''

امرت کور کی گھبراہٹ اور ہکلاہٹ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی اور اس نے یہ بات التجا کے لہجے میں کہی تھی۔

''مت ڈرو امرت کور!''۔۔۔ میں نے دوستوں جیسی بے تکلفی سے کہا۔۔۔ ''ہم اصل بات تک پہنچ گئے ہیں۔ اس صاحب سے مت ڈرو۔ میں یہاں موجود ہوں اور تمہیں بچا کر رکھوں گا...... تم اتنا کرو کہ ریوالور مجھے دے دو''۔

اس نے پھر بھی انکار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بہت ہی دلیر لڑکی تھی بلکہ اصل یہ بات تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اقبالی ہو گئی تو کس انجام کو پہنچے گی۔ میں نے اسے کہا کہ اس کے خلاف ہمیں بڑے پکے ثبوت مل گئے ہیں اور وہ گرفتاری سے بچ نہیں سکتی اور اگر اس نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم اسے بچانے کی کوشش کریں گے ورنہ اسے بہت برے انجام تک پہنچایا جائے گا...... کم از کم عمر قید۔

اس کا سر ڈولنے لگا اور اب تو اس کے بے ہوش ہو جانے میں کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی۔ اگر وہ بے گناہ ہوتی تو چیختی چلاتی ہمارے منہ نوچ لیتی۔ میں نے اسے شفقت سے تسلیاں

دیں اور کہا کہ میں اس کی مدد کے لئے تیار ہوں اور اسے سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔ وہ آرام اور اطمینان سے سوچ لے اور پھر میرے ساتھ بات کرے لیکن یہ بھی سوچ لے کہ اس کے صاف نکل جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

میں اور راجر اس کمرے سے نکل آئے اور کانسٹیبل سے کہا کہ اس لڑکی کو وہ اس کمرے سے باہر نہ نکلنے دے اور اگر وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر کوئی چیز تلاش کرتی ہے یا کہیں ہاتھ مارتی ہے تو سر پر کھڑے ہو کر دیکھے اور کوئی خاص بات ہو تو فوراً ہمیں بتائے۔

انشورنس کے چالیس ہزار

ہم پہلے جب ڈرائنگ روم میں اردلی کا بیان لے چکے تھے تو راجر نے کہا تھا کہ اس اردلی سے یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ یہ میاں بیوی آپس میں کس طرح رہتے تھے۔ میں نے راجر کو روک دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ بعد میں معلوم کریں گے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا۔ یہ تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل امرت کور ہے یا اس کا کوئی آشنا قاتل ہے اور امرت کور نے اس کے ساتھ مل کر یہ واردات کی ہے۔ میں نے ابھی یہ شک بھی ذہن میں رکھا ہوا تھا کہ یہ دشمن کے جاسوسوں کی بھی واردات ہو سکتی ہے اور یہ واردات امرت کور کے ایما پر یا اس کے تعاون سے ہوئی ہے لیکن میں جب چرن جیت سنگھ کو تصور میں لاتا اور اس خوبصورت اور نوعمر لڑکی کو اس کے ساتھ کھڑا کرتا تو میرا یہ شک پختہ ہو جاتا تھا کہ اس لڑکی نے اپنے اس خاوند سے اس طرح جان چھڑوائی ہے کہ اسے گولی ماردی ہے یا مروادی ہے۔

اردلی کو اندر بلایا اور بٹھا کر پوچھا کہ یہ میاں بیوی آپس میں کس طرح رہتے تھے۔ کیا ان میں لڑائی جھگڑا رہتا تھا یا ایک دوسرے سے روٹھے روٹھے رہتے تھے؟...... اردلی سر جھکا کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ڈرے نہیں۔ اس کا صاحب مارا گیا ہے اور اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر وہ صحیح بات نہیں بتائے گا تو ہم اس کا کورٹ مارشل کرادیں گے۔

''مجھے کسی کا ڈر نہیں صاحب!''۔۔۔ اردلی نے بڑی دلیری سے کہا۔۔۔ ''میں جو کچھ دیکھتا رہا ہوں وہ ضرور بتاؤں گا۔ مجھے چرن جیت سنگھ صاحب کا بہت افسوس ہے۔ میرا گاؤں ان کے بالکل قریب ہے۔ انہوں نے بہت بڑی غلطی کی تھی کہ پرانی بیوی کی چھٹی کرا دی اور اس لڑکی کو بیوی بنا کر لے آئے۔ اس کے بعد چرن جیت سنگھ صاحب گاؤں نہیں

گئے۔ یہ جس روز بھی گاؤں جاتے، ان کی پہلی بیوی کے بھائی انہیں قتل کر دیتے۔ یہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں کہ یہاں انہیں کس نے قتل کیا ہے، میں جو کچھ دیکھتا رہا ہوں وہ بتا دیتا ہوں''۔

اس نے تفصیلاً بتایا کہ امرت کور خاوند کے ساتھ کھچی کھچی رہتی تھی۔ چرن جیت سنگھ اسے خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ سیر سپاٹا تو بہت ہی کرواتا تھا۔ امرت کور اس سے لڑتی جھگڑتی نہیں تھی، کبھی رونے لگتی اور کبھی ڈرنے لگتی تھی۔ روٹھی ہوئی تو وہ ہر وقت ہی رہتی تھی۔ اردلی کو اس نے کئی بار کہا تھا کہ اس کا دل نہیں لگتا اور کبھی تو دل چاہتا ہے کہ گھر سے بھاگ کر جنگلوں میں چلی جائے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ایک سال نہیں ہوا۔ چرن جیت سنگھ دس دنوں کی چھٹی لے کر امرت کور کو شملہ بھی لے گیا تھا لیکن امرت کور کسی طرح بھی خوش اور راضی نہیں ہوتی تھی۔

''ایک بات بتاؤ''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا امرت کور نے کسی اور افسر کے ساتھ دوستی لگائی ہوئی تھی؟''

اردلی نے بتایا کہ کوئی ایسا افسر نہیں تھا جو چرن جیت سنگھ کی غیر حاضری میں یہاں آتا ہو، البتہ امرت کور کسی کو ٹیلیفون کرتی تھی اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ہنستی بھی تھی، مسکراتی اور بڑی پیاری باتیں کرتی تھی...... میرے اشارے پر اس نے بتایا کہ اسے یہ بھی شک ہے کہ میڈیکل آفیسر کیپٹن سخاوت علی خان کے ساتھ امرت کور کی دوستی ہے۔

میں نے اردلی کو کچھ اور اشارے اور لقمے دیئے تو اس نے بتایا کہ امرت کور اس ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے جاتی رہتی ہے اور اس وقت اردلی ساتھ ہوتا ہے۔ اردلی نے بتایا کہ دوسرے مریضوں کو یہ ڈاکٹر ایک دو منٹ میں فارغ کر دیتا تھا لیکن امرت کور جب اندر جاتی تو آدھا گھنٹہ اور کبھی اس سے بھی زیادہ وقت لگا کر باہر آتی تھی۔ اردلی نے بتایا کہ امرت کور اس ڈاکٹر کی بہت تعریفیں کیا کرتی ہے۔

یہاں میں آپ کو ایک بات یاد دلاتا ہوں جو میں اپنی کچھ کہانیوں میں لکھ بھی چکا ہوں۔ جنگ عظیم کے دوران ایک تو ٹھیکیداریاں عام ہوگئی تھی اور معمولی معمولی سے لوگ ملٹری کنٹریکٹر اور سپلائر بن گئے اور سونے چاندی میں کھیلنے لگے تھے۔ مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آئی تو وہ غلط راستے پر چل نکلے۔ شرابی کبابی ہو گئے اور اپنے گھر کے سکون تباہ و

برباد کر دیے۔ کئی ایک نے دوسری شادی کر لی اور پرانی بیوی اور بچوں کو اجاڑ دیا۔ یہ ایک وجہ تھی گھروں میں لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کی۔

چرن جیت سنگھ کے سلسلے میں جنگ عظیم کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ انڈین آرمی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ محاذوں پر ہندوستانی مکھیوں کی طرح مر رہے تھے جن میں افسر بھی شامل تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ افسر کم ہوتے ہیں۔ یہ جب مرنے لگے تو فوج میں افسروں کی کمی پوری کرنا ایک مسئلہ بن گیا۔

اس مسئلے کو اس طرح حل کیا گیا کہ ان صوبیداروں کو جو تعلیم یافتہ تھے، کیپٹن کا عہدہ دے دیا گیا۔ کمانڈ کرنے کے لئے کیپٹن، میجر اور کرنل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ فرض کریں چالیس یا اس سے زیادہ عمر کا کوئی صوبیدار کیپٹن ہو گیا تو وہ باقاعدہ صاحب بن گیا۔ وہ انگریز افسروں میں شامل ہو گیا اور آفیسرز میس میں جانے اور رہنے لگا تو اسے پرانی بیوی بے کار نظر آنے لگی۔ اس نے پرانی بیوی اور چار پانچ بچوں کو اجاڑ دیا اور کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

ایک دو نہیں، ایسے بہت سے واقعات ہوئے اور ان میں سے کئی واقعات سنگین جرائم بن کر تھانوں تک بھی پہنچے۔ یہی حرکت مقتول کیپٹن چرن جیت سنگھ نے کی تھی۔

اس کی تفصیل ہمیں مقتول کے پڑوسی میجر ورما سے ملی۔ میجر ورما بریگیڈ میجر تھا۔ یہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ایک پوسٹ ہوتی ہے۔ ہم نے اسے پوچھ گچھ کے لئے بلایا تو اس نے باقی باتوں کے علاوہ مقتول کی ہسٹری یوں سنائی کہ جنگ سے بہت پہلے مقتول سپاہی کلرک بھرتی ہوا تھا۔ یہ دس جماعتیں پاس تھا اور آدمی بڑا محنتی تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو ہر سپاہی کلرک کو حوالدار کلرک بنا دیا گیا تھا۔ چرن سنگھ نے تعلیم کی طرف توجہ دی اور فوج کا ایک تعلیمی امتحان ''آرمی سپیشل'' پاس کر لیا۔

پھر اس نے کوشش کی اور سپلائی کور میں چلا گیا جہاں اسے جمعدار کا عہدہ دیا گیا۔ پاکستان آرمی میں جمعدار کو نائب صوبیدار کہا جاتا ہے۔ پھر اس نے اپنا تعلیمی پروگرام جاری رکھا اور اسے انٹیلی جنس میں لے لیا گیا اور وہیں اسے کیپٹن کا عہدہ دے دیا گیا۔

میجر ورما نے بتایا کہ انٹیلی جنس میں اس نے ایسی ذہانت کا مظاہرہ کیا کہ بڑے افسر اس کے گرویدہ ہو گئے۔ یہ تو میں نے تین دنوں میں ہی دیکھ لیا تھا کہ چرن سنگھ انٹیلی جنس میں بڑا کامیاب اور دانشمند افسر ہے لیکن دانشمند آدمی جب غلطی کرتا ہے تو معمولی سی غلطی نہیں کیا

کرتا۔ مقتول نے اپنی عمر اور شکل و صورت نہ دیکھی اور اپنی کپتانی نہ جانے کیا سمجھ کر اتنی خوبصورت اور ایسی نوجوان لڑکی کو بیاہ لایا۔ ظاہر ہے لڑکی کے ماں باپ نے مقتول کی کپتانی کو ہی بیٹی دی تھی اور یہ نہ سوچا کہ بیٹی کے سینے میں بھی دل ہے اور اس نے بھی کوئی خواب دیکھے ہیں۔

میجر ورما نے بتایا کہ امرت کور اس کی بیوی کے پاس بہت دیر بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی اور اپنے رونے روتی تھی...... میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ وہ اپنی بیوی کو یہیں لے آئے۔

اس کی بیوی آ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بے تکلفی سے، بلا جھجک یہ بتائے کہ مقتول اور امرت کور گھر میں کس طرح رہتے تھے اور کیا ان میں نا چاقی تھی؟...... ورما کی بیوی نے بتایا کہ کہ امرت کور اس کے ساتھ پوری طرح بے تکلف تھی اور دل کی ہر بات اس کے ساتھ کرتی اور اپنے رونے اس کے آگے رویا کرتی تھی۔ اس عورت نے بتایا کہ یہ لڑکی ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی۔ عام طور پر اس کے منہ سے بے اختیار آہیں نکلتی تھیں اور کبھی آنسو بھی نکل آتے تھے۔ اس نے کبھی کوئی بات ہنسی مذاق کی نہیں کی تھی۔ کبھی تو وہ چپ چاپ گم صم بیٹھی ہوتی اور اچانک بولنا شروع کر دیتی۔ کبھی تو اچانک غصے سے اس طرح بے قابو ہو جاتی جیسے اچانک بم پھٹتا ہے۔ ورما کی بیوی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ امرت کور اپنے اس خاوند کے ساتھ بالکل خوش نہیں تھی اور اس سے آزاد ہونے کے طریقے سوچتی رہتی تھی۔

اس زمانے میں لوگوں کو ڈیپریشن ہوتی ہی ہو گی لیکن ابھی عام لوگ اس لفظ سے واقف نہیں تھے سوائے ڈاکٹروں کے۔ اس نے امرت کور کی جو علامتیں اور باتیں تفصیل سے سنائیں، ان سے یہی تشخیص دو قسموں کی ہوتی ہے۔ ایک میں مریض پر تقریباً ہر وقت رونے کی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ ہر بات کا صرف منفی پہلو دیکھتا ہے۔ اس کی ہر سوچ منفی اور ملول ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک خوف سا موجود رہتا ہے۔ ڈیپریشن کی دوسری قسم زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس کا مریض ذرا ذرا سی بات پر غصے سے پھٹنے لگتا ہے اور مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ وہ تشدد اور تخریب کاری کی طرف فوراً مائل ہو جاتا ہے...... ورما کی بیوی نے اس کی جو حالت بیان کی تھی، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر ڈیپریشن کی یہ دونوں قسمیں طاری رہتی تھیں۔

ورما کی بیوی نے بتایا کہ ایک روز امرت کور مقتول سے کچھ زیادہ ہی اکھڑی ہوئی

تھی۔ اس روز اس نے زیادہ باتیں کیں۔ اس نے ورما کی بیوی کو پہلی بار بتایا کہ اس کے خاوند نے اس کی اور اپنی انشورنس کروائی ہوئی ہے۔ یہ اس نے شادی کے دوسرے یا تیسرے مہینے کروائی تھی۔ دونوں پالیسیاں چالیس چالیس ہزار روپے کی تھیں۔ اس زمانے میں چالیس ہزار آج کے لاکھوں جتنی رقم بنتی تھی۔ امرت کور نے ورما کی بیوی سے یہ الفاظ کہے کہ میں چرن جیت سنگھ سے اتنی تنگ آچکی ہوں کہ خودکشی کا ارادہ کر لیتی ہوں لیکن یہ سوچ کر یہ ارادہ توڑ دیتی ہوں کہ میں مر جاؤں گی تو اس شخص کو میری انشورنس کے چالیس ہزار روپے ملیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری موت سے اسے اتنا فائدہ ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ مر جائے۔ اس سے مجھے دو فائدے ہوں گے۔ ایک کہ اس کی انشورنس کے چالیس ہزار روپے مجھے ملیں گے اور اس سے رہائی بھی مل جائے گی۔

یہ ہمارے لئے ایک نئی خبر تھی۔ قتل کا باعث یہ انشورنس پالیسی بھی ہو سکتی تھی لیکن دیکھنا یہ تھا کہ امرت کور کو اس راستے پر کس نے ڈالا اور کس نے اکسایا تھا۔ قتل کی ایسی وارداتیں آپ نے سنی ہوں گی کہ خاوند نے بیوی کی لائف انشورنس کرائی اور تھوڑے ہی عرصے بعد اسے اس طرح مارا یا مروا دیا کہ یہ قتل نہ لگے بلکہ حادثہ یا قدرتی یا طبعی موت لگے۔ کئی لوگوں کو سزا بھی ہوئی ہے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے اور انسپکٹر راجر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کیس کو گرفتاری تک پہنچا کر ہی آرام کریں گے۔ ہم جتنی دیر میجر ورما اور اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اس دوران ہمارے ہیڈ کانسٹیبل نے ہولسٹر سے انگلیوں کے نشان ایک خاص کاغذ پر اتار لئے تھے جو کیس میں موجود رہتا تھا۔ ہم ورما اور اس کی بیوی سے فارغ ہوئے تو راجر نے امرت کور کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے اور پوری پوری ہتھیلی کے بھی نشان کاغذ پر لگوا لئے۔ یہ کاغذ اور ہولسٹر سے لئے ہوئے انگلیوں کے نشان بطور فنگر پرنٹ بیورو بھیجے جانے تھے۔ وہاں انگلیوں کے نشانات پہچاننے اور رپورٹ لکھنے والے ایکسپرٹ موجود تھے۔

مسلمان کر کے شادی کر لو

میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں امرت کور بیٹھی ہوئی تھی۔ میں پہلے پوری طرح بیان کر چکا ہوں کہ وہ ذہنی حالت میں تھی اور مجھے یہ خدشہ نظر آ رہا تھا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گی

اور اس کا ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے۔ وہ اسی حالت میں تھی بلکہ اب اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں خمار سا تھا۔ یہ تھا وہ وقت اور یہ تھی وہ ذہنی اور جذباتی کیفیت جب پتھر جیسے مضبوط مجرم بھی بیان دے دیا کرتے ہیں۔ میں نے اس کے ساتھ تھانیداروں کے انداز میں آفیسروں کے لہجے میں بات نہ کی بلکہ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہمدردی کی ایک دو باتیں کیں۔

میں نے اسے کہا کہ ٹیلیفون ایکسچینج سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اس نے خاوند کو گولی مار کر کیپٹن سخاوت علی خان کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ ہم جب یہاں پہنچے تھے تو ایک فون آیا تھا جو میں نے سنا تھا۔ وہ کیپٹن سخاوت علی خان کا فون تھا۔ اس طرح اسے بتایا کہ اس کے خلاف ہمیں مکمل شہادت مل چکی ہے اور وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے اور ہم اس کے ساتھ تعاون کریں گے...... پھر بھی اس نے انکار میں سر ہلایا لیکن اب اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

''امرت کور!'' ___ میں نے کہا ___ ''ہم اس گھر کی تلاشی اس طرح لیں گے کہ تمام ٹرنک اور اٹیچی کیس الٹے کر کے خالی کر دیں گے اور الماریوں میں سے بھی ہر چیز باہر نکال کر دیکھیں گے اور ریوالور ہمیں مل ہی جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم ریوالور خود نکال دو'' ___ میں نے اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے جا کر کہا ___ ''تم مظلوم ہو امرت کور!...... تم تن تنہا ہو۔ میں تم پر مزید ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرے لئے گناہ ہوگا۔ مجھے تم اپنا کیوں نہیں سمجھتی؟''

''اور یہ جو انگریز آفیسر آپ کے ساتھ ہے!'' ___ اس نے غنودگی کے عالم میں کہا ___ ''اور ملٹری پولیس کے آفیسر بھی آ گئے ہیں، ان سے آپ مجھے کس طرح چھڑائیں گے؟''

''کیا تم دیکھ نہیں رہی کہ میں تمہارے پاس اکیلا آیا ہوں؟'' ___ میں نے کہا ___ ''میں تمہارا بیان لوں گا اور ان گورے افسروں کو موڑ توڑ کر بیان سناؤں گا۔''

اس طرح زبان کی ہیرا پھیری سے میں نے اسے رام کر لیا۔ رام نہ ہوتی تو ہمارے پاس اقبالی بیان لینے کے اور طریقے بھی تھے لیکن میں اس لڑکی پر تشدد کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

''آپ نے اس آدمی سے پتہ چلا ہے کہ آپ مسلمان ہیں'' ___ امرت کور نے بڑی ہی بے بسی اور شکست خوردگی کی حالت میں کہا ___ ''میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ یہ میں آپ

کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے آپ کو بچانے کے لئے نہیں کہہ رہی، یہ تو میرا ابھی کا فیصلہ ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ میرا یہ ارادہ اور یہ خواہش آپ پوری کر دیں اور پھر چاہیں تو میرے ساتھ شادی کر لیں یا کسی بڑے ہی اچھے مسلمان کے ساتھ مجھے بیاہ دیں۔ میں اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں''۔

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے گہری نیند میں بول رہی ہو۔ اس نے کچھ اور باتیں بھی کی تھیں جو سب کی سب ابنارمل تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ بھی آدھی آدھی۔

''میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا''___ میں نے کہا___ ''تم یہ بتاؤ کہ تم کون سے مسلمان کی خاطر مسلمان ہونا چاہتی ہو؟''

''ڈاکٹر سخاوت کے لئے!''___ اس نے بلا سوچے فوراً جواب دیا۔

اب تو یوں لگتا تھا جیسے وہ خود نہیں بول رہی بلکہ الفاظ اپنے آپ ہی اس کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ دراصل اس کا شعور سو گیا تھا اور ذہن لاشعور بیدار ہو کر راز سے پردے اٹھا رہا تھا۔

''یہ کام مجھ پر چھوڑو''___ میں نے کہا___ ''میں تمہاری شادی ڈاکٹر سخاوت کے ساتھ کروا دوں گا...... تم نے خاوند کو گولی ماردی ہے تو کیا؟ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔ میں اب تمہیں ایک مسلمان لڑکی سمجھ کر بات کر رہا ہوں...... تم مجھے اصل بات بتا دو پھر دیکھنا میں کیا کرتا ہوں''۔

میں نے اس کے اردلی کو بلا کر کہا کہ اسے گرم دودھ پلا دو اور اگر کچھ کھانا چاہتی ہے تو وہ بھی کھلا دو اس نے کہا کہ وہ صرف دودھ پیئے گی۔

غلام خاوند

پھر اس نے بیان دینا شروع کر دیا۔ میں اس کا سارا بیان نہیں سناؤں گا کیونکہ یہ بہت ہی لمبا تھا۔ میں جس طرح ملزموں کے بیان کہانیوں میں لکھا کرتا ہوں اسی طرح اس کے بیان کے بھی ضروری حصے پیش کروں گا تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ قتل کا باعث اور اس کا پس منظر کیا تھا۔

اس نے بیان تو دے ہی دینا تھا کیونکہ وہ عادی مجرم نہیں تھی اور ذہنی طور پر نارمل بھی نہیں تھی۔ تنہا تھی اور اسے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ میں اپنی کئی کہانیوں میں بتا چکا

ہوں کہ قتل ایک ایسا جرم ہے جسے عادی مجرم اور قاتل بھی ہضم نہیں کر سکتے۔

پہلے تو اس نے بتایا کہ اس کی شادی کس طرح ہوئی تھی۔ یہ میں دوسروں کی زبانی پہلے بیان کر چکا ہوں۔ وہ جب بیان دے رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ بیدار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں جان آتی چلی گئی اور جو ذرا سہارا لے کر بیٹھی ہوئی تھی، سیدھی ہو بیٹھی اور بالکل نارمل ذہنی حالت میں آگئی۔

وہ جب اپنی شادی کا قصہ سنا رہی تھی تو اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے منہ میں کوئی کڑوی چیز آجاتی ہے اور اس کا کڑوا ذائقہ چہرے اور بولنے کے انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے جی بھر کے مقتول کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔

اس موقع پر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہو گی۔ اس نے کہا کہ اس وقت تک اس کے دل میں کسی کی محبت پیدا نہیں ہوئی تھی اور وہ ابھی اپنے جیسے کسی نوجوان آدمی کے انتظار میں تھی لیکن اس کا باپ بڑا ہی تنگ نظر اور لالچی آدمی تھا۔ اس کی شادی چرن جیت سنگھ کے ساتھ کر دی گئی تو اس احساس نے اسے پاگل کر دیا کہ وہ تو کسی اور کو چاہتی تھی اور اس نے کچھ اور ہی خواب دیکھے تھے جو سب کے سب کچلے اور مسلے گئے۔

چرن جیت سنگھ اس کے آئیڈیل سے بالکل اُلٹ تھا۔ وہ عمر کے اتنے زیادہ فرق کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی، یہ دوسرے پہلو تھے جو اسے پیس رہے تھے۔ اس نے کہا کہ چرن جیت سنگھ اس کے آگے بچھ بچھ جاتا تھا اور کبھی تو وہ ایسی حرکتیں کرتا تھا جیسے وہ اس کا خاوند نہیں بلکہ غلام ہے۔ امرت کور کو ایسا خاوند بہت ہی برا لگتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مرد کا ساتھ چاہتی تھی جس میں مردوں والا رعب، دبدبہ اور خود اعتمادی ہو۔

میں امرت کور کے ساتھ ایسی باتیں کرتا رہا جو میں اس قسم کے ملزم سے اقبالی بیان لینے کے لئے لیا کرتا تھا۔ ان باتوں میں تھانیداری کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ پیار تھا، شفقت تھی مگر سولہ آنے فریب کاری تھی۔

دودھ آگیا۔ اس نے بڑی اچھی طرح بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک دو دو گھونٹ دودھ پیتی رہی اور بولتی رہی۔ میں اپنے انداز سے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ مقتول کے ساتھ اس کی شادی کس طرح ہوئی تھی۔ یہ میں پہلے ہی دوسروں کی زبانی سنا چکا ہوں۔

''یہ تو میرا جسم ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں''___ اس نے کہا___ ''زندہ لاش!......

میرا دل اسی روز مر گیا تھا جس روز چرن جیت سنگھ کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی۔ میرا باپ بے وقوف اور لالچی تھا۔ اس نے نقد پیسہ ضرور لیا ہوگا۔ کہتا تھا منڈا کپتان اے، کرنیل تے جرنیل ہو جاؤ گا...... منڈ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ کڑی کا باپو لگتا ہے"۔

مقتول اسے میرٹھ لے آیا۔ امرت کور نے اس کے خلاف نفرت ہی نفرت کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے ایک مرد کی ضرورت تھی لیکن مقتول اس کا غلام بن گیا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لیے ہیجڑوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ امرت کور نے کہا کہ وہ ایسے مرد کو پسند کرتی ہے جس میں رعب اور دبدبہ ہو اور جو اپنے آپ میں اعتماد پیدا کر کے بات کرے اور بیوی اسے اپنا محافظ سمجھ کر اس پر فخر کرے۔

چرن جیت سنگھ تین دن میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے اس میں ایسی کوئی خامی نہیں دیکھی تھی جو امرت کور بتا رہی تھی۔ وہ ہر بات اور ہر اقدام پُر اعتماد طریقے سے کیا کرتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ڈیوٹی کے تقاضے اور ہوتے ہیں اور ازدواجی زندگی کے مطالبے کچھ اور ہوتے ہیں۔ بہر حال امرت کور کی رائے میرے لئے قابل فہم تھی۔

میرٹھ آنے کے تیسرے مہینے امرت کور کو آدھے سر کا درد ہونے لگا۔ یہ اعصابی کھچاؤ اور جذباتی خلفشار کے اثرات تھے۔ چرن جیت سنگھ اسے اپنے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر کیپٹن سخاوت علی تھا۔ وہ سی ایم ایچ کا ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی نفری کے لئے ایم آئی روم تھا...... میڈیکل انسپکشن روم...... وہاں آؤٹ ڈور مریض جاتے تھے۔ کیپٹن سخاوت علی نیا نیا ایم آئی روم کا انچارج بنا تھا۔

امرت کور نے شرا و حجاب کو الگ پھینک کر بڑے صاف لفظوں میں کہا کہ پہلی نظر میں ہی سخاوت علی اس کے دل میں اتر گیا۔ اتنی پیاری مسکراہٹ والا خوبرو جوان جچی تلی بات کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ سخاوت علی نے اسے اپنے دل میں بٹھا لیا ہے۔

اس کے بعد امرت کور آدھے سر درد کے بہانے ڈاکٹر سخاوت علی کے پاس اکیلی جانے لگی۔ اس نے چرن جیت سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ وقت ضائع نہ کیا کرے، اپنی ڈیوٹی پر چلا جایا کرے اور وہ خود ڈاکٹر کے پاس چلی جایا کرے گی۔

وہ جاتی رہی اور ان کی محبت ایسی ہوگئی جیسے ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہوں۔ ملاقات الگ اور ٹیلیفون پر الگ پیار و محبت اور راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں۔ سخاوت علی غیر شادی شدہ تھا اور آفیسرز سنگل کوارٹر میں رہتا تھا۔ امرت کور اس کے کمرے میں بھی کئی

بار گئی تھی۔ چرن جیت سنگھ کو کبھی کبھی نئی دلی انٹیلی جنس کے سلسلے میں جانا پڑتا اور دو تین دن وہیں رہنا ہوتا تھا۔ اس دوران امرت کور اردلی کو یہ بتا کر کہ فلاں افسر کی بیوی سے ملنے جا رہی ہوں، سخاوت علی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

کیپٹن ڈاکٹر سخاوت علی نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ خاوند سے طلاق لے کر مسلمان ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ امرت کور نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے گی لیکن اسے ہاتھ پکڑنے والا کوئی مسلمان نہیں مل رہا تھا۔ ایک دو ملے مگر وہ جسم کے بچاری نکلے۔ سخاوت علی وہ آدمی تھا جو اس کی روح کے پیمانے پر پورا اترا۔ اس نے چرن جیت سنگھ سے ایک بار کہا کہ وہ اس سے علیحدگی چاہتی ہے تو چرن جیت سنگھ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارنے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بجائے اس کے آگے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے اور منت سماجت کرنے لگا۔

مریضہ اور مسیحا

امرت کور نے اپنے بیان میں کہا کہ سخاوت علی کو اس نے ایک روز بتایا کہ چرن جیت سنگھ نے اس کی لائف انشورنس کرائی ہے اور 40 ہزار کی پالیسی ہے۔ سخاوت علی سوچ میں پڑ گیا پھر پریشان سے لہجے میں بولا کہ چرن جیت سنگھ تمہیں کسی ایسے طریقے سے مار ڈالے گا کہ یہ حادثہ لگے گا اور وہ انشورنس کمپنی سے 40 ہزار روپیہ وصول کر لے گا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ اس دور میں 40 ہزار روپیہ بہت بڑی رقم تھی۔ اسے آج کے پانچ چھ لاکھ سمجھ لیں بلکہ اس سے بھی زیادہ...... یہاں تک میں نے جو کہانی سنائی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ قتل کی عام کہانیوں جیسی ہے۔ کسی میں خاوند نے بیوی کو قتل کر دیا کسی میں بیوی نے خاوند کو قتل کر دیا۔ یہ جو واردات اور تفتیش سنا رہا ہوں، اس کا یہ حصہ دوسری تمام کہانیوں سے مختلف ہے اور اسی سے اس کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

امرت کور نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اس سے علیحدہ ہونا چاہتی ہے اور اس کے ساتھ روٹھی روٹھی رہنے لگی۔ بعض راتیں وہ اس کے ساتھ بیڈ روم میں سونے سے انکار کر دیتی تھی۔ خاوند اس کی منت سماجت کرنے اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر امرت کور ڈیپریشن کی مریضہ ہو گئی۔ میں اس کی یہ کیفیت یہاں دہراؤں گا نہیں۔ یہ میں بریگیڈ میجر ورما کی بیوی کی زبانی سنا چکا ہوں۔ امرت کور نے اپنے بیان میں اپنی یہ کیفیت تفصیل سے

سنائی تھی۔

مقتول اس کی اس ابنارمل ذہنی حالت سے اور اس کے دشمنوں جیسے سلوک سے تنگ آ گیا تھا یا نہیں، یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ امرت کور نے یہ تاثر لیا اور مجھے بھی یہی تاثر دیا کہ مقتول اس سے تنگ آ گیا تھا۔ امرت کور نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے دو تین مرتبہ چرن جیت سنگھ سے کہا تھا کہ وہ سر کے بال کٹوا دے اور داڑھی بھی صاف کرا دے۔ یہ واحد مطالبہ تھا جس پر چرن جیت سنگھ کو غصہ آ گیا تھا اور اس نے امرت کور کو ڈانٹ دیا تھا۔

ادھر کیپٹن سخاوت علی نے امرت کور کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ چرن جیت سنگھ نے دیکھ لیا ہے کہ وہ اس کی نہیں بن رہی اس لئے وہ اب اسے کسی طریقے سے مار کر اس کی انشورنس کا 40 ہزار روپیہ وصول کرے گا۔ امرت کور سخاوت علی کی ہر بات کو پتھر پر لکیر اور حرف آخر سمجھتی تھی۔ اس نے بیان میں کہا کہ چرن جیت سنگھ نے اسے تین بار جان سے مار دینے کی کوشش کی تھی۔

اس نے سنایا کہ ایک روز وہ اسے دریائے گنگا پر سیر کے لئے لے گیا جو وہاں سے بائیس تئیس میل دور ہے۔ کرائے پر چھوٹی سے کشتی لی اور خود چپو چلانے لگا۔ کشتی کو پل کے ایک ستون کے قریب لے گیا اور کشتی ستون سے ٹکرائی جو الٹنے سے بچ گئی۔ امرت کور نے مجھے سنایا کہ چرن جیت تیرنا جانتا تھا، وہ مجھے ڈبونا چاہتا تھا لیکن کشتی الٹ نہ سکی۔

''پھر ایک روز مجھے فوجی موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھایا اور سیر کو لے چلا'' ــــ امرت کور نے کہا ــــ ''راستے میں اتنی تیزی سے موڑ کاٹے کہ میں پیچھے سے بازو اس کی کمر میں نہ ڈال لیتی تو میں گر کر مر جاتی۔ میں نے اسے کہا کہ فوراً واپس چلو اور آہستہ چلاؤ''۔

''ایک روز مجھے دلی سے آگے قطب مینار دکھانے لے گیا'' ــــ اس نے ایک اور واقعہ سنایا ــــ ''وہاں مجھے مینار کے اوپر لے گیا اور بار بار کہتا تھا نیچے دیکھو ہر چیز کتنی چھوٹی نظر آتی ہے۔ وہ میرے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ مجھے اتنی زیادہ بلندی سے گرانا چاہتا ہے۔ وہاں سے گر کر میرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ میں دوڑ کر نیچے آ گئی''۔

اس نے یہ واقعات پوری تفصیل سے سنائے تھے اور میں نے جرح بھی کی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے، خاوند اسے خوش کرنے کے لئے لے گیا تھا لیکن وہ اسے وہم نہیں حقیقت اور ارادہ قتل سمجھی تھی۔ اس کا وہم سخاوت علی نے پکا کیا تھا۔ امرت کور نے ہر

واقعہ سخاوت کو سنایا تھا اور سخاوت نے کہا تھا کہ یہ خاوند کا ارادہ قتل تھا۔

امرت کور نے اپنے خاوند کے ہاتھ سے کچھ کھانا پینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آخر میں امرت کور کی ذہنی حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے نیند بھی نہیں آتی تھی۔ واردات والی رات کے متعلق امرت کور نے یہ بیان دیا کہ چرن جیت ہمارے پاس آنے کے لئے تیار ہوا تو اس نے امرت کور سے کہا کہ وہ اس کے لئے نیند کی دوائی لایا ہے۔ یہ لے لے، نیند آ جائے گی۔ وہ نہ جانے رات کس وقت واپس آئے۔

امرت کور کے بیان کے مطابق، وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ نیند کی دوائی نہیں بلکہ شیشی میں زہر ہے اور چرن جیت نے اس پر نیند کی دوائی کا لیبل لگا رکھا ہے۔ اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا۔ چرن جیت نے اسے پیار سے کہا تو بھی وہ نہ مانی۔ اس وقت وہ بیڈ روم میں تھے۔ چرن جیت شیشی اور چمچ اٹھائے امرت کور کے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا اور وہ آگے آگے بھاگ رہی تھی۔

آخر چرن جیت نے ذرا غصے سے کہا کہ وہ اسے زبردستی دوائی پلائے گا۔ امرت کور نے سوچا کہ یہ طاقتور مرد ہے اور وہ کمزور سی لڑکی ہے جو اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور آج یہ اس کو مار کر ہی رہے گا۔ ڈیپریشن کی ماری ہوئی اس لڑکی کو یہ سوچ بھی آئی کہ یہ مجھے زہر پلا کر چلا جائے گا اور ساری رات باہر گزار کر صبح آ کے رپورٹ دے دے گا کہ میری غیر حاضری میں میری بیوی کو کوئی زہر پلا گیا ہے۔

امرت کور کا دماغ اس کے قابو سے بالکل ہی نکل گیا۔ وہ تو پہلے ہی اس کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھی۔ مقتول پلنگوں کی دوسری طرف تھا۔ اس نے کہا کہ آج میں بھی دوائی پلا کر ہی جاؤں گا۔ امرت کور کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے ساتھ ریوالور والی بیلٹ لٹکتی نظر آ گئی۔ یہ چرن جیت سنگھ اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس نے ریوالور لوڈ کر کے رکھا تھا۔

امرت کور نے ریوالور نکال لیا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر نالی چرن جیت سنگھ کی طرف کر دی۔

''یہ لوڈ ہے'' ــــ چرن جیت سنگھ نے اپنی زندگی کے آخری الفاظ کہے ــــ ''ریوالور رکھ دو''۔

امرت کور نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چرن جیت کی کھوپڑی میں سے پار ہو کر پیچھے دیوار

سے لگی۔

میں نے اس ڈرامے کے آخری سین پر بہت جرح کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ چرن جیت سنگھ امرت کور کو اسی کے فائدہ کے لئے نیند کی دوائی زبردستی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس زبردستی میں خلوص اور پیار تھا۔ امرت کور کو پانچ راتیں نیند نہیں آئی تھی جس سے اس کی ذہنی حالت میں تلخی بلکہ تشدد پسندی اور جارحیت بڑھ گئی تھی۔ اس کی سوچیں تو پہلے ہی منفی اور تخریبی ہو چکی تھیں۔

اس نے خاوند کو گولی مار کر ڈاکٹر سخاوت علی کو فون پر اطلاع دے دی اور سخاوت نے اسے کہا تھا کہ پولیس آ جائے، کوئی آ جائے، یہی کہنا کہ باہر کا کوئی آدمی گولی مار گیا ہے۔

بیان کے بعد امرت کور نے ریوالور اپنے ایک اٹیچی کیس میں سے نکال دیا تھا۔ میں نے برآمدگی میجر ورما اور مقتول کے اردلی کے سامنے کروائی اور انہیں گواہ بنایا تھا۔

اس کے بعد ہم نے کیپٹن ڈاکٹر سخاوت علی خان کو شامل تفتیش کیا اور اسے بتایا کہ امرت کور نے اس کے متعلق کیا بیان دیا ہے۔ اس نے کچھ باتیں تسلیم کیں کچھ نہ کیں۔ اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ اسے امرت کور سے محبت ہے اور یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے امرت کور سے کہا تھا کہ چرن جیت سنگھ اسے مار کر اس کی انشورنس کی رقم وصول کرنا چاہتا ہے۔

میں نے اور انسپکٹر راجر نے جب آپس میں صلاح مشورہ کیا تو ملٹری پولیس کے انگریز میجر کو بھی ساتھ رکھا۔ ڈاکٹر سخاوت اعانت جرم کا مجرم تھا۔ اس نے ایک ذہنی مریضہ کو قتل پر اکسایا تھا لیکن اس کے خلاف ثبوت کوئی نہیں تھا۔ امرت کور کے بیان سے اس کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے اسے تفتیش سے خارج کر دیا لیکن انسپکٹر راجر نے اس کے خلاف بڑی سخت رپورٹ لکھی اور بریگیڈ کمانڈر کو خود جا کر دی۔ اس رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ ڈاکٹر ہو کر ایک ذہنی مریضہ کا علاج کرنے کی بجائے اسے خاوند کے خلاف ایسا بھڑکایا کہ اس نے اپنے خاوند کو گولی مار دی۔

امرت کور کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور ڈاکٹر سخاوت علی خان کا بریگیڈ کمانڈر نے کورٹ مارشل کرایا اور اسے سروس سے ڈسمس کر دیا گیا تھا۔ ڈسمس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ شخص کسی بھی قسم کی سرکاری سروس میں نہیں لیا جا سکتا۔

+ + +

دل کا معاملہ

یہ اللہ کا حکم ہے کہ تمہارا کوئی بچہ غلط راستے پہ چلتا ہے تو اسے روکو۔ اگر نہیں مانتا تو سختی کرو پھر بھی نہ مانے تو اسے جسمانی سزا دو۔ میں اللہ کے حکم کا پابند ہوں۔

میرے تھانے سے تقریباً ساڑھے تین میل دور ایک گاؤں میں قتل کی واردات ہو گئی۔ تھانہ قصبے میں تھا۔ گاؤں اتنا بڑا بھی نہ تھا اور چھوٹا بھی نہ تھا۔ مقتول کی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان بتائی گئی۔ وہ گاؤں کے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھا۔ اس کے دو بیٹے تھانے میں آئے تھے۔ بڑے کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی اور چھوٹا بائیس تئیس سال کا تھا۔ ان کے ساتھ گاؤں کا نمبردار بھی تھا۔ گاؤں سے چند ایک کھیت آگے مقتول کا سبزیوں کا باغ تھا۔ وہاں ایک کمرے کا مکان تھا جو مقتول یا اس کے گھر کے افراد کے کام آتا تھا، عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ باغ میں کام کرنے والے مزارعین کا مکان اس مکان سے کچھ دور تھا۔ مقتول کو چھوٹے مکان کے صحن میں قتل کیا گیا تھا۔

میں نے کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لئے ان سے ضروری باتیں پوچھیں اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں ان سے وہ سوال کرتا گیا جو قتل کی واردات میں ہر تھانے دار کی زبان پر آتے ہیں۔ یہ تو ہمارا معمول تھا۔ ایسے سوالات اپنے آپ ہی زبان پر آ جایا کرتے تھے۔ مجھے ہر سوال کا جواب مقتول کے بڑے بیٹے سے ملتا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا جسے آپ اصل نام نہ سمجھیں۔ میری یادداشتوں میں اس کا نام نہیں لکھا۔

یہ واردات مجھے اس طرح یاد آئی کہ چند ہی دن پہلے میں نے ایک اخبار میں خبر پڑھی جس کی سرخی تھی —— ''بوڑھے کے پیچھے ایک جوان عورت نے اپنے خاوند سے طلاق لے لی'' —— خبر دلچسپ تھی۔ ایک بوڑھا آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا اور ایک جوان عورت اپنے خاوند سے طلاق مانگ رہی تھی اور پھر دونوں کا پروگرام شادی کرنے کا تھا۔ مجھے یہ خبر پڑھ کر اپنی سروس کی بالکل ایسی ہی ایک پرانی واردات یاد آ گئی۔ اپنی ڈائریوں کو کھنگالا تو ان میں واردات مل گئی جو آپ کو سنا رہا ہوں۔

میں نے راستے میں کوئی باریک بات نہ پوچھی کیونکہ میں گھوڑی پر سوار تھا اور باقی سب پیدل جا رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ نمبردار بھی ساتھ اور میرا عملہ بھی ساتھ چلا

جا رہا تھا۔ میں نے سب کے الگ الگ بیان تو لینے ہی تھے۔

باغ میں پہنچے تو مجھے چھوٹے مکان میں لے جایا گیا جس کے صحن میں چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر بڑا اچھا بستر تھا اور مقتول اس بستر پر ٹیڑھا میڑھا ہو کر پڑا تھا۔ اس کے گلے میں پگڑی تھی جو اس کی اپنی ہی تھی۔ خون کا ذرا سا بھی دھبہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی پگڑی ہٹائی تو گردن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ پگڑی کو پھانسی کا رسہ بنایا گیا تھا۔

میں نے پوچھا کہ یہ رات کو یہیں سویا کرتا تھا تو مجھے جواب ملا کہ روزانہ نہیں، کبھی کبھی رات یہاں آ کر سوتا تھا۔

دروازے کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ دروازہ رات کو کھلا رہتا تھا۔

میں نے لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا، چوٹ یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

کمرے میں میں جا کر دیکھا۔ بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا اور تین یا چار اچھی قسم کی کرسیاں تھیں اور ایک تپائی بھی تھی۔ تپائی پر شراب کی بوتل پڑی تھی اور تین گلاس بھی تھے۔ آدھی بوتل میں شراب موجود تھی۔ میں نے تینوں گلاس دیکھے۔ صرف ایک گلاس میں شراب کے تین چار قطرے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے دونوں گلاس سونگھے۔ ان میں شراب نہیں ڈالی گئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ صرف ایک آدمی نے رات شراب پی ہے۔

فرش کچا تھا۔ کھروں کے لئے یہ کچا فرش مناسب وموزوں تھا لیکن لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ شخص مارا گیا ہے تو سب صحن میں گھومتے پھرتے رہے اور ملزم کے کھرے غائب ہو گئے۔ باہر بھی کوئی کھرا ملنے کا امکان نہیں تھا۔ لوگوں نے سب کھرے مٹا ڈالے تھے۔

مقتول نے کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو تین چار دس روپوں کے اور ایک پانچ روپے کا نوٹ برآمد ہوا اور دو یا تین روپے سکوں میں تھے۔ مقتول کے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی وزنی انگوٹھی تھی۔ تکئے کے قریب اس کی گھڑی بھی پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ واردات ڈکیتی کی ہوتی تو اس کی جیب میں پیسے اور اس کی انگلی میں انگوٹھی نہ ہوتی اور گھڑی بھی غائب ہو جاتی۔ یہ خیال بھی آیا کہ واردات ڈکیتی کی ہوتی تو ملزم اس کے گھر ڈاکہ ڈالتے۔ وہ خوش حال زمیندار تھا۔ اس کے گھر میں رقم اور زیورات کا ہونا لازمی تھا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ مقتول کے بڑے بیٹے فیروز کو میں نے اپنے ساتھ رکھا اور اس سے چھوٹے بیٹے منصور کو لاش کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد اس نے لاش وصول کرنی تھی۔

میں تفتیش کے لئے مقتول کے اسی مکان کے صحن میں بیٹھ گیا۔ تپائی اور کرسیاں صحن میں رکھ دی گئیں اور نمبردار نے پلنگ بھی اٹھوا کر باہر میرے قریب صحن میں رکھوا دیا۔

یہ تو میں نے فیروز سے راستے میں ہی پوچھ لیا تھا کہ ان کی یا اس کے مقتول باپ کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ فیروز نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا تھا کہ ان کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی نہیں تھی جیسی عموماً دیہاتی علاقوں میں ہوا کرتی ہے۔ کسی کے ساتھ زمینوں کا تنازعہ یا کسی اور وجہ سے لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ مقتول کی ذاتی دشمنی کے متعلق فیروز نے کوئی پختہ جواب نہیں دیا تھا۔ یہ میں نے اب معلوم کرنا تھا کہ مقتول کی ذاتی یعنی پرائیویٹ زندگی کس طرح گزری تھی۔

میں نے سب کو باہر بھیج دیا اور سب سے پہلے سبزیوں کے اس باغ میں کام کرنے والے مزارعہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔

بڑھاپے کی عشق بازی

یہ ادھیڑ عمر مزارعہ تھا۔ اس غریب مزارعہ کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کا گہرا تاثر ایک قدرتی امر تھا۔ میں اپنی تفتیشی کہانیوں میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ ان مزارعوں اور نوکروں کو یہ بڑے زمیندار اور جاگیردار کس طرح استعمال کیا کرتے ہیں اور جب ان پر کچھ بن جاتی ہے تو ان ہی غریبوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ انگریزوں کے وقتوں میں تو ہم ان وڈیروں کو پکڑ لیا کرتے تھے اور ان ہی مزارعوں کو ان کے خلاف کورٹ میں استعمال کر کے سزا دلا دیتے تھے لیکن پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہی وڈیرے اس ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔

مقتول کے اس مزارعہ کے ساتھ میں نے تھانیداروں کے انداز سے بات نہ کی بلکہ میرے انداز میں شفقت اور ہمدردی تھی اور اسے یقین دلایا کہ وہ جو کچھ بھی بتائے گا وہ راز میں رہے گا اور کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا کہ فلاں بات اس مزارعہ نے بتائی تھی۔

اس مزارعہ کا مکان باغ کی دوسری طرف تھا اس لئے ان لوگوں کو رات کے وقت

پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ مقتول کے مکان میں کوئی آیا ہے یا نہیں۔ جس رات مقتول اس مکان میں سوتا تھا اس رات ان لوگوں کو بتا دیا جاتا تھا کہ آج رات چوہدری صاحب یہاں سوئیں گے لیکن ان کے لئے یہ حکم بھی تھا کہ کوئی اس طرف نہ آئے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ چوہدری صاحب کے مکان میں جوئے کی بازی لگے گی یا کوئی اور بدکاری ہوگی۔

سب سے پہلے تو میں نے یہ معلوم کیا کہ اس مزارعہ کی فیملی کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک تو وہ خود ہے۔ اس کی بیوی ہے اور تین لڑکے ہیں۔ بڑے کی عمر پندرہ سولہ سال، اس سے چھوٹا بارہ تیرہ سال اور تیسرے کی عمر چھ سات سال تھی۔ میرا شک رفع ہو گیا جو یہ تھا کہ مزارعہ کی جوان بہو یا بیٹی ہوگی اور مقتول نے اسے داشتہ بنا رکھا ہوگا اور اس سلسلے میں چوہدری کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔

مزارعہ سے پوچھا کہ مقتول جس رات یہاں سوتا تھا تو کیا اس رات کبھی کوئی عورت بھی یہاں آتی تھی؟...... اس نے بتایا کہ ایک تو یہاں غنڈے اور مشکوک قسم کے آدمی آتے تھے اور شراب چلتی تھی اور کبھی کوئی عورت بھی آتی تھی۔

''کیا تم نے کبھی کوئی عورت دیکھی ہے؟'' ــــ میں نے پوچھا۔

''نہیں حضور!'' ــــ اس نے بھکاریوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر جواب دیا ــــ ''اتنا تو پتہ چل ہی جاتا تھا کہ آج رات کوئی عورت آئی ہے لیکن یہ کبھی دیکھنے کی کوشش یا ہمت نہیں کی کہ عورت کون ہے۔ ایک عورت کے متعلق بتا سکتا ہوں۔ یہ دن کو بھی کبھی کبھی یہاں آتی ہے اور اس وقت آتی ہے جب چوہدری صاحب یہاں موجود ہوتے ہیں۔ رات کو بھی ضرور آتی ہوگی''۔

اس نے اس عورت کے متعلق جو تفصیل بتائی وہ یوں تھی کہ اس کا نام سروری تھا۔ اس کا خاوند فوج میں جمعدار تھا۔ ذہن میں رکھیں کہ انڈین آرمی میں جو جمعدار کا عہدہ تھا وہ پاکستان آرمی میں نائب صوبیدار کہلاتا ہے۔ میں لفظ جمعدار ہی استعمال کروں گا۔ مزارعہ نے بتایا کہ سروری بہت ہی خوبصورت عورت ہے اور اس کی چال ڈھال اور صحت وغیرہ اتنی اچھی ہے کہ اپنی اصلی عمر سے بہت کم کی لگتی ہے۔ مزارعہ نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اڑتی اڑتی سنی ہے کہ مقتول اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس عورت سروری کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، اور یہ بھی سنا کہ سروری اپنے خاوند سے طلاق لے رہی تھی۔

اس مزارعہ سے میں نے اور بھی بہت کچھ پوچھا اور اس کے سینے سے کوئی خاص

بات نکالنے کی کوشش کی لیکن اور کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی اور مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔

مزارعہ کو باہر بھیج کر میں نے مقتول کے بڑے بیٹے فیروز کو بلایا۔

فیروز کو میں نے بڑی غور سے دیکھا۔ پہلی بات یہ دیکھی کہ اسے باپ کی موت کا اتنا غم نہیں لگتا تھا جتنا ہونا چاہئے تھے۔ اگر باپ طبعی موت مرتا تو اور بات تھی۔ اس کا باپ قتل ہوا تھا۔ میں نے ایسے بیٹے دیکھے ہیں جو انتقام اور خون کا بدلہ خون کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے لیکن یہ بیٹا کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بات شروع کی ہی تھی کہ وہ میری سنے بغیر بول پڑا۔

''میرے باپ کی کیا پوچھتے ہو صاحب!'' — فیروز نے اکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا — ''اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ گذشتہ رات نہ ہوتا تو کچھ عرصے بعد ہو جاتا''۔

اس کے انداز اور لب و لہجے سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ قتل کا باعث معلوم ہو جائے گا۔ میں نے فیروز کی حوصلہ افزائی کی اور اسے اکسایا کہ وہ کھل کر اور بے تکلفی کے ساتھ بات کرے۔

اس نے پہلی بات یہ کہی کہ اس کا باپ شریف آدمی نہیں تھا۔ شراب پیتا تھا۔ یہ تو میں نے شراب کی بوتل کمرے میں پڑی دیکھ کر معلوم کر ہی لیا تھا۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ اس کی یاری تھی۔ عادی جوئے باز تھا اور باغ والے مکان میں کبھی کبھی جوئے کی محفل جماتا اور جوئے کا اہتمام بھی کرتا تھا۔ عیاش آدمی تھا۔ بہر حال فیروز نے اپنے باپ کی جو عادتیں اور خصلتیں بتائیں وہ میرے لئے کوئی نئی نہیں تھیں۔ ان بڑے زمینداروں میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی۔ خوش حالی ہو اور طاقت ہو تو یہ لوگ عیاشی نہ کریں تو اور کیا کریں۔

فیروز نے مقتول کی یہ عادات تفصیل سے سنائی تو میں نے اس سے پوچھا کہ سروری کون ہے اور اس کے ساتھ مقتول کے کیا تعلقات تھے۔ میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ اس کا مزارعہ مجھے ان تعلقات کے متعلق بتا چکا ہے۔

فیروز نے کہا کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مقتول اور سروری کی دوستی چار پانچ مہینے ہوئے شروع ہوئی تھی۔ مزارعہ کی طرح فیروز نے بھی بتایا کہ سروری کتنی خوبصورت اور کتنے اچھے قد اور جسم والی عورت ہے۔ اس نے بھی کہا کہ سروری کی عمر بیس سال سے

زیادہ ہو گی کم نہیں لیکن تیس سال سے ایک دن اوپر کی نہیں لگتی۔

''دراصل بات یہ ہے صاحب!'' — فیروز نے کہا — ''کہ سروری ڈھیٹ اور بے غیرت عورت ہے۔ غیرت اور عزت اتار دو تو صحت نے تو اچھا ہونا ہی ہے۔ خوش طبع عورت ہے۔ مذاق اور ہنسی کھیل میں ایسی فحش کلامی کرتی ہے کہ مرد بھی آپس میں کم ہی کرتے ہوں گے۔ اس کا خاوند فوج میں جمعدار ہے۔ شریف آدمی ہے۔ آج کل چھٹی آیا ہوا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ سروری نے اسے کہہ دیا ہے کہ اسے طلاق دے دے ورنہ وہ کچہری میں جا کر طلاق کی عرضی ڈال دے گی۔ ادھر ہمارے باپ نے ہماری ماں کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے طلاق دے رہا ہے اور وہ گھر جانے کی تیاری کرے۔ ہماری ماں تو صدمے سے چارپائی سے لگ گئی ہے۔ ذرا خیال کرو صاحب! ہمارے باپ کی عمر ساٹھ کے قریب ہو رہی تھی اور ہماری ماں اس سے تین چار سال ہی چھوٹی تھی یعنی بڑھاپا...... اس بڑھاپے میں ہمارے باپ نے عشق بازی شروع کی اور اپنا گھر اجاڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا''۔

''تم نے باپ کو روکا نہیں؟'' — میں نے پوچھا — ''آخر تم اس کے جوان بیٹے ہو، باپ کو یہ تو کہہ سکتے تھے کہ اس عمر میں تمہاری ماں کو نہ اجاڑے!''

''بدطینت اور بدزبان شخص تھا'' — فیروز نے جواب دیا — ''میں نے روکا تو مجھے ڈانٹ کر اور گالیاں دے کر چپ کرا دیا۔ میرے چھوٹے بھائی نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی تو اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ ہماری ماں کے ساتھ اس کی بول چال بالکل ہی بند ہو گئی تھی''۔

قتل کا باعث مقتول کا یہی فیصلہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا اور ایک خاوند والی عورت سے شادی کر رہا تھا۔ ایک شک کی بنا پر میں نے فیروز سے پوچھا کہ اس کی ماں کے بھائی ہوں گے۔ فیروز نے بتایا کہ اس کا ایک ہی ماموں ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ میں اب اس شک پر سوچنے لگا کہ مقتول کو اس کی بیوی نے قتل کروایا ہو گا۔ بیوی نے سوچا ہو گا کہ طلاق ملنے کی بجائے اسے بیوگی ملے تو یہ بہتر ہو گی۔

دوسرا شک سروری کے خاوند پر تھا۔ اس کی بیوی اس سے طلاق مانگ رہی تھی اور وجہ یہ کہ وہ مقتول کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کوئی خاوند یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جمعدار نے سوچا ہو گا کہ اس شخص کو ہی ختم کر دو جس کے پیچھے بیوی اس سے طلاق طلب کر رہی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ فیروز بڑی خوداعتمادی سے بات کرتا تھا اور اس میں دانشمندی بھی تھی۔ وہ ذرا سی بھی جھجک اور کمتری محسوس نہیں کر رہا تھا کہ تھانے دار کے ساتھ بات کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ یہی چند ایک باتیں نہیں ہوئی تھیں، بہت باتیں ہوئی تھیں جو میں تمام کی تمام تو یہاں لکھ نہیں سکتا۔ کئی موقعوں پر اس نے مجھے ٹوک دیا اور میری رائے پر اپنی رائے مسلط کی۔ اس کا یہ انداز مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ایسے آدمی جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سروری کے اس جمعدار خاوند کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ قتل کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟

''نہیں!'' ـــــ فیروز نے جواب دیا ـــــ ''اس شخص میں اتنی ہمت نہیں۔ میرے باپ کی بجائے کوئی نہایت معمولی اور بھکاری سا آدمی ہوتا تو بھی یہ جمعدار اس پر ہاتھ نہ اٹھاتا''۔

''وجہ؟'' ـــــ میں نے پوچھا ـــــ ''کیا اس شخص میں کوئی خاص کمزوری ہے؟''

''اکیلا آدمی ہے'' ـــــ فیروز نے جواب دیا ـــــ ''اور اصل بات یہ ہے کہ بالکل مولوی آدمی ہے۔ اس کی ہر بات میں مذہب ہوتا ہے اور کوئی بھی بات کرے تو قرآن مجید کے حوالے ضرور دیتا ہے اور حدیثیں سناتا ہے اور اس طرح پتہ چلتا ہے جیسے اس کی زندگی کا مقصد صرف نماز روزے کی پابندی ہے...... مجھے اس شخص پر ذرا سا بھی شک نہیں''۔

فیروز کے متعلق مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ تفتیش میں میری رہنمائی کرے گا۔ ابھی تو اس کے ساتھ ابتدائی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور نمبردار کو بلایا۔

دل کا معاملہ

نمبردار نے جو بیان دیا وہ فیروز کی بتائی ہوئی باتوں کی تائید تھی۔ نمبردار نے ان میں کچھ اضافہ کیا۔ اس طرح مقتول کا سارا کیریکٹر کھل کر میرے سامنے آ گیا۔ نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ مقتول اپنی ان تمام بدکاریوں کے باوجود گاؤں میں اور جہاں جہاں تک اس کے تعلقات تھے، اپنا وقار قائم رکھتا تھا۔ اپنے گاؤں میں لوگ اس کی عزت بھی کرتے تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ عزت اس لئے کہ کسی غریب اور نادار آدمی یا عورت کو مدد امداد کی ضرورت ہوتی تو وہ فوراً مدد کو پہنچتا اور حاجت مند کی مشکل آسان کر دیتا تھا اور اس کا ذریعہ تھا

کہ لوگ اس کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی طاقت سے آگاہ تھے۔

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ دیہاتی علاقے میں خصوصاً اور کسی حد تک شہروں میں لوگ کسی کی شرافت سے اتنے مرعوب نہیں ہوتے جتنے اس کی غنڈہ گردی کی طاقت سے ہوتے ہیں۔ نمبردار نے بتایا کہ سروری پہلے اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ جمعدار کی ٹرانسفر جس چھاؤنی میں بھی ہوتی وہ سروری اور بچوں کو وہاں رکھتا تھا لیکن ایک سال سے سروری گاؤں آ گئی تھی۔ ان لوگوں کی گاؤں میں زمین تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی کہ سال بھر اناج دے سکتی لیکن جمعدار کی تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی اور پوزیشن بھی تھی۔

چار پانچ مہینوں سے سروری کی دوستی مقتول کے ساتھ ہو گئی تھی اور ان دونوں نے اپنے ان تعلقات پر پردہ ڈالنے کی نہ کوشش کی تھی نہ ضرورت سمجھی تھی۔ پھر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مقتول اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے اور سروری اپنے خاوند سے طلاق لے رہی ہے۔ نمبردار نے ایک نئی بات یہ بتائی کہ اسے یقین تو نہیں شک ہے کہ مقتول کا تعلق کسی ڈاکو پارٹی کے ساتھ بھی تھا اور یہ ڈاکو مال مقتول کے گھر چھپا کر رکھتے تھے اور جب گرفتاری کا خطرہ ٹل جاتا تھا تو وہاں سے اٹھاتے اور تقسیم کر لیتے تھے۔

سروری کے متعلق پوچھا تو نمبردار نے وہی رائے دی جو فیروز دے چکا تھا۔ ڈھیٹ اور بے غیرت عورت تھی اس لئے اس نے بڑی دلیری سے مقتول کے ساتھ دوستی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے سروری کے خاوند پر شک کا اظہار کیا۔ فیروز کی طرح نمبردار نے بھی میرے شک کو رد کر دیا اور کہا کہ وہ بہت ہی نیک اور خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے۔ نمبردار نے بتایا کہ آج کل یہ جمعدار چھٹی آیا ہوا ہے۔ اس کی چھٹی ایک یا ڈیڑھ مہینہ تھی۔ اسے جب بیوی نے کہا کہ اسے طلاق دے دے تو جمعدار نمبردار کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ مقتول کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔

نمبردار سروری کے اخلاق سے واقف تھا لیکن یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوا۔ حالانکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سروری کے مقتول کے ساتھ تعلقات ہیں۔ جمعدار کا مطلب یہ تھا کہ نمبردار اس کی بیوی کو کچھ سمجھائے اور پھر مقتول سے بھی کہا جائے کہ وہ عقل سے کام لے اور اپنی عمر اور گھرانے کو دیکھے اور کسی اور کا گھر بھی برباد نہ کرے۔

نمبردار نے یہ اہتمام کیا کہ ذیلدار اور گاؤں کے دو اور معززین کے ساتھ بات کی

اور انہیں جمعدار کو ساتھ لے کر مقتول کے گھر گئے۔ نمبردار نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے حیرت سے کہا کہ جمعدار نے اس طرح تحمل اور بردباری سے بات کی جیسے وہ کسی اور کے متعلق بات کر رہا ہو۔ اس نے نہ تو شکایت کی نہ غصے کا اظہار کیا نہ ہی اس کے لہجے میں احتجاج کی جھلک تھی۔ ان سب نے باری باری مقتول کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس فتور کو ذہن سے نکال دے اور اپنی اور جمعدار کی اولاد کا خیال کرے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خدا سے ڈرے۔

مقتول سنتا رہا اور اس نے کسی کے ساتھ کوئی دلیل بازی نہ کی۔ آخر میں اس نے صرف یہ الفاظ کہے——''یہ دل کا معاملہ ہے''۔

اس نے ان سب کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا اور جمعدار سے یہ کہا کہ جمعدار صاحب، آپ اگر اپنی بیوی کو منوالیں تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

سب مایوس ہو کر مقتول کے گھر سے نکل آئے اور باہر آ کر پھر آپس میں تبادلہ خیالات کر کے یہ فیصلہ کیا کہ جمعدار کی بیوی کے ساتھ بات کی جائے لیکن جمعدار نے انہیں روک دیا۔ اس نے روکنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کی بیوی پوری طرح ڈھیٹ اور بے حیا ہو چکی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ ان معززین کو اس کے سامنے لے جا کر شرمسار کروائے۔ اس طرح یہ بات بن نہ سکی اور معاملہ یہیں پر ختم کر دیا گیا۔ جمعدار نے یہ الفاظ کہے کہ اللہ پر چھوڑ دو، صحیح فیصلے اسی کی درگاہ میں ہوتے ہیں۔

یہ بات سن کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ مقتول کس قدر ڈھیٹ اور دلیر آدمی تھا۔ دیہات میں بہت کچھ ہوتا ہے، قتل اور خون خرابے ذرا ذرا سی باتوں پر ہو جاتے ہیں اور ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جو شہریوں کو حیران کر دیتے ہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ گاؤں کے معززین کسی کو کسی بات سے منع کریں تو وہ اس طرح ان کے ساتھ سلوک کرے جس طرح مقتول نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ وقتی طور پر معززین کا بھرم رکھا لیا جاتا تھا لیکن مقتول نے وہ بھی نہ رکھا۔ مقتول کے بیٹے فیروز نے غالباً باپ کی اس فطرت کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے باپ کا یہی انجام ہونا تھا۔

پھر میں جمعدار کے کردار پر کچھ حیران ہوا۔ حیران ہونا تو نہیں چاہئے تھا لیکن یہ خیال آیا کہ انگریزوں کے دور کی ہندوستانی فوج کے جمعدار، صوبیدار اور صوبیدار میجر گاؤں میں آتے تو کسی کو پلے باندھتے ہی نہیں تھے۔ فوجی نوکری میں وہ انگریزوں کی اتنی زیادہ خوشامد

کیا کرتے تھے جس کے متعلق محاورہ ہے کہ جوتیاں چاٹتے تھے۔ طبیعت کے اکھڑ اور سخت مزاج ہوتے تھے۔ اس جمعدار کے متعلق میں نے سنا کہ وہ اتنا حلیم طبع ہے تو حیرت ہوئی تھی۔ اگر وہ جمعدار نہ ہوتا تو میں حیران بھی نہ ہوتا۔ ایسے آدمی دیہاتی معاشرے میں اور شہری معاشرے میں بھی نظر آ جاتے تھے جو ہر کام اللہ پر چھوڑ دیتے اور عفو و درگزر ان کا اصول نہیں بلکہ ایمان ہوتا تھا۔ آج بھی ایسے اللہ کے بندے نظر آ جاتے ہیں جو برے انسان کو اپنی زبان سے برا نہیں کہتے اور نیک انسان کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ میں نے ایسے کئی آدمی دیکھے تھے۔ وہ کسی کمتر سے کمتر آدمی سے ملتے تو ان کا سلام یوں ہوتا تھا——''السلام علیکم، بسم اللہ بسم اللہ''——اور وہ بڑے احترام سے اس آدمی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا کرتے تھے۔ میں نے اس جمعدار کو پوچھ گچھ کے لیے بلانا ہی تھا لیکن دل میں اس سے ملنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔ ایسے لوگ مجھے بہت ہی اچھے لگا کرتے تھے۔

نمبردار نے بتایا کہ سروری مال کھانے والی عورت ہے اور اسے ریشمی اور قیمتی کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی اور وہ بھی بدنام عورت تھی۔ ڈیڑھ دو سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ البتہ اس کا باپ شریف آدمی تھا اور وہ بڑھاپے میں چارپائی پر ہی پڑا رہتا تھا۔ اس نے اس بیٹی کو دل سے ہی اتار دیا تھا۔ سروری کا کوئی بھائی نہیں تھا دو بہنیں تھیں جو اپنے اپنے سسرال میں آباد تھیں۔ ان کے اخلاق کے متعلق پتہ چلا کہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ماں کا سارا اثر سروری نے ہی وصول کیا تھا۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نمبردار نے بتایا کہ سروری کی ایک بیٹی ہے جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے اور وہ ماں ہی کی طرح خوبصورت لڑکی ہے۔ اس سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ ایک کی عمر بارہ سال اور دوسرے کی آٹھ سال تھی۔ آخر میں میرے پوچھنے پر نمبردار نے مقتول کے دونوں بیٹوں کے اخلاق وغیرہ کی یہ رپورٹ دی کہ بڑا بیٹا فیروز بھی باپ کی طرح شریف آدمی نہیں لیکن وہ باپ کی طرح ذلت اور گھٹیا پن میں نہیں گرا تھا۔ ہوشیار تھا اور عقل والا بھی تھا۔ ضرورت پڑتی تو وہ بدمعاشی اور غنڈہ گردی بھی کر لیتا تھا، ویسے وہ ہر کسی کی عزت کرتا اور عزت کرواتا تھا۔ باپ کی طرح اس کا بھی دوستانہ بڑے بدمعاشوں کے ساتھ تھا لیکن اس پر کوئی بھی انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے ان بدمعاشوں کے ساتھ مل کر کوئی بدمعاشی کی ہے۔

وہ جوا بھی کھیلتا تھا شراب بھی پیتا تھا لیکن اوچھوں کی طرح بڑھکیں نہیں مارتا تھا۔

فیروز کے چھوٹے بھائی کا نام منصور تھا۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ خوبصورت جوان تھا اور باپ اور بھائی سے بالکل مختلف۔ اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔ قصبہ قریب ہونے کی وجہ سے اس نے دس جماعتیں پاس کر لی تھیں۔ ہائی سکول صرف قصبے میں تھا۔ نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ دونوں بھائی اپنے باپ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور باپ کے ساتھ ان کی اکثر ان بن رہتی تھی۔

''ایک بات بتاؤ چوہدری!''—— میں نے نمبردار سے پوچھا—— ''تمہارا شک کس پر ہے!''

''ملک جی حضور!''—— نمبردار نے کہا—— ''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہی طلاقوں کا لین دین اور سروری کے ساتھ عشق بازی قتل کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ شخص اپنے باغ والے مکان میں بڑے پیمانے پر جوا کھلواتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے بدمعاش جوئے باز کو اس نے دھوکہ دیا ہو جیسا کہ یہ لوگ جواریوں کو دیا کرتے تھے اور اس جواری نے اس کا معاملہ ہی صاف کر دیا۔ مقتول کی درپردہ جو زندگی گزر رہی تھی وہ ایسی تھی جو دشمنی پیدا کرتی ہے۔ معلوم نہیں کس کے ساتھ اس نے دھوکہ فریب کیا یا کس کو نقصان پہنچایا اور اگلے نے قتل کر کے انتقام لے لیا۔ صرف یہ کہنا کہ یہ شخص سروری کے پیچھے قتل ہوا ہے، میں نہیں مانوں گا''۔

نمبردار کی رائے مجھے کچھ ٹھیک معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے کچھ خفیہ ہدایات دیں اور کہا کہ وہ چلا جائے اور جمعدار کو میرے پاس بھیج دے۔

بزدل یا بے غیرت

خوش پوش اور خوش وضع جمعدار اندر آیا تو میں اس کی تعظیم کو اٹھا اور اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس کا قد کم و بیش چھ فٹ تھا اور جسم بہت ہی اچھا تھا۔ اسے بٹھایا، حال احوال پوچھا اور دوستانہ انداز سے ویسے ہی ایک دو باتیں کیں۔ بے شک اس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ اللہ سے ڈرنے والا نیک آدمی ہے اس لئے اس پر قتل کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میں پولیس آفیسر تھا اور اسے ایک پولیس آفیسر کی نظروں سے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس پر قتل کا شک کیا جا سکتا تھا۔ وہ آخر انسان تھا فرشتہ نہیں تھا۔

''آپ کے گھر میں کیا ہو رہا ہے جمعدار صاحب!''—— میں نے پوچھا—— ''کیا آپ کی بیوی واقعی آپ سے طلاق مانگ رہی ہے؟''

''یہ ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب!''—— اس نے جواب دیا—— ''وہ طلاق اس لئے مانگ رہی تھی کہ مقتول کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن میں اسے طلاق نہیں دے رہا تھا''۔

''لیکن اب تو آپ اسے گھر میں نہیں رکھنا چاہیں گے!''—— میں نے کہا—— ''ایسی بے وفا اور بے حیا بیوی کو کون گھر میں رکھتا ہے!''

''نہیں انسپکٹر صاحب!''—— جمعدار نے کہا—— ''میں اسے اب بھی طلاق نہیں دوں گا۔ وہ گمراہ ہو گئی تھی۔ اللہ کا حکم ہے کہ جو گمراہ ہو جائے اسے راہ راست پر لایا جائے۔ سزا اور جزا اللہ کے اختیار میں ہے۔ بندہ اللہ کے قانون اور فیصلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو یہ گناہ ہے''۔

میں نے اس کے ذہن اور دل سے بھید نکلوانے کے لئے مقتول کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا کہ اچھا ہوا وہ مارا گیا ہے۔ قانون میرے ہاتھ میں ہوتا تو اسے اپنے ہاتھوں گولی مارتا۔

''نہیں انسپکٹر صاحب!''—— اس نے کہا—— ''کسی کی موت پر خوش نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ دشمن ہی ہو''۔

''قانون میرے ہاتھ میں نہیں جمعدار صاحب!''—— میں نے کہا—— ''اگر وہ قتل نہ ہو جاتا تو میں خود اسے گولی مارتا''۔

اس نے پھر میری بات کو ناپسند کیا اور ساتھ ہی ایک حدیث سنا دی پھر اس کے ساتھ اس مسئلے پر جتنی باتیں ہوئیں وہ ان پر مذہب کا رنگ چڑھاتا چلا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اگر بیوی کو طلاق دے دیتا تو وہ بہت ہی ذلیل و خوار ہوتی۔ مقتول کے متعلق اس نے کہا کہ زبردست بدمعاش اور بدکار آدمی تھا۔ شادی کی بجائے سروری کو کچھ عرصہ داشتہ بنائے رکھتا پھر اسے کسی طرف چلا دیتا۔ جمعدار نے کہا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دیتا تو یہ اس کا گناہ ہوتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک شیطان صفت آدمی نے سروری کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔

میں اس کے اخلاق سے متاثر تو ضرور ہوا لیکن میری نگاہ میں وہ ایک مشتبہ تھا۔ اس کا انداز اور رویہ ایسا تھا جیسے اسے احساس ہی نہیں کہ میں اسے مشتبہ سمجھ رہا ہوں۔ اس کی باتوں کا رنگ دوستانہ اور بے تکلفانہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے مایوس نہ کیا اور ایسا اشارہ بھی نہ دیا کہ میں تفتیش کر رہا ہوں اور اس پر مجھے شبہ ہے۔

میرے صبر وتحمل نے مجھے یہ فائدہ پہنچایا کہ جمعدار نے باتوں باتوں میں ایک اور انکشاف کر دیا۔ وہ یہ تھا کہ اس کی بیوی نے اسے ایک روز بتایا کہ ان کی بیٹی جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی مقتول کے چھوٹے بیٹے منصور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ جمعدار نے کہا کہ سروری نے اسے یہ بات ایسے انداز سے بتائی تھی جیسے وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ مقتول کا گھر جنت جیسا ہے جہاں وہ خود بھی جانے کو بے تاب ہے اور اس کی بیٹی بھی اسی گھر میں جانا چاہتی ہے۔

جمعدار کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے سروری سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو کبھی ایسے بدکار گھرانے میں نہیں جانے دے گا۔ سروری کو وہ پہلے ہی بہت سمجھا چکا تھا کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی تباہ نہ کرے، سروری نے اپنی بیٹی کی بات کی تو پھر جمعدار نے اسے بٹھا کر پند ونصیحت کی لیکن سروری اخلاق کی تمام حدود پھلانگ گئی تھی اور اب اس کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔

جمعدار نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بیوی سروری نے اسے بتایا تھا کہ مقتول نے ان کی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

جمعدار کے ساتھ میں نے بہت وقت لگایا لیکن آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شخص قتل جیسی سنگین واردات نہ کر سکتا ہے نہ کروانے کے قابل ہے۔ میں نے تو دو تین مرتبہ شدت سے محسوس کیا کہ یہ شخص اگر ذہنی مریض نہیں تو اس کی ذہنی حالت نارمل بھی نہیں۔ آج کل آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی نے کوئی نا روا بات کہہ دی تو مولویوں نے شور مچا دیا اور فتویٰ دے دیا کہ یہ شخص واجب القتل ہے۔ جمعدار بھی اپنے اوپر مذہبی جنون طاری کئے ہوئے تھا لیکن جو انسان واقعی واجب القتل تھا اسے وہ بخش رہا تھا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔

رات ہو گئی تھی، مقتول کی لاش گاؤں میں آ گئی تھی اور پوسٹمارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ پوسٹ مارٹم قصبے میں سرکاری ہسپتال میں ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر نے موت کا باعث گلا گھونٹنا ہی لکھا تھا اور موت کا وقت رات دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان لکھا تھا۔

نمبردار نے بڑے پر تکلف کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو اندر بلا لیا اور ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا...... میں نے مقتول کے بڑے بیٹے فیروز کو شامل تفتیش کیا تھا۔ اب میں ضروری سمجھنے لگا کہ اس کے چھوٹے بیٹے منصور سے بھی پوچھ گچھ کی جائے۔ یہ میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ نمبردار نے بتایا تھا کہ بڑا بیٹا اپنے

باپ کی لائن پر چلا گیا تھا اور چھوٹا بیٹا اس سے بالکل مختلف تھا۔ چھوٹے بیٹے میں کوئی بری عادت نہیں تھی۔ میرے ذہن میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ مقتول اور اس کے بڑے بیٹے کے درمیان کوئی چپقلش یا اختلاف ہو اور وہ ایک دوسرے کو اچھا نہ سمجھتے ہوں۔ اس شک کی بنا پر میں نے نمبردار سے کہا کہ مقتول کا چھوٹا بیٹا لاش کے ساتھ پوسٹمارٹم کے لئے چلا گیا تھا۔ لاش واپس آ گئی ہے اور وہ بھی واپس آ گیا ہو گا۔ اسے ابھی میرے پاس بھیج دے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک خوب رو جوان میرے پاس آیا۔ ہم کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور میں اکیلا بیٹھا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس جوان کا چہرہ دیکھا۔ گھبراہٹ اور خوف صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اس کے باپ کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا۔ پھر اس سے پوچھا کہ اس کا کیا خیال ہے اس کے باپ کو کس نے قتل کیا ہے۔

میرے اس سوال پر وہ پہلے سے زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا اور اس کی بے چینی صاف نظر آنے لگی۔ میں نے بڑے پیار سے اس کی حوصلہ افزائی کی اور بتایا کہ مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں لیکن میں اس کی رائے جاننا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے کہ میں کیا بتا سکتا ہوں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔

میں نے اس سے سوالات کے ذریعے باتیں پوچھنی شروع کیں لیکن ہر سوال کا جواب دیتے اس کی زبان ہکلانے لگتی تھی اور وہ گھونٹ سا نگل کر دائیں بائیں دیکھنے لگتا تھا۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اتنے رعب دار باپ کا بیٹا اس قدر کمزور دل اور کم حوصلہ ہو گا۔ مجھے کہنا پڑا کہ وہ کیوں اتنا زیادہ گھبرا رہا ہے اور میں نے یہ بھی کہا کہ باپ کی موت کا صدمہ تو تمہیں ہے لیکن تم جیسے نوجوان بیٹے تو بھڑک بھڑک کر بات کیا کرتے ہیں۔ میری اس بات کا اس پر یہ اثر ہوا کہ وہ تو جیسے رونے پر آ گیا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ اس کا بھائی تو بڑی ہی جرأت مندی اور خود اعتمادی سے بات کرتا ہے لیکن وہ بالکل ہی بزدل نکلا۔ مجھے توقع تھی کہ میری اس بات کا کچھ اچھا اثر ہو گا لیکن اثر الٹا ہی ہوا۔

میں نے اس سے جو پوچھ گچھ کی وہ میں تفصیل سے نہیں سناؤں گا کیونکہ اس سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں اس کے بڑے بھائی کے حوالے سے کوئی بات پوچھتا تھا وہ کہہ دیتا تھا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے اور کبھی اس جواب کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ وہی بہتر جانتا ہے، ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ مختصر یہ کہ اس خوبرو نوجوان نے مجھے خلاف توقع بالکل ہی متاثر

نہ کیا۔ میں نے اس کے دل سے اپنا خوف اتارنے کی بھرپور کوشش کر ڈالی تھی۔ اب میں نے یہ رائے قائم کرلی کہ یہ بودا سا لڑکا ہے اور یہی اس کا عام سٹائل ہے۔

اگر سروری کی بیٹی اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی تو اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا پھر بھی میں نے منصور سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ اس نے عجیب احمقانہ طریقے سے سر ہلایا اور آہستہ سے کہا کہ یہ درست ہے لیکن اس کا باپ نہیں مانتا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے رک رک کر اور کچھ ہکلاتے ہوئے یہ جواب دیا کہ اس کا باپ لڑکی کی ماں سے شادی کر رہا تھا اس لئے باپ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سروری کی بیٹی کے ساتھ شادی کرے۔

میں نے اسے اٹھا دیا اور مجھے کچھ افسوس ہوا کہ اتنا وقت ضائع کیا ہے۔

اگر مجھے صحیح یاد ہے تو رات کے نو بج چکے تھے۔ میں نے سردری کو بھی بلانا تھا اور مقتول کی بیوی کو بھی۔ بہتر یہ سمجھا کہ ذیلدار اور ان دو معززین کو بلالوں جو نمبردار کے ساتھ مقتول کے پاس گئے تھے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ ان لوگوں سے پیشہ ور اور تجربہ کار مخبروں کی نسبت زیادہ قیمتی باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ لوگ تھانے داروں کو خوش رکھنے کے لئے گھر گھر کی خبر رکھتے تھے اور ٹوہ مین لگے رہتے تھے کہ انہیں دوسروں کے راز اور اندر خانے کی باتیں معلوم ہو جائیں پھر وہ تھانے دار کے پاس جا کر یہ خبریں پہنچاتے اور چغل خوری کرتے تھے۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ ان تینوں کو بلائے اور سب سے پہلے ذیلدار کو میرے پاس بھیجے۔ معلوم ہوا کہ ذیلدار پہلے ہی باہر آیا بیٹھا ہے۔

ذیلدار میرے سامنے آیا۔ خوشامدی پن کا یہ عالم کہ رکوع میں چلا گیا اور دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر مجھے سلام کیا پھر آگے بڑھا اور میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا پھر میرے ہاتھ کو چوما اور میرا ہاتھ بڑی احتیاط سے میری ران پر رکھ دیا جیسے یہ بے احتیاطی سے رکھا تو گر کر ٹوٹ جائے گا۔ یہ شخص ادھیڑ عمری سے کچھ اوپر چلا گیا تھا۔

اتفاق سے یہ مقتول کی برادری کا ہی آدمی تھا اور کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ اس نے مقتول کے متعلق تقریباً وہی رپوٹ دی جو نمبردار دے چکا تھا۔ چونکہ یہ مقتول کے رشتہ داروں میں سے تھا اس لئے اس نے مقتول کے اندر خانے کی بھی کچھ باتیں بتائیں۔ مثلاً ایک بات یہ کہ مقتول کے دونوں بیٹے، فیروز اور منصور ماں کی طرف داری میں ہو گئے تھے

اور باپ کے دشمن بن گئے تھے۔ باپ کے ساتھ دونوں بیٹوں کی اور ماں کی بول چال بند ہو چکی تھی۔......

فیروز سے تو مقتول کنی کتراتا تھا لیکن منصور کو اس نے دو تین بار مارا پیٹا بھی تھا۔

''اگر ایسی بات تھی'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''تو کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ماں نے بیٹوں کو بھڑکا کر تیار کرلیا ہو کہ پیشتر اس کے کہ یہ شخص اس بے حیا سروری کے ساتھ شادی کرے، باپ کو دونوں بیٹے دنیا کے تختے سے اٹھا دیں؟''

''نہیں حضور!'' ـــــ بوڑھے ذیلدار نے جواب دیا ـــــ ''ماں کو بیٹوں کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ عورت طلاق قبول کر لیتی لیکن یہ کبھی برداشت نہ کر سکتی کہ اس کے بیٹے باپ کے قتل میں پکڑے گئے ہیں اور انہیں سزائے موت ہو جائے گی''۔

ذیلدار نے بتایا کہ مقتول کے دوستانہ تعلقات ایک ڈاکو کے ساتھ تھے۔ نمبردار نے یہ بات شک میں بتائی تھی لیکن ذیلدار نے یہی بات پورے یقین کے ساتھ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اس ڈاکو کو دو ساتھیوں سمیت سات سات سال سزائے قید ہوئی ہے اور انہوں نے سزا کا ابھی ایک ہی سال پورا کیا ہے۔

ذیلدار نے یہ بات بھی پورے یقین کے ساتھ بتائی کہ یہ ڈاکو ڈکیتی کا مال مقتول کے گھر چھپا کر رکھتا تھا اور موزوں وقت پر وہاں سے لے جاتا اور مقتول کو اس کا حصہ دے دیتا تھا۔

مقتول کی بیوی کا ایک بھائی بھی تھا جو خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ میں ذیلدار سے اس کے متعلق پوچھا کہ اس کا ردعمل کیا ہے۔ ذیلدار نے بتایا کہ وہ قتل اور خون خرابے کی بات سوچنے والا آدمی نہیں۔

ذیلدار کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے مقتول کی بیوی کو اس کے دونوں بیٹوں کو کہا تھا کہ جب مقتول بیوی کو طلاق دے گا تو عدالت میں جائیں گے اور مقتول کے خلاف مقدمہ دائر کریں گے۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ مقتول سے جائداد کا حصہ وصول کیا جائے گا۔

مجھے اس مسئلے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مقتول کی جائداد کا حصہ کسے ملتا ہے اور کیا ہوتا ہے، میری دلچسپی تو یہ تھی کہ کوئی سراغ مل جائے اور میں اس کے قاتل تک پہنچ سکوں ذیلدار سے جمعدار کے متعلق پوچھا اور اسے کہا کہ مجھے صرف یہ بتائے کہ جمعدار پر قتل کا

شک کیا جا سکتا ہے یا نہیں! اس نے کہا کہ جمعدار کو ذہن سے نکال دوں میں جمعدار کو شریف اور نیک انسان کہتا تھا لیکن ذیلدار نے اسے بے وقوف، بزدل اور بے غیرت کہا اور یہ بھی کہا کہ اس نے خود اپنی بیوی کو سر چڑھایا تھا اور وہ اتنی آزاد ہوگئی کہ اس کے ہاتھ سے ہی نکل گئی۔

میں نے مقتول کے چھوٹے بیٹے منصور کے متعلق بات کی اور کہا کہ میرے پاس آ کر اس کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ میں نے اسے ڈرپوک اور بزدل کہا لیکن ذیلدار نے میری اس رائے پر یقین نہ کیا۔

اس نے کہا کہ بے شک بڑا بھائی بدمعاشی کی طرف چلا گیا ہے لیکن جو دلیری اور غیرت اس چھوٹے میں ہے بڑے میں نہیں۔ ذیلدار حیران ہوتا تھا کہ منصور نے میرے سامنے ایسی کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کیوں کیا۔

اس مسئلے پر بات کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں نے ویسے ہی ذکر چھیڑ دیا کہ سروری کی بیٹی منصور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن مقتول نے اجازت نہیں دی تھی...... مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ابھی بات کی ہی تھی کہ ذیلدار نے بولنا شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ یہ بات باہر شاید کسی اور کو معلوم نہیں۔ سروری کی بیٹی جس کا نام فرخندہ ہے منصور کو پسند کرتی اور منصور اسے پسند کرتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کی آپس میں خفیہ ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں یا نہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ منصور نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ سروری کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو ماں نے مقتول کو بتایا۔

مقتول نے انکار کر دیا لیکن بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ منصور نے ضد شروع کر دی تو باپ نے اسے دو دفعہ مارا پیٹا۔ اس مسئلے پر مقتول کے گھر میں اچھا خاصا فساد بھی ہوا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ منصور نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو ساتھ لے کر گھر سے بھاگ جائے گا۔

ذیلدار نے یہ بھی بتایا کہ منصور نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ کسی دن اس کے باپ کا گلا گھونٹ دوں گا۔

یہ بات منصور کی ماں نے ذیلدار کو خود بتائی تھی۔ ذیلدار نے منصور کو سمجھایا تھا کہ وہ ایسی ضد چھوڑ دے اور یہ سوچے کہ فرخندہ بدنام ماں کی بیٹی ہے۔

ذیلدار بتاتا تھا کہ منصور ایک تو پکا ارادہ کر چکا تھا کہ فرخندہ کے ساتھ ہی شادی کرے

گا اور اپنے باپ کا تو وہ دشمن ہی ہو گیا تھا۔ اس بات پر بھی باپ نے منصور کو مارا پیٹا تھا۔ ذیلدار نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے مقتول سے کہا تھا کہ اب بیٹے پر ہاتھ اٹھانا چھوڑ دے، یہ اب جوان ہو گیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹا بھی ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ مقتول نے کہا تھا کہ اس نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو وہ بیٹے کو جان سے مار ڈالے گا۔ باپ کی یہ بات بیٹے کے کانوں میں پڑی تو بیٹے نے ماں سے کہا تھا کہ اب دیکھنا کون کسے مار ڈالتا ہے۔

ذیلدار کی اس بات پر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہی منصور میرے پاس بہت دیر بیٹھا رہا تھا اور میں نے اس میں ذرا جتنی بھی دلیری یا مردانگی نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال یہ بات میرے لئے دلچسپ تھی لیکن تفتیش میں میری مدد نہیں کر سکتی تھی۔ ذیلدار سے چند اور باتیں ہوئیں اور اسے باہر بھیج دیا پھر میں نے ایک معزز آدمی کو اپنے پاس بلایا۔

سروری کی خدا پر طنز

یہ معزز آدمی مجھے دوسروں سے کچھ بہتر لگا۔ اس کے بولنے کا انداز متاثر کرتا تھا۔ اس کا نام مجھے یاد ہے اور میرے پاس لکھا ہوا بھی ہے۔ نام ملک فیاض تھا اور پتہ چلا کہ اس کا شمار بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس طرح بات کی جیسے مجھے یہ یقین تھا کہ مقتول کے قتل کا باعث یہی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے اور سروری کو طلاق دلوا کر بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ملک فیاض نے کہا کہ میں کسی اور طرف بھی دیکھوں۔ وہ کہتا تھا کہ مقتول کی زندگی ایسی تھی کہ اس کے کوئی اور دشمن بھی ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کوئی اشارہ دے تاکہ میں کسی اور طرف کی سوچوں۔ اس نے وثوق سے کہا کہ وہ بڑے ہی واضح اشارے دے سکتا ہے۔

اس نے اس ڈاکو کا اشارہ دیا جس کا نام ذیلدار نے لیا تھا۔ ملک فیاض نے یقین کے ساتھ بتایا کہ مقتول کا اس کے ساتھ بڑا گہرا کاروباری دوستانہ تھا۔

اس ڈاکو کو تقریباً ایک سال پہلے ایک ڈکیتی کے جرم میں سات سال سزائے قید ہوگئی تھی اور اس کے تین ساتھی بھی پکڑے گئے تھے اور جیل میں بند تھے۔

اس ڈاکو کا ایک ساتھی وعدہ معاف ہ بن گیا تھا۔ اسی وجہ سے کیس ثابت ہوا تھا۔ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کی تھیں۔ صرف ایک ساتھی کی اپیل

منظور ہوئی اور اسے بری کر دیا گیا تھا۔ باقی سب سزا بھگت رہے تھے۔

ملک فیاض نے بتایا کہ تین چار مہینے پہلے یہ ساتھی جو بری ہوا تھا' مقتول کے گھر آیا تھا اور اتفاق سے ملک فیاض نے اسے دیکھا تھا اور اس پر ملک فیاض کو کچھ شک بھی تھا کہ بندہ مشکوک ہے۔ وعدہ معاف گواہ کو بھی ملک فیاض جانتا تھا۔ اسے بھی مقتول کے گھر آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ وعدہ معاف گواہ چند میل دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور ان کا جو ساتھی اپیل میں بری ہو گیا تھا وہ بھی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔

ڈکیتی کا یہ کیس مجھ سے پہلے کا تھا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ابھی سات آٹھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ ملک فیاض کی بات سن کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا جو میرے ساتھ گاؤں میں آیا تھا۔ وہ میرے تھانے کا پرانا آدمی تھا۔

میں نے اس سے اس کیس کے متعلق پوچھا۔ اس نے تصدیق کر دی اور پورا کیس سنا دیا۔ ملک فیاض کی بات صحیح معلوم ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل وعدہ معاف گواہ کو اور بری ہو جانے والے ساتھی کو بھی اچھی جانتا پہچانتا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ کل صبح یہ دونوں آدمی یہاں موجود ہونے چاہئیں۔ ملک فیاض کے بعد ایک اور معزز آدمی باہر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے جو باتیں بتائیں وہ پہلے مجھے معلوم ہو چکی تھیں۔ اسے فارغ کر دیا۔

میں نے خود بھی محسوس کیا کہ تفتیش کو ایک ہی رخ پر ڈال کر میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ ملک فیاض کا یہ اشارہ بڑا ہی قیمتی تھا۔

ڈاکوؤں کے ان دونوں ساتھیوں نے تو صبح آنا تھا' میں نے ارادہ کر لیا کہ آج رات نہ خود سوؤں گا نہ کسی کو سونے دوں گا۔ سروری کو پوچھ گچھ کے لئے بلانا ضروری تھا۔ چونکہ اس کا مقتول کے ساتھ رازدارانہ دوستانہ تھا اس لئے مجھے امید تھی کہ اس سے کوئی اہم اور ضروری بات معلوم ہو جائے گی۔

میں نے نمبردار کو بلا کر کہا کہ سروری کو ابھی میرے پاس لے آئے۔

سروری آ گئی۔ وہ کوئی غیر معمولی یا خاص طور پر حسین عورت تو نہیں تھی لیکن میں اس کی خوبصورتی کا قائل ہو گیا۔ اس کے جسم کی ساخت اور ذرا لمبوترے قد میں ایک خاص کشش تھی جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ میں نے اسے بٹھایا اور پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ مقتول کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔

اس نے بلا جھجک اقرار کیا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا

کہ اپنے خاوند سے اسے آخر کیا شکایت ہے کہ اس نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا...... اس نے کہا کہ بالکل ہی مولوی قسم کا آدمی ہے اور اس کے پاس مذہب کے سوا کوئی بات ہی نہیں اور زندہ دلی تو اس میں ہے ہی نہیں۔ مجھے اس کے ان جذباتی یا جسمانی معاملات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ مقتول کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

میں نے اسے کہا کہ مقتول کا دوستانہ ایک ڈاکو کے ساتھ تھا' کیا وہ جانتی ہے؟......

اس نے جواب دیا کہ مقتول کے اس قسم کے دوستانوں کو وہ بالکل نہیں جانتی وہ یہی جانتی تھی کہ مقتول کوئی شریف اور سیدھا سادہ آدمی نہیں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کس پر قتل کا شک ہے۔

مجھے توقع تو یہ تھی کہ وہ فوراً اپنے خاوند کا نام لے گی لیکن وہ سوچ میں پڑ گئی اور چند سیکنڈ بعد بولی کہ اس نے بہت سوچا ہے لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس نے بھی وہی بات کہی کہ مقتول کی درپردہ زندگی کچھ ایسی تھی کہ اس کے کوئی اور دشمن بھی ہو سکتے تھے۔

''اپنے خاوند کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

وہ یوں ہنس پڑی جیسے ہم دونوں دوست تھے اور بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ اس کی ہنسی میں طنز تھی۔

''اس کے پاس صرف خدا ہے''۔۔۔ سروری نے کہا۔۔۔ ''اس نے اپنا ہر کام خدا پر چھوڑا ہوا ہے اور اپنی غیرت اور مردانگی بھی خدا کے حوالے کر دی ہے۔ اگر آپ کو یہ شک ہے کہ قاتل میرا خاوند ہو گا تو یہ شک دماغ سے نکال دیں۔ اس میں قتل کرنے کی جرأت ہوتی تو نمبردار کو اور دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر چوہدری (مقتول) کے گھر نہ جاتا اور اس کی منت سماجت نہ کرتا اور پھر میرے آگے بار بار ہاتھ نہ جوڑتا اور وعظ نہ سناتا کہ میں باز آ جاؤں۔ اس میں غیرت ہوتی تو چوہدری کو اور مجھے بھی دن دیہاڑے قتل کر دیتا''۔

اس عورت کے ساتھ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ ان میں سے میں نے یہ چند جملے بطور نمونہ پیش کئے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عورت کس قدر بداخلاق اور بے ایمان ہے۔ اس کے دل میں تو خدا کا خوف بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے خاوند میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے لیکن میں نے اس روک دیا اور کہا تمہیں اس دنیا سے محبت ہے اور اپنے لئے اسی دنیا کو جنت بنانا چاہتی ہو لیکن تمہارے خاوند کے دل میں وہ اگلی دنیا ہے جہاں اللہ اپنے بندوں

کے اعمال دیکھ کر جنت اور جہنم کا فیصلہ کرے گا۔ میں نے اسے باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا کہ وہ مال کھانے کی شوقین ہے اور اس شوق پر اس نے اپنی عزت بھی قربان کر دی ہے۔

وہ اس قدر اخلاق سے گر چکی تھی کہ میری اس بات کا صحیح اثر لینے کی بجائے کہنے لگی کہ اس نے کوئی مال نہیں کھایا صرف کچھ زیور اور کچھ کپڑے چوہدری نے تحفے کے طور پر دیئے تھے، بس وہ لئے ہیں۔

میں نے ایسی بات نہ کہی کہ وہ مقتول کے اس انجام سے عبرت حاصل کرے۔ وہ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا اور کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر اس دنیا سے ہی رخصت کر دیا۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا تھا کہ اس عورت کو کچھ سمجھاؤں۔ میں نے اس کے خاوند کو ذہنی طور پر ابنارمل آدمی کہا ہے۔ یہ عورت بھی مجھے ابنارمل معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے کچھ باتیں طنزیہ بھی کہی تھیں اور کچھ پند و نصیحت بھی کی تھی لیکن وہ اس طرح میرے ساتھ بے تکلف ہو گئی جیسے ہماری بڑی پرانی دوستی ہو اور اب ہم ایک بار پھر مل بیٹھے ہوں۔

''کیا مقتول کی بیوی نے تمہیں کبھی کوئی بات نہیں کہی تھی؟'' ـــــ میں نے پوچھا ـــــ ''کوئی دھمکی دی ہو گی!''

اس نے طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا کہ وہ اسے کوئی ایسی بات کہتی یا دھمکی دیتی تو وہ مقتول سے اس کی اتنی پٹائی کراتی کہ مہینہ بھر چارپائی سے نہ اٹھ سکتی۔

اس کے فوراً بعد اس نے اپنی بیٹی فرخندہ کی اس خواہش کا ذکر چھیڑ دیا کہ وہ مقتول کے بیٹے منصور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔

مجھے اس معاملے کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ اس نے اس بات میں میرے لئے کچھ دلچسپی پیدا کر دی۔ منصور کو باپ نے سختی سے اور مار پٹائی سے منع کر دیا تھا کہ آئندہ فرخندہ کا نام نہ لے۔ منصور سروری کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ وہ سروری سے کہتا تھا کہ وہ اس کے باپ سے کہے کہ اسے فرخندہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دے۔ منصور نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے خاوند سے طلاق نہ لے اور اس کے باپ کو دل سے اتار دے۔ سروری نے اسے ہنسی اور پیار سے ٹال دیا۔ منصور نے اسے بتایا کہ باپ نے اسے اس بات پر مارا پیٹا ہے اور منصور کے دل میں آتی ہے کہ اس باپ کا گلا گھونٹ دے یا کسی دن وہ کلہاڑی سے باپ کا سر کھول دے گا۔

سروری نے یہ بھی کہا کہ یہ دونوں بھائی ماں کے طرف دار تھے اور ماں انہیں بھڑکاتی

رہتی تھی۔

اس عورت نے مجھے مایوس ہی کیا' کام کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اسے رخصت کر دیا۔

آدھی رات ہونے کو آئی تھی اور صبح سے دماغ سوزی کر رہا تھا۔ آرام کی اور دماغ کو تازگی کی ضرورت تھی۔ میں سو گیا اور صبح بہت سویرے جاگ اٹھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہا کر اپنے جسم اور دماغ کو ترو تازہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے آگے کتنی کٹھن مہم ہے۔ ابھی تک مجھے قتل کا باعث معلوم نہیں ہوا تھا نہ کوئی سراغ ملا تھا۔ میں پہلے بھی اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ وہ انگریزوں کی حکومت' زمانہ تھا جسے ہم مسلمان کافروں کی حکومت کہا کرتے ہیں لیکن ان کافروں کے دلوں میں قانون کا جو احترام تھا وہ ہم مسلمانوں کے دلوں سے ناپید ہو چکا ہے۔ ہم نے عدل و انصاف کو ایک بھونڈا مذاق بنا رکھا ہے۔ ہم نے قانون کی حکمرانی انگریزوں کے دور میں دیکھی تھی۔ دل میں یہ خواہش تڑپتی ہے کہ مرنے سے پہلے کبھی قانون کی حکمرانی اپنے اس پاک ملک میں دیکھ لوں۔

قانون کی حکمرانی کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ انگریز افسر قتل اور ڈاکہ زنی اور کسی عورت کے اغوا کی وارداتوں کو برداشت نہیں کرتے تھے اور تھانے داروں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ تھانے دار جن بھوت بن جائیں اور ملزموں کو فوراً گرفتار کریں۔

میں ناشتے پر بیٹھا تھا کہ مقتول کا بڑا بیٹا فیروز آ گیا۔ اس نے میرے کان میں کہا کہ باہر دو آدمی ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ کہیں سے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک پرسوں یعنی قتل سے ایک روز پہلے فیروز کے مقتول باپ کے پاس آیا تھا اور جب اس کے باپ کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر باہر نکلا تو فیروز سے ملا اور کہا کہ یار اپنے باپ کو کچھ سمجھاؤ۔ فیروز نے اس سے پوچھا کہ بات کیا ہے لیکن وہ آدمی کچھ غصے کی حالت میں چلا گیا۔

میں نے فیروز سے پوچھا کہ اس نے اپنے باپ کو نہیں بتایا تھا کہ یہ شخص یہ الفاظ کہہ کر گیا ہے؟...... فیروز نے کہا کہ اس نے اپنے باپ کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا تھا اور اب تو اس کے ساتھ بول چال بھی بند ہو گئی تھی۔

میں نے فیروز سے اس شخص کا حلیہ اور لباس پوچھ لیا اور فیروز چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہیڈ کانسٹیبل ڈاکوؤں کے دونوں ساتھیوں کو لے آیا ہے۔ فیروز باہر نکلا ہی تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل آیا اور اس نے بتایا کہ وہ اس شخص کو بھی لے آیا ہے جو ڈکیتی کے کیس میں وعدہ معاف گواہ بنا تھا اور اسے بھی لے آیا ہے جو اپیل میں بری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے وہ حلیہ اور لباس بتایا

جو فیروز مجھے بتا گیا تھا اور کہا کہ پہلے اسے میرے پاس بھیجے۔

وہ شخص آ گیا۔ جوان سال آدمی تھا۔ اسے اپنے سامنے بٹھایا اور پہلی بات یہ پوچھی کہ مقتول کے قتل سے ایک دن پہلے وہ اس کے پاس آیا تھا اور کیا بات ہوئی تھی؟ ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ بتاؤ تم کون ہو اور مقتول کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم مقتول کے ساتھ کوئی جھگڑا کر کے نکلے تھے اور غصے کی حالت میں چلے گئے تھے۔

اس نے کہا کہ وہ سچ بولے گا۔ میں نے کہا کہ سچ نہیں بولو گے تو میں تمہاری ہڈیوں سے سچ نکال لوں گا...... اس نے بلا جھجک بتایا کہ وہ ڈکیتی کے کیس میں وعدہ معاف گواہ تھا۔ اس نے اپنی ڈکیت پارٹی کے سرغنہ کا نام بھی بتایا اور صاف الفاظ میں کہا کہ اس نے اس پارٹی میں شامل ہو کر ڈکیتی کی تین وارداتیں کی تھیں۔ پہلی دو وارداتیں تو ہضم، تیسری میں پکڑے گئے۔ یہ شخص وعدہ معاف گواہ بن کر سزا سے بچ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ مقتول کے پاس کیوں آیا تھا۔ اس نے لمبی بات شروع کر دی۔ میں نے اس سے کچھ سوال پوچھے اور کچھ جرح بھی کی اور اس سے اتنی لمبی گفتگو اور پوچھ گچھ سے جو بات سامنے آئی وہ مختصراً یوں تھی کہ اس پارٹی کا سرغنہ ڈاکو مقتول کا دوست تھا۔ یہ لوگ واردات کرتے تو زیورات اور نقدی مقتول کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ باقی سامان اِدھر اُدھر رکھتے تھے۔ زیورات کچھ عرصے بعد کہیں دور جا کر بیچ ڈالتے اور رقم تقسیم کر لیتے تھے اور اس میں مقتول کا حصہ بھی ہوتا تھا۔

ڈکیتی کا مال اور مقتول

وعدہ معاف گواہ نے پچھلی باتیں سنا کر بتایا کہ اب یوں ہوا کہ اس واردات میں جس میں وہ پکڑے گئے تھے، جو مال ہاتھ آیا اس میں زیورات زیادہ تھے اور کچھ نقد رقم بھی تھی۔ زیورات میں کچھ چیزیں بڑی تھیں مثلاً متعدد لڑیوں کے دو تین ہار تھے اور ایسی ہی دوسری ایک دو چیزیں تھیں۔ جنہیں کچھ عرصے کے لئے چھپا کر رکھنا تھا۔ زیورات کی دوسری چیزیں ڈاکو کے ایک اور ساتھی کے گھر میں رکھی گئیں اور بڑی چیزیں ڈاکوؤں کے سرغنہ نے مقتول کے گھر لا رکھیں۔ ان کے ساتھ کچھ نقدی بھی تھی۔ مقتول نے یہ مال اپنے ہاں چھپا کر رکھ لیا۔

جس علاقے میں یہ واردات ہوئی وہ میرے ہی تھانے کا علاقہ تھا اور اس وقت ایک

ہندو راجپوت ایس ایچ او تھا۔ بڑا تیز اور ذہین آدمی تھا، اس نے سراغ پا لیا اور پارٹی کو پکڑ لیا۔ یہ شخص جو میرے سامنے بیٹھا بیان دے رہا تھا وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ اس نے سارے ساتھی پکڑوا دیئے اور مال کی نشاندہی کر کے مال بھی برآمد کروا دیا لیکن اس نے چالاکی یہ کھیلی کہ جو مال مقتول کے گھر لا کر رکھا گیا تھا اس کا ذکر نہ کیا اور اقبالی بیان میں کہا کہ اس کے سوا اسے کچھ اور علم نہیں جو اس نے برآمد کروا دیا ہے۔

جب گرفتار شدہ ڈاکوؤں کو سات سات سال سزا ہو گئی تو یہ شخص مقتول سے ملتا رہا اور اسے تسلیاں دیتا رہا کہ اس مال کی اس نے نشاندہی نہیں کی تھی اور اسے وہ دبا کر رکھے۔ یہ وعدہ معاف گواہ اپیلوں کے فیصلے کا منتظر تھا۔ ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ساری پارٹی اپیلوں میں بری ہو کر باہر آ جائے اور اسے قتل کر دے۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ سب اگر بری ہو کر آ گئے تو وہ یہ بتا کر ان سے اپنا گناہ بخشوا سکتا ہے کہ یہ دیکھو تمہارا کتنا مال میں نے بچا لیا تھا لیکن ہوا یہ کہ اپیلیں مسترد ہو گئیں اور صرف ایک ساتھی بری ہوا۔

وعدہ معاف گواہ اس ساتھی کے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ جیل سے نکل کر گھر پہنچا تو وعدہ معاف گواہ اسے ملا۔ اس ساتھی نے اسے بہت ہی برا بھلا کہا اور یہ دھمکی بھی دی کہ اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

وعدہ معاف گواہ نے اسے یہ بتا کر خوش کر دیا کہ جو مال مقتول کے پاس رکھا تھا اس کی نشاندہی اس نے نہیں کی تھی اور وہ مال محفوظ ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں چلیں گے اور وہ مال وصول کر کے آپس میں بانٹ لیں گے۔

یہ مال وہ دونوں آپس میں نہیں بانٹ سکتے تھے کیونکہ بری ہونے والا ساتھی بری ہونے کے کچھ دن بعد جیل میں اپنے سرغنہ اور دوسرے ساتھیوں سے ملنے گیا تھا۔ سرغنہ نے اسے کہا تھا کہ وہ مقتول سے مال وصول کر کے کہیں دور جا کر بیچ آئے اور اس کی قیمت سرغنہ اور دوسرے ساتھیوں کے گھروں میں پہنچا دے۔

یہ بات تقریباً تین مہینے پہلے کی تھی۔ یہ دونوں یعنی وعدہ معاف گواہ اور اس کا ساتھی مقتول کے ہاں آئے اور اسے سرغنہ کا پیغام دے کر کہا کہ وہ زیورات اور نقدی اپنا حصہ رکھ کر انہیں دے دے۔ مقتول نے کچھ ایسا بہانہ پیش کر دیا کہ مال ایک اور جگہ رکھا ہے جہاں سے دو چار دنوں بعد ہی ملے گا۔ دونوں واپس چلے گئے اور کچھ دنوں بعد پھر مقتول کے ہاں آئے۔ مقتول نے اب کوئی اور بہانہ پیش کر دیا۔ پھر یوں ہوتا رہا کہ کبھی وعدہ معاف گواہ

مسو کے پاس آتا اور کبھی اس کا ساتھی اور مقتول کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر انہیں ٹال دیتا۔

''میں جانتا ہوں حضور' آپ نے ہمیں کیوں طلب کیا ہے''۔۔۔۔ وعدہ معاف گواہ نے کہا۔۔۔۔ ''آپ کو یہ شبہ ہے کہ ہم نے چوہدری کا قتل کیا ہے۔ آپ کو یہ شبہ ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ میں قتل سے ایک روز پہلے مقتول کے ہاں آیا تھا اور اس کے ساتھ جھگڑا بھی ہو گیا تھا اور میں غصے کی حالت میں واپس گیا تھا لیکن میں نے سوچا یہ تھا کہ اپنے اس ساتھی کو بتاؤں گا کہ یہ شخص بے ایمان ہو چکا ہے اور اس سے اب کچھ وصول نہیں ہو گا' پھر ہم جیل میں سرغنہ سے ملاقات کریں گے اور اس سے پوچھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ حضور! ہم ابھی اپنے سرغنہ سے ملے ہی نہیں۔ اگر وہ ہمیں کہتا کہ اس شخص سے مال وصول کرو' نہیں دیتا تو اُڑا دو تو ہم اسے قتل کر کے ہی دم لیتے ایسا کوئی حکم ہمیں نہیں ملا''۔

اب ایک بات ذہن میں رکھیں۔ اُس وقت تک میں جن لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا وہ سب عام قسم کے لوگ تھے جن کا جرائم پیشہ دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی پہلو ملزم یا مجرم تھے۔ ان کے ساتھ میرا رویہ کچھ اور تھا جسے آپ شریفانہ کہہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو میں ذرا دھمکا تو لیتا تھا لیکن حتی الامکان تشدد سے بچائے رکھتا تھا لیکن اب جو دو مشتبہ ایک یہ وعدہ معاف گواہ اور دوسرا اس کا ساتھی میرے سامنے آئے تھے ان کے ساتھ میرا رویہ بالکل ہی مختلف تھا۔ یہ وہ لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں جو باتوں سے نہیں مانا کرتے۔

یہ وعدہ معاف گواہ شاید سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے مطمئن کر دیا ہے لیکن میں ابھی تک شک میں تھا اور اسے میں نے آسانی سے چھوڑنا نہیں تھا۔ اسے کہا کہ وہ آرام سے اقبالی ہو جائے اور میں اسے بچانے کی یا کم از کم سزا دلانے کی کوشش کروں گا۔ ورنہ وہ جانتا ہے کہ ان جیسوں کے ساتھ پولیس کیا سلوک کیا کرتی ہے۔

وہ اتنا کچا تو نہیں تھا کہ فوراً ہتھیار ڈال دیتا۔ وہ ایک پرانے اور گھاگ ڈاکو کا شاگرد تھا۔ ان لوگوں کے پاس مقتول کے قتل کا بڑا مضبوط اور بڑا صحیح جواز تھا۔ مقتول ان کا اتنا زیادہ قیمتی مال جس پر انہیں سزا بھی ہو گئی' ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وعدہ معاف گواہ نہیں مان رہا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ اس شخص کو اپنے ساتھ رکھے اور دوسرے کو اندر بھیج دے۔

دوسرا جو آیا وہ وعدہ معاف گواہ کی ہی عمر کا تھا لیکن جب اس نے بات شروع کی میں

جان گیا کہ یہ اس سے زیادہ چالاک اور بہت حد تک استاد آدمی ہے۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو''۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔ ''تمہارا ساتھی ابھی ابھی مجھے بہت سی باتیں بتا گیا ہے۔ یہ بھی سوچ لو کہ یہ پہلے تمہیں دھوکہ دے چکا ہے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر تم سب کو اس نے سزا دلائی تھی۔ یہ اب تمہیں دھوکا دے گا۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور وہ بات بھی مجھے صاف صاف بتا دی ہے جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا''۔

وہ اپنی صفائی میں کوئی بات کرنے لگا تو میں نے اسے ڈانٹ کر اور دو گالیاں دے کر کہا کہ میں کوئی فالتو اور فضول بات نہیں سنوں گا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنے ساتھی کی باتوں کی تصدیق کر دے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کون سی بات ہے جس کی میں تصدیق چاہتا ہوں!

میں نے کہا کہ اس گاؤں کے چوہدری کو تم نے قتل کیا ہے یا تم میں سے ایک نے۔ اب پوچھو گے کہ وعدہ معاف گواہ نے کیا بتایا ہے تو یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ تم اپنی جان چھڑاؤ اور صحیح بات بتا دو''۔

''کیا آپ ہم پر چوہدری کے قتل کا شبہ کر رہے ہیں؟''۔۔۔۔ اس نے پوچھا۔

''شبہ نہیں یقین!''۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔ ''قاتل تم دونوں ہو، اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو ثابت کر دو کہ قتل میں تم شامل نہیں تھے اور یہ واردات تمہارے اس ساتھی نے کی ہے جو وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا''۔

اس نے اُچھل اُچھل اور تڑپ تڑپ کر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ وہ اس الزام کو قبول نہیں کر رہا تھا لیکن میں اسے جلدی چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے دوسری تمام باتیں وہی بتائی تھیں جو وعدہ معاف گواہ بتا چکا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ قتل کے ملزم ہوتے تو یہ کبھی بھی نہ بتاتے کہ مقتول کے ساتھ ان کا کوئی تعلق تھا۔

مجھے بہر حال یقین کی حد تک شک تھا کہ قاتل یہی ہیں۔ اُس زمانے کے ڈاکوؤں کے ہاں یہ رواج تھا کہ اپنا کوئی کتنا ہی پرانا ساتھی دھوکہ دے جائے تو اسے قتل کر دیتے تھے۔ یہ مقتول ان کا باقاعدہ ساتھی نہیں تھا نہ ان کی وارداتوں میں شامل ہوتا تھا' اس کا کام ہی کچھ اور تھا۔ اسے تو وہ معاف کر ہی نہیں سکتے تھے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سے تفتیش تھانے چل کے کی جائے۔ وعدہ معاف گواہ کو دوبارہ اندر بلایا اور اس کے ساتھی کو باہر بھیج دیا۔

’’دیکھ بھائی میرے!‘‘ ـــــ میں نے کہا ـــــ ’’جس واردات میں تم وعدہ معاف گواہ بنے تھے وہ میرے ہی تھانے کی واردات تھی۔ تم نے سارے مال کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ اس طرح سب سے زیادہ قیمتی مال مالکوں کو نہ مل سکا۔ اب تم نے اقبالی بیان دیا ہے کہ وہ مال کہاں ہے۔ میں یہ مال چوہدری کے گھر سے برآمد کر کے تمہیں سات سال ڈکیتی کی سزا دلواؤں گا اور دو سال سزا پولیس اور عدالت کو دھوکہ دینے کے جرم میں ...... اور اگر تم چوہدری کے قتل کا اقبال کرلو تو میں تمہارا ڈکیتی والا کیس سامنے نہیں لاؤں گا اور قتل میں بھی تھوڑی سزا دلواؤں گا‘‘ ـــــ یہ اتنی بڑی دھمکی تھی کہ مجھے توقع تھی کہ یہ شخص اقبالی ہو جائے گا لیکن وہ انکار پر قائم رہا، قسمیں کھاتا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر منت سماجت بھی کرتا تھا کہ میں اس پر یہ ظلم نہ کروں۔ میں ان جرائم پیشہ لوگوں کو جانتا تھا۔ بڑے پکے پتھر ہوا کرتے تھے...... میں نے وہاں سے تفتیش سمیٹی اور ان دونوں کو ساتھ لیا اور تھانے میں آ گئے۔

چارپائی پر نوخیز لڑکی

میں بہت حد تک خوش تھا کہ قتل کے ملزم پکڑ لئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ ان سے اقبالی بیان لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن یں یہ بھی جانتا تھا کہ بے شک پکے جرائم پیشہ ہیں لیکن انہیں معلوم ہے کہ اقبالی بیان نہ دینا بھی آسان کام نہیں۔ کوشش تو میری یہی ہوا کرتی تھی کہ ایذا رسانی نہ ہی کروں لیکن جرائم پیشہ افراد پر جب میں تشدد پر اُتر آتا تھا تو انتہا کر دیا کرتا تھا۔ پتھروں کو بھی زبان لگ جاتی تھی۔ ان کے خلاف کیس تیار کرنے میں جو دشواریاں تھیں ان سے بھی میں واقف تھا۔ میں نے تھانے جاتے ہی محرر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان کی ڈکیتی کی واردات کا کیس نکال کر مجھے دکھائے۔

پھر میں نے ایک خاص ہیڈ کانسٹیبل اور اے ایس آئی کو بلایا۔ یہ دونوں ایذا رسانی یعنی تھرڈ ڈگری کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان دونوں کو ان کے حوالے کر کے کہا کہ ان سے اقبالی بیان لینا ہے۔ وہ انہیں لے گئے۔

دو دن اور دو راتیں ان دونوں کو ایذا رسانی کی چکی میں پیسا جاتا رہا لیکن دونوں انکار پر قائم رہے۔ نفسیاتی حربے بھی استعمال کئے گئے لیکن وہ نہ مانے۔ میں انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا اور ہو سکتا بھی نہیں تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ قتل انہوں نے ہی کیا ہے۔ صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ دونوں نے مل کر کیا ہے یا دونوں میں سے کسی ایک نے۔ اس کے

ساتھ ہی میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ انہوں نے اقبالی بیان نہ دیئے تو مقدمہ کس لائن پر تیار کروں گا اور کیسی کیسی شہادت کی ضرورت پڑے گی تا کہ عدالت میں جا کر مقدمہ ناکام نہ ہو جائے۔

تیسرا دن تھا اور وقت گیارہ بجے کے بعد کا تھا۔ تھانے کے احاطے میں سروری داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے چار آدمی ایک چارپائی اٹھائے ہوئے تھے اور چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ پیچھے دو یا تین اور آدمی تھے اور ان کے پیچھے جمعدار چلا آ رہا تھا۔ سروری بازو پھیلائے عورتوں کی طرح ماتم کرتی آ رہی تھی۔ مجھے یہ نظارہ دفتر میں بیٹھے کھڑکی میں سے نظر آیا تو میں بڑی تیزی سے اٹھا اور باہر نکلا۔

ان لوگوں نے چارپائی برآمدے میں رکھی تو میں نے دیکھا کہ اس پر ایک نوخیز لڑکی لیٹی ہوئی تھی اور وہ بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ تو میں نے سب سے پہلے دیکھا تھا کہ وہ مری ہوئی نہیں بلکہ زندہ تھی۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ضرب کا نشان تھا۔ یہ لاٹھی یا موٹے ڈنڈے کی ضرب معلوم ہوتی تھی۔

سروری چیخ چلا رہی تھی ـــــ ’’باپ نے بیٹی کو مار ڈالا ہے ...... یہ دیکھیں بیٹی کو اس باپ نے مار ڈالا ہے‘‘ ـــــ اس کے ساتھ وہ سینہ کوبی بھی کرتی تھی۔ وہ ماتمی کیفیت میں بھی تھی اور غصے کی کیفیت میں بھی۔ اس کا جمعدار خاوند چارپائی کے پاس کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ لڑکی کو فوراً ہسپتال لے جائے۔ مضروب لڑکی کو اس طرح ہسپتال بھجوانا قاعدے قانون کے بالکل خلاف تھا۔ پولیس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ میں لڑکی کے جسم کا معائنہ کر کے ساری چوٹیں لکھتا اور باقاعدہ کاغذات تیار کر کے لڑکی کو ہسپتال بھجواتا لیکن میں نے سروری کی چیخ و پکار سے اور جمعدار کی وہاں موجودگی سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ گھریلو معاملہ ہے اور باپ نے بیٹی کو زدوکوب کیا ہوگا اور مجھے یہ باقاعدہ کیس نہیں بنانا چاہئے۔ میں پہلے میاں بیوی کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

میں دونوں کو دفتر میں لے گیا اور دروازہ بند کر کے انہیں بٹھایا۔ سروری نے اور ہی زیادہ چیخ و پکار شروع کر دی اور اب وہ خاوند کو کوس بھی رہی تھی۔ خاوند بالکل ہی خاموش بے بسی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سروری کو گرج کر ڈانٹا اور کہا وہ چپ نہیں ہوگی تو میں اسے حوالات میں بند کر دوں گا۔ تب وہ چپ ہوئی۔

’’آپ میرے گاؤں میں تفتیش کر کے آئے ہیں‘‘ ـــــ جمعدار نے بڑے تحمل سے

بات شروع کی۔۔۔ ''آپ کو سارے حالات کا پتہ چل گیا ہے اور میرے گھر کے حالات کا بھی۔ آپ کے ساتھ میری بڑی لمبی باتیں ہوئی تھیں۔ میں اس عورت کو راہِ راست پر نہیں لا سکا نہ کوئی اور لا سکے گا۔ اسے اللہ کے سوا کوئی بھی عقل و ہوش میں نہیں لا سکتا لیکن میری برداشت سے باہر ہے کہ میری اولاد بھی اسی کے راستے پر چل پڑے۔ صرف اس عورت کی وجہ سے میری نوجوان بیٹی کا تعلق اس مرے ہوئے مردود چوہدری کے بیٹے کے ساتھ پیدا ہو گیا۔ یہ میری بیٹی کی ماں ہے۔ یہ بہت خوش ہوئی کہ میری بیٹی اس آدمی کے بیٹے کے ساتھ جا ملی ہے جس کے ساتھ یہ طلاق لے کر شادی کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔

''میں نے اپنی بیٹی کو الگ بٹھا کر بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ وہ ماں کے راستے سے واپس آ جائے اور اس لڑکے کے ساتھ تعلق توڑ دے۔ بیٹی نے مجھے تو کوئی اچھا یا برا جواب نہ دیا لیکن میری نصیحت کا اس پر کوئی اثر بھی نہ ہوا۔ آج صبح مجھے میرے ایک دوست نے بتایا کہ میری بیٹی کھیتوں سے پرے منصور کے پاس بیٹھی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ میں اسی وقت اس طرف چل پڑا۔۔۔۔۔۔

''یہ اللہ کا حکم ہے کہ تمہارا کوئی بچہ غلط راستے پر چلتا ہے تو اسے روکو۔ اگر نہیں مانتا تو سختی کرو پھر بھی نہ مانے تو اسے جسمانی سزا دو۔ میں اللہ کے حکم کا پابند ہوں۔ میں بہت تیز چلتا اس طرف گیا۔ میری بیٹی اس طرف سے آ رہی تھی اور میں نے منصور کو دوسری طرف جاتے دیکھا۔ جا کر بیٹی کا بازو پکڑا اور اس سے پوچھا کہ وہ منصور سے ملنے آئی تھی؟ بیٹی نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ہاں، میں اسی سے ملنے آئی تھی۔۔۔۔۔۔

''میں نے اسے گھر لا کر بہت مارا پیٹا اور اس کے ماتھے پر جو چوٹ ہے وہ اس طرح آئی ہے کہ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر زور سے گھمایا تو اس کا ماتھا دیوار کے ساتھ لگا اور یہ ضرب نظر آ رہی ہے۔ اگر یہ مر جاتی تو میں اس کی لاش اٹھا کر خود تھانے آ جاتا۔۔۔۔۔۔

''اس میری بیوی نے باہر نکل کر ایسی چیخ و پکار کی کہ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ سب اسے منع کر رہے تھے کہ اسے اپنے باپ نے مارا پیٹا ہے اور وہ نہ خود تھانے چڑھے نہ نوجوان بیٹی کو ذلیل کرائے لیکن یہ عورت چڑیلوں کی طرح چیختی چلاتی رہی۔ میں نے چار آدمیوں سے کہا کہ چارپائی اٹھاؤ اور شہر چلو۔ اس طرح میری بیٹی غشی کی حالت میں آپ تک پہنچی ہے۔ آگے آپ کے اختیار میں ہے کہ مجھے گرفتار کر لیں یا جو کارروائی بھی کریں مجھے قبول ہے''۔

میں نے سروری سے پوچھا کہ وہ جمعدار صاحب کے بیان کو صحیح سمجھتی ہے یا غلط۔ اگر انہوں نے جھوٹ بولا ہے تو بتا دے۔ سروری نے بات غصے سے کی لیکن یہ کہہ دیا کہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا۔

اس کی اسی بات پر میں اس پر برس پڑا اور شرم دلانے کے لئے کچھ بے ہودہ باتیں بھی کہہ ڈالیں۔ یہاں تک کہہ گزرا کہ اپنے اس یار کا انجام دیکھو۔ اللہ سے ڈرو، تمہارا انجام اس سے برا ہو سکتا ہے۔

''بے غیرت عورت!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کیا تم اس معزز اور نیک خاوند کو سزا دلوانا چاہتی ہو؟ کیا تم یہ امید لے کر یہاں آئی ہو کہ میں انہیں حوالات میں بند کر دوں گا؟ قانون انگریز کا ہے لیکن اس قانون نے مجھے بھی کچھ اختیار دیئے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رکھ لو کہ میں ہندو یا عیسائی یا سکھ نہیں میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان گھر کی عزت برباد نہیں ہونے دوں گا''۔

سروری تو بڑی ڈھیٹ عورت تھی لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور پھر اس نے سر جھکا لیا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے آنسو مقتول کے غم میں نکلے تھے یا ندامت کے آنسو تھے۔

''میں نے اسے بخش دیا ہے''۔۔۔ جمعدار نے کہا۔۔۔ ''اپنے گھر کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اللہ کے ہاں انصاف ہے، بے انصافی نہیں''۔

ان دونوں کو تو میں نے لگام ڈال لی لیکن ان کی بیٹی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مر جانے کا امکان بھی تھا۔ مجھے ہسپتال جانے کی ضرورت تو نہیں تھی، میں کسی کانسٹیبل کو بھی بھیج کر لڑکی کی رپورٹ اور حالت معلوم کر سکتا تھا لیکن بہتر سمجھا کہ ان دونوں کو ساتھ لے کر میں خود ہی جاؤں۔ دونوں کو ساتھ لیا اور میں ہسپتال جا پہنچا۔ ہسپتال کا انچارج ایک ہندو ڈاکٹر راج کپور تھا۔

اس دور میں ہسپتالوں میں ذرا سا بھی رش نہیں ہوتا تھا۔ وارڈ تقریباً خالی پڑے رہتے تھے۔ خالص غذا اور صاف ستھری فضا کی بدولت لوگوں کی صحت ٹھیک ٹھاک رہتی تھی۔ میں نے لڑکی کے متعلق ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ہوش میں آ گئی ہے اور اسے اندرونی ضربیں لگی ہیں جو خطرناک معلوم نہیں ہوتیں۔

میں نے اسے بتایا کہ لڑکی کو دراصل اپنے باپ نے مارا پیٹا ہے اور یہ پولیس کیس

نہیں۔اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر سے یہ عرض کی کہ وہ اس لڑکی کی طرف ذاتی توجہ دیتا رہے۔

''مجھے ایک شک ہے''۔۔۔ڈاکٹر نے کہا۔۔۔''لڑکی کے سر پر چوٹ آئی ہے، معلوم ہوتا ہے اس نے دماغ پر بھی اثر کیا ہے۔لڑکی شاید دو دن تک بات بھی نہ کر سکے اور اگر اس نے بات کی بھی تو وہ بے ربط سی بات ہوگی، بہرحال تشویش والی بات نہیں، جلد ہی نارمل ہو جائے گی''۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے پولیس کیس بنایا ہی نہیں تھا اور لڑکی کے ہوش میں آجانے سے یہ کیس پولیس کا بن نہیں سکتا تھا۔ میں سرخرو ہوگیا۔ جمعدار اور سروری سے کہا کہ اب وہ بیٹی کا خیال رکھیں اور میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا کہ وہ ذاتی طور پر بچی کو دیکھتا رہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اب جس نے بچی کے ساتھ رہنا ہے رہے، میری طرف سے وہ آزاد ہیں۔

میں تھانے کے دوسرے کاموں کے علاوہ قتل کی تفتیش میں لگا رہا۔ وعدہ معاف گواہ اور اس کا ساتھی ابھی تک انکار پر قائم تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو وہ بہت ہی بری حالت میں تھے اور دونوں نے یہ حرکت کی کہ میرے پاؤں میں سر رکھ دیئے۔

میں نے سوچا کہ جتنی اذیت انہوں نے برداشت کی ہے وہ کوئی پیشہ ور بھی برداشت نہیں کرسکتا۔اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ یہ بے گناہ ہیں۔ پہلے، وزگاؤں میں انہوں نے جو بیان دیئے تھے، میں نے اکیلے بیٹھ کر ان پر غور کیا تو ایک بات میرے ذہن میں اٹک گئی۔وہ یہ تھی کہ قاتل یہی ہوتے اور مقتول کے ساتھ ان کی عداوت ہوتی کہ ان کا مال ہضم کر گیا تھا تو یہ دونوں ایک تھانے دار کو نہ بتاتے کہ انہوں نے مال مقتول کے ہاں رکھا تھا اور انہوں نے کوئی پردہ تو رہنے ہی نہیں دیا تھا۔

سوچ سوچ کر میرے ذہن میں یہ یقین کہ یہی قاتل ہیں، پھر شک میں بدل گیا۔ میں نے ان پر تشدد رکوا دیا اور تھانے میں پابند رکھا۔انہیں ایسا تاثر نہ دیا کہ میں انہیں بے گناہ سمجھنے لگا ہوں۔انہیں مشتبہ ہی بنائے رکھا۔

ماں کولقوہ بیٹی کوٹی بی ہوگئی

جمعدار اور سروری کی بیٹی فرخندہ کو ہسپتال میں داخل ہوئے چوتھا یا پانچواں روز تھا۔ جمعدار میرے پاس آیا اور بتایا کہ لڑکی ہوش میں ہے اور اب اٹھتی بھی اور تھوڑا سا چلتی

بھی ہے لیکن وہ کسی کو پہچانتی نہیں اور جو باتیں کرتی ہے وہ کچھ بے معنی سی ہوتی ہیں۔ جمعدار کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک بار پھر ڈاکٹر سے ملوں اور سفارش کروں کہ وہ بچی کے دماغ کو نارمل کردے۔

میں ایک دو کام نپٹا کر ہسپتال گیا اور ڈاکٹر سے ملا۔ڈاکٹر نے پوری تسلی دی اور یقین کے ساتھ کہا کہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔اس وقت وہ ذہنی طور پر نارمل حالت میں نہیں کیونکہ دماغ پر شدید چوٹ پڑی ہے۔یہ وہ چوٹ تھی جو میں نے لڑکی کی پیشانی پر دیکھی تھی اور جمعدار نے بتایا تھا کہ لڑکی کا ماتھا دیوار کے ساتھ بہت زور سے لگا تھا۔

میں لڑکی کو دیکھنے کے لئے وارڈ میں چلا گیا۔اس وقت سروری اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ میں نے فرخندہ کے بیڈ کے پاس جا کر اسے دیکھا۔وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اور پیٹھ تکئے کے ساتھ لگا رکھی تھی۔اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ خاصی بہتر ہوگئی ہے لیکن وہ باپ کو بھی نہیں پہچانتی تھی اور جب میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے دھیان ہی نہ دیا کہ میں کون ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب وہ کیسی ہے۔

''میں ٹھیک ہوں''۔۔۔فرخندہ نے جواب دیا۔۔۔''تم بھی ٹھیک ہو، سب ٹھیک ہیں اور منصور سب سے زیادہ ٹھیک ہے''۔

اس نے کچھ اور باتیں شروع کر دیں جن میں کوئی ربط نہیں تھا اور وہ ایک ہی لہجے اور ٹون میں بولتی جا رہی تھی۔منصور کا نام بار بار لیتی تھی۔ جمعدار معلوم نہیں کیوں وارڈ سے نکلا اور برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے ویسے ہی فرخندہ سے کہا کہ وہ منصور کو کیوں بار بار یاد کرتی ہے؟

''تو پھر کیا میں تمہیں یاد کیا کروں؟''۔۔۔اس نے کہا۔۔۔''کیا تم نے اپنے باپ کا گلا گھونٹا ہے؟''

اس کی اس بات سے میں بڑی شدت سے چونکا اور پھر منصور کا نام لے کر لڑکی سے کہا کہ کون ہے وہ جو اپنے باپ کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔

''ایسا بہادر صرف منصور ہے''۔۔۔فرخندہ نے ٹون بدلے بغیر کہا۔۔۔''میرے پیچھے اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا ہے''۔

میں نے اسے مختلف سوالوں کے ذریعے کریدنے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی بے ربط باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور جمعدار سے کہا کہ میں مصروف ہوں

اوراب جاتا ہوں۔ وہاں سے ڈاکٹر کے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ یہ سنا ہے اور میں نے ایک دو کیس دیکھے بھی تھے کہ دماغ پر شدید چوٹ پڑے تو آدمی کی یادداشت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عزیزوں کو بھی نہیں پہچانتا لیکن یہ لڑکی اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتی اور باتیں بظاہر بے ربط اور بے معنی سی کرتی ہے لیکن اس لڑکے کو ٹھیک یاد کرتی ہے جس کے ساتھ اسے محبت ہے اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اس کے ذہن سے منصور بھی نکل جانا چاہئے تھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ کیس بالکل مختلف ہے۔ اس نے یہ بات یوں سمجھائی کہ اس لڑکی کے دماغ کو اتنی شدید چوٹ نہیں پڑی کہ یہ یادداشت بالکل ہی کھو بیٹھتی بلکہ چوٹ اس طرح پڑی ہے کہ یادداشت متاثر ہوئی ہے لیکن اس کا ذہن لاشعور متاثر نہیں ہوا۔ یوں کہہ لیں کہ منصور کے ساتھ اس لڑکی کی دلی وابستگی ہے اس لئے یہ لڑکا اس کے ذہن لاشعور میں اتنا گہرا اترا ہوا ہے کہ یہ چوٹ اسے نکال نہیں سکی۔ ڈاکٹر نے کہا دو یا تین دن اور گزریں گے تو لڑکی دماغی لحاظ سے اور ذہنی لحاظ سے بھی بالکل نارمل ہو جائے گی۔

میں نے ڈاکٹر کو یاد دلایا کہ چند دن پہلے اس نے ایک پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ مقتول کو گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ یہ لڑکا منصور اس مقتول کا بیٹا ہے...... ڈاکٹر کو مختصراً پس منظر سنا کہ بتایا کہ منصور اور فرخندہ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن مقتول مان نہیں رہا تھا۔ یہ سارا پس منظر سنا کر میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ اب فرخندہ اس دماغی ابنارمل حالت میں کہہ رہی ہے کہ منصور نے اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر مار دیا تھا تو کیا یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے یا لڑکی دماغی چوٹ کی وجہ سے بے ربط باتیں کر رہی ہے؟

''یہ بات بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے'' — ڈاکٹر نے کہا — ''میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ لڑکا اس لڑکی کے ذہن لاشعور میں گہرا اترا ہوا ہے اس لئے لاشعوری طور پر اس کی زبان پر اس کا نام آ جاتا ہے لیکن یہ سمجھنے کا شعور کھو بیٹھی ہے کہ اس لڑکے کی کون سی بات ہے جو زبان پر لانی ہے اور کون سی بات پردے میں رکھنی ہے۔ یہ سچ ہو سکتا ہے کہ اس لڑکے منصور نے ہی اپنے باپ کو قتل کیا ہو۔ اس نے اس لڑکی کو بڑے فخر سے بتایا ہوگا کہ اس نے باپ کو ہی مار ڈالا ہے جو ان کی شادی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ قتل اس قدر سنگین واقعہ یا فعل ہے جو اس کم سن لڑکی کے ذہن لاشعور میں اتر گیا اور اب اپنے آپ زبان پر آ رہا ہے۔

ڈاکٹر نے مجھے یہ ساری تھیوری بڑی اچھی طرح سمجھائی تھی اور کچھ میڈیکل اصطلاحیں بھی بولی تھیں جو میں سمجھ گیا تھا۔

میں بھاگم بھاگ تھانے پہنچا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ سائیکل پکڑے اور مقتول کے گاؤں جا کر اس کے بیٹے منصور کو ساتھ لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل اسی وقت روانہ ہو گیا...... وہ منصور کے ساتھ تین گھنٹوں سے کچھ زیادہ وقت بعد واپس آیا۔ اس نے مجھے الگ کر کے بتایا کہ منصور تو آ ہی نہیں رہا تھا اور منتیں کرتا تھا کہ اسے تھانے نہ لے جایا جائے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تفتیش کے سلسلے میں کچھ پوچھنا ہے۔ منصور نے ہیڈ کانسٹیبل کو رشوت دے کر کہا کہ تھانے دار کو کہہ دینا کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے اور واپس آئے گا تو گھر والے اسے تھانے بھیج دیں گے۔

یہ بات سن کر میرا شک پکا ہو گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فرخندہ کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ منصور جب میرے سامنے آ بیٹھا تو اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا تھا اور میں نے جب اس سے خیریت پوچھی تو اس کے منہ سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ آخر نادان عمر کا نوجوان تھا۔ اس قسم کے ردعمل سے وہ ثابت کر رہا تھا کہ ملزم ہے۔

''دیکھ منصور!'' — میں نے بڑے پیار سے کہا — ''میں حیران ہوں کہ تم جیسا مضبوط دل والا نوجوان اتنا ڈرا ہوا کیوں ہے...... تم نے ذیلدار سے یہ الفاظ کہے تھے کہ میں اپنے باپ کا گلا گھونٹ دوں گا پھر تم نے فرخندہ کی ماں سروری سے بھی یہی الفاظ کہے تھے......''

''نہیں...... نہیں جی نہیں...... میں نے'' — منصور نے واویلا مچا دیا لیکن اس کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے اور وہ ہکلا رہا تھا — ''میں نے نہیں کہا تھا...... خدا کی قسم...... مجھے گھر جانے دیں...... میں...... میں...... گلا نہیں گھونٹ سکتا......''

میں اس کی وہ کیفیت جو ہوئی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ چند الفاظ بطور نمونہ لکھ دیئے ہیں لیکن آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ اس کی حالت کتنی بگڑ گئی تھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا جیسے بھاگ جانے کا راستہ دیکھ رہا ہو۔

مجھے یاد آیا کہ اسے جب میں نے گاؤں میں اپنے پاس بٹھایا تھا تو بھی اس کی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں نے کہا یہ تو بڑا ہی کمزور دل اور ڈرپوک لڑکا ہے۔ اب خیال آیا کہ اس کے ذہن اور دل پر باپ کا قتل سوار تھا جس کا ملزم یہ خود تھا۔ اب تو اس نے کوئی شک

رہنے ہی نہیں دیا۔

''منصور بھائی!'' ــــ میں نے اٹھ کر اس کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا ــــ ''مجھے صاف صاف بتا دو کہ اپنے باپ کو تم نے گلا گھونٹ کر مارا ہے تو میں تمہاری نوجوانی کو دیکھتے ہوئے تمہیں بچالوں گا۔ ابھی یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہے''۔

''نہیں، میں ایسی بات نہیں کروں گا'' ــــ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ــــ ''آپ کا کیا اعتبار، میں کہہ دوں کہ باپ کو میں نے قتل کیا ہے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ آپ مجھے حوالات میں بند کر دیں گے پھر مجھے پھانسی کی سزا ہو جائے گی''۔

میرے سامنے تو وہ دودھ پیتا بچہ تھا۔ میں نے اپنے انداز سے اسے اپنے اثر میں لینا شروع کر دیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا تو وہ یکلخت پھٹ پڑا۔

''ہاں ...... ہاں ...... باپ کو میں نے گلا گھونٹ کر مارا ہے'' ــــ اس نے ایسی حالت میں کہا جیسے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو ــــ ''جاؤ، کرلو جو میرے خلاف کرنا ہے ...... میں نے کہا تھا کہ اس باپ کا گلا گھونٹ دوں گا''۔

اسے نارمل حالت میں لانے کے لئے میں نے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ صرف کر ڈالا۔ اسے جھوٹی تسلیاں دیں، حوصلہ مضبوط کیا اور جھوٹا وعدہ کیا کہ اسے بری کروالوں گا۔ اس نے اقبالی بیان دے دیا۔

اس کا بیان یہاں سنانے کی کوئی ضرورت رہی ہی نہیں۔ اگر آپ نے میری یہ کہانی توجہ سے پڑھی ہے تو آپ جان گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کے پاس قتل کا بڑا ٹھیک ٹھاک جواز موجود تھا۔ فرخندہ جیسی کم سن اور حسین لڑکی کے ساتھ اسے محبت تھی اور باپ اس سے شادی نہیں کرنے دے رہا تھا بلکہ اسے باپ نے مارا پیٹا بھی تھا۔ باپ کے خلاف نفرت اس وجہ سے بھی تھی وہ اس کی ماں کو اس عمر میں آ کر اجاڑ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک بدکار عورت کو گھر لانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کا ردعمل تو شدید ہونا ہی تھا لیکن عمر ایسی تھی کہ عقل پر جذبات غالب آ گئے تھے۔

قتل سے دو دن پہلے باپ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ گالیاں دیں اور بہت بے عزتی کی تھی۔ قتل کی رات مقتول اپنے باغ والے مکان میں جا سویا۔ منصور رات کو وہاں جا پہنچا۔ دروازہ کھلا تھا۔ منصور اندر چلا گیا۔ مقتول کی پگڑی چارپائی پر تکئے کے قریب رکھی تھی۔ منصور نے پگڑی سوئے ہوئے باپ کے گلے میں ڈالی، گانٹھ دی اور اس قدر زور لگایا

کہ پگڑی پھانسی کا پھندہ بن گئی اور مقتول ختم ہو گیا۔

میری یہ تفتیشی کہانی تو ختم ہو گئی، اس کے بعد میری جو کارروائیاں تھیں وہ مقدمے کی تیاری اور شہادت کی فراہمی تھی جس میں آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے مقدمہ تیار کر لیا اور ساتھ آٹھ مہینے مقدمہ چلا اور منصور کو عمر قید سنا دی گئی۔ اس کی اپیل ہائی کورٹ نے مسترد کر دی۔

سیشن کورٹ نے جب منصور کو عمر قید سنا دی تھی اور ہائی کورٹ میں اپیل دائر ہوئی تھی، اس وقت ایک دن جمعدار مجھے ملنے تھانے میں آیا۔ وہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی کی اطلاع گئی تھی کہ اسے لقوہ ہو گیا ہے۔ جمعدار سات آٹھ دنوں کی چھٹی لے کر پہنچا۔

اس نے بتایا کہ سروری کا منہ نمایاں طور پر ٹیڑھا ہو گیا ہے اور اس کا اثر بائیں بازو میں بھی چلا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اب سروری بھکاریوں کی طرح معافیاں مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ باقی عمر اس کی غلامی میں گذارے گی ...... جمعدار اب سروری کو اور بچوں کو ساتھ لے جا رہا تھا اور وہاں اس کا علاج سی ایم ایچ میں کرانا تھا۔

''ملک صاحب!'' ــــ جمعدار نے کہا ــــ ''میں نے بیوی کو صرف ایک بات سمجھائی ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ دل کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے اسے اپنا اور اپنے دل کا معاملہ ہی نہ سمجھو، ہر معاملہ اللہ کا ہوتا ہے اور فیصلہ اور انصاف وہی کرتا ہے''۔

میں نے اس سے اس کی بیٹی فرخندہ کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو سمجھو ختم ہی ہو گئی ہے۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی اور اس زمانے میں ٹی بی لاعلاج مرض تھا۔

+ + +

خاوند کی واپسی

یہ واردات عجیب وغریب تھی اور پھر جس طرح جہانگیر اور مریم نے بیان دیئے، وہ بھی حیران کن بات تھی۔ حیران کن اس لئے کہ اتنا سچ یا اتنی دلیری سے سچ کوئی خدا کا خاص بندہ ہی بولتا ہوگا۔

قتل کی کہانیاں تو آپ بے شمار ہی پڑھ چکے ہیں۔ میں اکیلا ہی یہ کہانیاں نہیں سنا رہا، دوسرے حضرات بھی اپنی اپنی تفتیشی کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔ ہر قتل کا کوئی باعث ہوتا ہے۔ گھروں کے جھگڑے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور خاندانی دشمنیاں بھی چلتی ہیں اور کبھی کوئی شخص اچانک اس قدر اشتعال میں آجاتا ہے کہ بے قابو ہو کر قتل کی واردات کر دیتا ہے۔ انتقامی قتل بھی ہوتے ہیں لیکن قتل کی بعض ایسی وارداتیں بھی دیکھی ہیں جن کے باعث نفسیاتی تھے۔ یہ جو واردات سنانے لگا ہوں، اس میں ایک نوجوان لڑکی کی نفسیات کارفرما تھی۔

میری بدقسمتی سمجھیں یا خوش قسمتی کہ میں نے بی اے پاس کر لی تھی اور پھر نفسیات کے علم میں بھی منہ مارتا رہا تھا۔ میری ڈائریوں میں قتل اور ڈکیتیوں کے تقریباً سارے ہی کیس محفوظ ہیں لیکن جن کیسوں میں نفسیاتی عناصر پائے جاتے تھے انہیں میں خاص طور پر اپنے ریکارڈ میں لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ کیس بھی ایسے ہی چند ایک کیسوں میں سے ہے۔ کہانی مختصر لکھی جاتی ہے جس کا یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ کچھ باتیں رہ جاتی ہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ یہ من گھڑت قصہ ہے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، ایسا نہ ہو کہ میں چلتا بنوں اور نہایت دلچسپ اور عبرت ناک کہانیاں آپ تک پہنچ ہی نہ سکیں۔

جب قتل کی یہ واردات ہوئی اس وقت بھی میں کرائمز برانچ میں تھا۔ مقتول کوئی اہم شخصیت نہیں تھا کہ اس کے قتل کی تفتیش کرائمز برانچ کو دی جاتی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی کہ مقتول کے لواحقین نے اوپر درخواست دے کر یہ ثابت کر دیا ہو کہ متعلقہ تھانے کا تھانیدار تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہے اور وہ دانستہ قاتلوں کو پکڑ نہیں رہا۔ مقتول تو نامی گرامی غنڈہ اور بدمعاش تھا۔ جرائم پیشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ وہ سفید پوش بدمعاش تھا۔ اس کی عمر چالیس سال سے شاید ایک دو سال اوپر تھی۔ خوبرو آدمی تھا اور شریفانہ لباس پہنتا تھا۔ جو

لوگ اسے نہیں جانتے تھے وہ اسے سوسائٹی کا معزز آدمی سمجھتے تھے اور ذرا سا بھی شک نہیں کرتے تھے کہ یہ کسی اور قماش کا آدمی ہے۔ تھوڑا سا لکھا پڑھا تھا لیکن بولتا تھا تو پتہ چلتا جیسے اچھا خاصا تعلیم یافتہ ہو۔ اس نے جرائم پیشہ افراد کا اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا۔ کسی کو بلیک میل کرنا ہوتا، کسی کے کرایہ دار سے مکان خالی کرنا ہوتا یا کسی سے پھنسی ہوئی رقم نکلوانی ہوتی یا ایسا ہی کوئی کام ہوتا، یہ شخص اپنے گروہ سے یہ کام کروالیا کرتا اور فیس لیتا تھا۔ سرکاری طور پر بھی وہ ایسے کام کرتا تھا۔ وہ گھٹیا قسم کا غنڈہ اور بدمعاش نہیں تھا۔ میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں ہی نہیں۔ پوری کی پوری کرائمز برانچ اسے جانتی تھی اور کرائمز برانچ کے انگریز افسر بھی اس سے واقف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شخص کرائمز برانچ کا قابل اعتماد مخبر تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس کے قتل کی تفتیش ہم لوگ خود کرنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ یہ شخص ملٹری انٹیلی جنس کا بھی مخبر تھا۔

اس کے قتل کی خبر ملٹری کی انٹیلی جنس کو ملی تو انٹیلی جنس کا ایک انگریز افسر ہمارے افسروں کے پاس آیا اور کہا کہ اس شخص کے قتل کی تفتیش تھانے میں نہ ہو بلکہ کرائمز برانچ کرے کیونکہ یہ شخص انٹیلی جنس کا مخبر تھا اور شک ہے کہ اسے دشمن نے مروایا ہوگا...... اس وقت جنگ عظیم کا فیصلہ کن دور شروع ہو چکا تھا اور ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوس کچھ زیادہ ہی ہو گئے تھے۔ وہ سب کے سب ہندوستانی تھے۔ شک یہ تھا کہ جاسوسوں کے کسی رنگ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ یہ شخص انٹیلی جنس کا مخبر ہے یا انہیں یہ پتہ چلا ہوگا کہ ہمارے فلاں آدمی کو اس نے پکڑوایا تھا تو ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

اس انگریز افسر نے یہ بھی بتایا کہ ملٹری انٹیلی جنس کو جاسوسوں کے ایک رنگ کی نشاندہی ہوئی ہے لیکن ابھی اس کے تمام ممبروں کا پتہ نہیں چلا۔ دو ممبروں کے متعلق یقین ہو گیا ہے کہ وہ اس رنگ کے آدمی ہیں اور مقتول ان کے ساتھ سائے کی طرح لگ گیا تھا۔ اگر وہ آدمی اس رنگ کے سامنے آ گئے تھے تو پولیس کے لئے تفتیش آسان ہو گئی تھی کہ ان دونوں کو پکڑ کر ان سے تفتیش کی جائے اور تھرڈ ڈگری کا طریقہ استعمال کر کے ان سے اقبال جرم کروایا جائے مگر انٹیلی جنس نے یہ مشکل پیدا کر دی کہ ان دو جاسوسوں کو چھیڑنا ہی نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان دو کو ہم پکڑ لیتے تو باقی تمام رنگ زمین کے نیچے چلا جاتا۔ انٹیلی جنس کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ پورے رنگ کو پکڑنے کے لئے اس رنگ کے ایک دو آدمیوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے اور پھر مخبروں کے تعاقب میں رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ رنگ کے

ہر آدمی کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

یہ کیس مجھے دیا گیا۔ مجھے توقع تو یہ تھی کہ پہلے کی طرح میرے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر ہوگا لیکن پہلی بار مجھے ایک ہندوستانی تھانیدار دیا گیا جو سب انسپکٹر تھا اور سکھ تھا۔ اس کا نام جگت سنگھ سندھو تھا۔ میں اس وقت انسپکٹر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تفتیش سو فیصد میری ذمہ داری تھی۔ سندھو میرے ماتحت تھا۔

یہ واردات شہر سے ملحقہ ایک آبادی کی تھی جس میں بہت سے مکان نئے نئے بنے تھے یہ مڈل کلاس لوگوں کی آبادی تھی۔ مجھے جس روز یہ کیس دیا گیا وہ قتل کے بعد کا چوتھا دن تھا۔ متعلقہ تھانے کا تھانیدار ایک ہندو سب انسپکٹر جے پال تھا۔ مقتول کا نام عبدالودود جمالی تھا۔ اسے عبدالودود تو کوئی کہتا ہی نہیں تھا نہ لوگوں کو اس نام کا پتہ تھا، وہ جمالی کے نام سے مشہور تھا۔ ہم جے پال کے تھانے میں گئے۔ اسے حکم مل چکا تھا کہ اس کیس میں تفتیش کرائمز برانچ کرے گی۔ ہم نے اس سے فائل لے لی اور پوچھا کہ اب تک وہ کیا کچھ کر چکا ہے اور اسے کیا کچھ معلوم ہے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچا ہے یا نہیں۔ اس سے ہمیں یہ توقع رکھنی نہیں چاہئے تھی کہ وہ اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوگا۔

خون کے دھبے اور سو سو کے نوٹ

یہ واردات اس طرح ہوئی تھی کہ قتل کی رات مقتول جمالی اپنے گھر نہیں تھا۔ آدھی رات کے کچھ بعد اس کی بیوی باہر نکلی۔ وہ خاوند کے انتظار میں تھی اور اس نے دروازہ کھلا رکھا تھا...... کھلا کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اندر چٹخنی نہیں چڑھائی تھی۔ وہ باہر نکلی تو دیکھا کہ جمالی دروازے کے اندر گرا پڑا ہے۔ اس کا جسم دروازے کے اندر تھا اور پاؤں دہلیز پر تھے۔ دروازے کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا۔

بیوی نے گھبرا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اسے بلایا اور ہلایا جلایا لیکن وہ مر چکا تھا۔ بیوی نے بتی جلا کر دیکھا جمالی کی ناک میں خون جما ہوا تھا یعنی خون ناک میں سے نکل رہا تھا اور وہاں جم گیا تھا۔ ہونٹوں کے ساتھ بھی خون لگا ہوا تھا۔ بیوی گلی میں نکل آئی اور شور مچایا۔ محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جس نے بھی جمالی کو دیکھا اس نے کہا یہ تو مر چکا ہے۔

دو تین آدمی تھانے میں اطلاع دینے کے لئے دوڑ پڑے۔ وہ مقتول کی بیوی کو ساتھ نہ لے گئے۔ سب انسپکٹر جے پال کو گھر اطلاع دی گئی تو وہ اسی وقت اٹھ کر آ گیا اور پھر موقعہ

پر پہنچا۔

جے پال نے لاش کو دیکھا تو اسے لاش کے سر پر ایک جگہ اچھا خاصا ابھار نظر آیا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں اس کو ڈنڈے یا لاٹھی کی شدید ضرب لگائی گئی ہے۔ جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا نہ کہیں ضرب کا نشان تھا۔ جے پال نے لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوادی اور وہیں تفتیش شروع کردی۔

تھانے رپورٹ پہنچنے سے لے کر لاش کے پوسٹمارٹم کے لئے بھیجے جانے تک خاصا وقت گزر گیا تھا۔ فجر کی اذان ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد مسلمان نماز پڑھنے کے لئے مسجد کو جانے لگے۔ جے پال مقتول کے گھر ہی بیٹھ گیا اور مقتول کی بیوی سے پوچھ گچھ کررہا تھا۔

دو آدمی اندر آئے اور جے پال کو کچھ پیسے اور کچھ کاغذات دیئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ نوٹ اور یہ کاغذ ساتھ والی گلی میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ اس وقت کے لوگوں کی دیانت داری اور تعاون تھا کہ انہوں نے یہ رقم اڑا نہ لی بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ مقتول کی ہو سکتی ہے، تھانیدار کے پاس لے آئے۔ ان کاغذوں میں ایک ڈاک کا لفافہ تھا جس پر مقتول جمالی کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ جمالی کے قتل کی خبر ساری آبادی میں پہنچ گئی تھی۔ یہ دو آدمی یہ ایڈریس دیکھ کر ٹھیک سمجھے کہ یہ پیسے بھی جمالی کے ہوں گے۔

انہوں نے بتایا کہ سو سو روپے کے دو نوٹ گلی میں ایک جگہ گرے پڑے تھے اور دو تین قدم آگے دس دس اور پانچ پانچ کے چار پانچ نوٹ پڑے ہوئے تھے اور کاغذوں کی چھوٹی چھوٹی دو تین پرچیاں اور ڈاک کا لفافہ ان سے ذرا آگے گرا پڑا تھا۔

دراصل جے پال کو جمالی کی بیوی پر شک تھا۔ وہ سمجھا کہ جمالی بہت دیر سے گھر آیا ہو گا اور اس کا استقبال بیوی نے دروازے میں ہی کیا ہو گا اور وہ اس بات پر غصے میں آگئی ہو گی کہ وہ اتنی دیر سے آیا ہے۔ ان کی آپس میں تو تکار ہوئی ہو گی اور بیوی نے کوئی ڈنڈا سوٹا ہاتھ میں آیا تو غصے میں اس کے سر پر مار دیا ہو گا اور اس طرح خاوند کی موت واقع ہوئی لیکن جب جے پال کو یہ نوٹ اور دوسرے کاغذ ملے تو اس کا شک تبدیل ہو گیا۔

جے پال اسی وقت اٹھا اور اس جگہ پہنچا جہاں یہ نوٹ اور کاغذ وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ اس جگہ جانے سے پہلے جے پال نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ خط انبالہ سے جمالی کے ایک دوست نے لکھا تھا۔ اس میں اتنا ہی لکھا تھا کہ میرے بیٹے کا ختنہ فلاں تاریخ ہے اور تم ضرور آنا۔

صبح کی روشنی ابھی خاصی دھندلی تھی۔ جس گلی میں یہ کاغذ وغیرہ پڑے ہوئے تھے، وہاں گلی کی بجلی کی بتی جل رہی تھی۔ جے پال نے اس گلی کو اچھی طرح دیکھا۔ اس نے اپنے کانسٹیبلوں سے کہہ دیا تھا کہ گلیوں میں لوگ زیادہ چلیں پھریں نہیں۔ جے پال کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مقتول کو گھر میں یا گھر کے دروازے پر قتل نہیں کیا گیا بلکہ اسے کہیں قتل کر کے اٹھایا گیا اور گھر تک لاش لائی گئی تھی اس لئے یہ نوٹ اور کاغذ اس کی اوپر والی جیب سے گر پڑے۔ اس کا دوسرا شک یہ بھی تھا کہ اسی جگہ مقتول کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوگئی ہو گی اور آخر اس کے سر پر لاٹھی یا ڈنڈا مارا گیا اور پھر لاش اٹھا کر گھر پھینکی گئی یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جمالی اتنی شدید ضرب کھا کر اپنے گھر تک پہنچ گیا لیکن دہلیز پر گرا اور مر گیا۔ یہ نوٹ اور کاغذ لڑائی کے دوران گرے ہوں گے۔

جے پال واپس مقتول کے گھر چلا گیا اور اس کی بیوی سے پوچھنے لگا کہ اس کے مقتول خاوند کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ بیوی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ جے پال بھی مقتول کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جمالی کرائمز برانچ کا مخبر ہے اور اس نے افسروں کے ساتھ بڑا اچھا تعلق پیدا کر رکھا تھا۔

صبح بڑی اچھی طرح روشن ہو چکی تھی۔ جے پال مقتول کی بیوی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا کہ پھر ایک آدمی نے اسے آکر بتایا کہ گلی میں اس نے اور کچھ اور لوگوں نے خون کے دھبے دیکھے ہیں۔ جے پال فوراً اٹھا اور پھر اس گلی میں چلا گیا ...... یہ خون کے قطرے تھے جو گلی میں گرتے آئے تھے۔ جے پال نے ہمیں بتایا کہ ہر دھبہ اٹھنی جتنا بڑا تھا یعنی آج کے پچاس پیسے کے سکے جتنا بڑا۔ ہر دھبے یا قطرے کے درمیان پانچ چھ قدم یا اس سے کم فاصلہ تھا۔ بعض دھبوں پر گلی میں چلنے والے لوگوں کے پاؤں آگئے تھے لیکن غور سے دیکھنے سے دھبہ نظر آجاتا تھا۔

جے پال خون کے یہ دھبے دیکھتا آیا اور آخری دھبہ مقتول کے گھر سے دس بارہ قدم دور تھا اور وہاں دھبوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ جے پال پھر واپس چل پڑا اور دھبے دیکھتا گیا۔ دھبے اسے اس گلی میں سے ایک اور گلی میں لے گئے اور یہ گلی آگے سے مڑتی تھی، اس میں بھی یہ دھبے نظر آئے اور ایک جگہ دھبوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا اور پھر ایک جگہ دھبے ختم ہو گئے۔

جے پال عقل والا اور تجربے والا تھانیدار تھا۔ اس نے لاش دیکھی تو لاش کے

ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا اور ناک کے باہر یعنی نتھنوں میں خون جما ہوا تھا۔ اس نے بالکل ٹھیک سوچا کہ مقتول کو کہیں اور قتل کیا گیا اور اس کی لاش کندھے پر اٹھا کر اس کے گھر لائی گئی۔ لاش کا منہ نیچے ہو گا اس لئے اس کی ناک سے خون گرتا رہا۔ اگر مقتول اپنے پاؤں چل کر گھر تک پہنچا ہوتا تو خون سے اس کے کپڑے لال ہوتے لیکن اس کے کپڑوں پر خون کا ذرا سا بھی دھبہ یا قطرہ نہیں تھا۔

اب جے پال کی توجہ جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا کی طرف ہو گئی۔ جمالی کوئی شریف آدمی تو نہیں تھا۔ اس کا اپنے جیسے کسی بدمعاش کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہو گا اور اس کے سر پر ضرب لگا کر مار گیا اور اس کی لاش اٹھا کر اس کے دروازے میں پھینک دی گئی۔ لاش ہمدردی کی وجہ سے نہیں پھینکی گئی ہو گی بلکہ یہ ایک قسم کی طنز تھی کہ یہ لو اپنے آدمی کی لاش وصول کر لو۔ اس سے جے پال کو پھر جمالی کی بیوی پر شک ہوا۔ اگر جمالی کی لاش طنز کے طور پر اس کے دروازے پر پھینکی گئی تھی تو یہ طنز مقتول کی بیوی پر کی گئی تھی لیکن بیوی کہتی تھی کہ وہ جمالی کے کسی بھی دشمن کو نہیں جانتی نہ ہی اس کی باہر کی سرگرمیوں اور کام کاج سے اسے کچھ واقفیت تھی۔

جے پال نے اب پوری توجہ جرائم پیشہ لوگوں پر مرکوز کر لی تھی اور کچھ چیدہ چیدہ جرائم پیشہ افراد کو تھانے بلا کر پابند کر لیا تھا اور ان پر جی بھر کر تشدد کر رہا تھا۔ اس نے ٹھیک سوچا تھا کہ جمالی کا دشمن اسی کی زمین دوز دنیا کا ہی کوئی فرد ہو سکتا تھا۔ اس کے مخبر پوری طرح سرگرم تھے لیکن انہیں کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ تمام مخبر یہی ایک رپورٹ دیتے تھے کہ جمالی کا کوئی دشمن نہیں تھا اور نہ کوئی اس سے دشمنی مول لیتا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ جمالی کا اثر ورسوخ پولیس کے افسروں تک ہے اور وہ ملٹری انٹیلی جنس کا کام بھی کرتا ہے۔

ہم نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس طرح تفتیش شروع کر دی جیسے ہمیں مقتول کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔ میں اور سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو اپنی کوئی لائن اختیار کرنا چاہتے تھے۔

محبت کے اندھے

پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ مقتول کے سر پر وزنی ڈنڈا یا لاٹھی یا کوئی وزنی چیز ڈنڈے کی شکل میں ماری گئی جس سے اس کا دماغ مجروح ہو گیا تھا۔ دماغ سے خون نکلتا رہا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ کھوپڑی کی کھال ذرا سی بھی نہیں پھٹی لیکن کھوپڑی ذرا سی فریکچر ہو

گئی تھی۔ دماغ سے اگر خون نکلے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ خون جسم کے اندر جاتا رہتا ہے اور بعض کیسوں میں یہ خون ناک اور منہ کے راستے باہر آتا ہے۔ ہم بھی اسی رائے کو صحیح تسلیم کرنے لگے کہ مقتول کو کہیں اور مارا گیا اور اسے کندھے پر یا کسی ایسے طریقے سے اٹھا کر گھر لایا گیا کہ اس کا منہ نیچے کی طرف تھا اور خون ناک کے رستے گلی میں گرتا آیا۔

ہم نے بھی توجہ جرائم پیشہ لوگوں پر مرکوز کر دی اور اپنے مخبر سرگرم کر دیئے۔ جے پال سے کہا کہ وہ مقتول کے محلے کے اور اس آبادی کے ایسے دو تین معززین ہمارے کرائمز برانچ کے دفتر میں بھیج دے جو جمالی کے گھر سے واقف ہوں اور دوسرے گھروں کی بھی خبر رکھتے ہوں...... میں نے اپنی کہانیوں میں کئی بار بتایا ہے کہ یہ خاص قسم کے معززین ہوتے تھے جن کا اپنے اپنے محلے میں رعب داب ہوتا تھا لیکن وہ درپردہ پولیس کے مخبر ہوتے تھے۔ وہ تھانیدار کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور ضرورت پڑتی تو ایک دوسرے کی مخبری بھی کر دیتے تھے۔ جے پال کو معلوم تھا کہ ہمیں اسی قسم کے معززین کی ضرورت ہے۔

ایسے تین معززین شام سے کچھ پہلے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ان سے ہم نے مقتول کی بیوی کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ مقتول کی بیوی بڑی خوبصورت عورت ہے اور پینتیس چھتیس سال عمر کی ہے۔ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ اس عورت نے ایک غنڈے اور بدمعاش کے ساتھ شادی کر لی ہے۔

اس عورت کی پہلی شادی انیس بیس سال کی عمر میں ایک عزت دار گھرانے میں ہوئی تھی۔ وہ آدمی سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ اس کے ساتھ اس عورت کی بن ہی نہ سکی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لڑاکی قسم کی عورت تھی اور خاوند کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہ ہوئی۔ ہمیں ان معززین نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ اولاد نہ ہونے کا نقص اس عورت میں تھا۔ سات آٹھ سال بعد اس شخص نے اس عورت سے تنگ آ کر طلاق دے دی۔ پانچ چھ سال بعد اس عورت نے جمالی کے ساتھ شادی کر لی۔

ہمیں بتایا گیا کہ اس عورت کو طلاق ہوئی تھی تو اس کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا نہ اس نے کسی بچے کو دودھ پلایا تھا اس لئے اس کی جوانی اس طرح برقرار رہی کہ اپنی اصل عمر سے بہت کم کی لگتی تھی۔ خاندان بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور امید یہی تھی کہ اس کی خوبصورتی کو ہی دیکھ

کر کوئی بھلا آدمی اس کے ساتھ شادی کر لے گا لیکن کسی نے اس گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ عورت اپنی عادات اور اکھڑ پن کی وجہ سے کتنی بدنام تھی ...... ان معززین نے یہ بھی ہمیں وثوق سے بتایا کہ چار پانچ سال بعد اس عورت نے جمالی سے ملنا جلنا شروع کر دیا تھا اور اکثر اس کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔

جمالی نے شاید کبھی جوانی میں شادی کی ہو گی لیکن ہم نے اسے ہمیشہ تنہا ہی دیکھا اور وہ اسی تنہائی میں خوش رہتا تھا۔ اب اس کی دوستی اس عورت کے ساتھ ہو گئی تو کچھ عرصہ دوستی چلا کر اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ اس عورت نے اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے جمالی کے ساتھ شادی کی تھی جمالی جیسے آدمی کو کوئی شریف گھرانہ لڑکی دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس عورت نے من مانی کر لی۔

ہم نے ان معززین سے پوچھا کہ جمالی کے ساتھ اس عورت کا وقت کس طرح گزرتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جمالی نے اس عورت کو دبا لیا تھا لیکن دیکھا یہ گیا کہ یہ عورت جمالی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے رکھتی تھی۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ پیار والی تھی، لڑائی جھگڑنے والی نہیں۔ سارا محلہ گواہ تھا کہ جمالی کے ساتھ اس عورت نے وہ سلوک نہ کیا جو وہ پہلے خاوند کے ساتھ کرتی تھی۔

یہ بھی پتہ چلا کہ اس عورت کے پہلے خاوند نے شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس ایک شادی نے اسے ایسا سبق سکھا دیا ہے کہ وہ اب کسی اور عورت کو اپنے گھر لا کر آباد نہیں کرے گا لیکن پچاس سال کی عمر میں اس شخص نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس وقت اس آدمی کی عمر پچاس سال تھی اور یہ نوجوان بیوی اس کے گھر میں آباد تھی۔ اس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عورت کے پہلے خاوند کی یہ دوسری نوجوان بیوی چند مرتبہ اس عورت کے پاس آئی تھی اور اس کے گھر میں کچھ وقت گزار کر جاتی رہی ہے۔ یہ بات سن کر ہم کچھ حیران ہوئے کہ ان دونوں کی تو آپس میں بات چیت ہونی ہی نہیں چاہئے تھی لیکن ان کی آپس کی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ سب انسپکٹر سندھو نے کہا کہ اس نوجوان لڑکی کا تو سوچو ہی نہیں۔ میں نے بھی اسے ذہن سے اتار دیا۔

جہاں تک میں جمالی کو جانتا تھا، وہ غنڈہ اور بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور تھا لیکن اوچھا آدمی نہیں تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھکیں مارنے والا آدمی نہیں تھا نہ کسی پر بلاوجہ

رعب جھاڑتا تھا۔ محلے کے لوگوں کے متعلق سنا کہ وہ جمالی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ جمالی ایک معزز آدمی کی طرح ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا اور جس کسی کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی، جمالی اسے مدد دیتا تھا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جمالی کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا تھا لیکن شک یہ سوچ کر ہوتا تھا کہ جمالی کی زمین دوز دنیا میں طرح طرح کے لوگ موجود تھے اور وہ گھٹیا قسم کے آدمی بھی تھے اور وہ پیشہ ور بھی تھے۔

ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ ملٹری انٹیلی جنس اپنے دوسرے مخبروں کے ذریعے جمالی کے قتل کی تفتیش کر رہی تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کا طریقہ اور انداز کچھ اور تھا۔ اس محکمے نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ جمالی کو دشمن کے کسی جاسوس اور تخریب کار نے قتل تو نہیں کر دیا۔

دو دنوں بعد جمالی کی دنیا کے دو آدمی ہمارے پاس آ گئے۔ وہ جمالی کی طرح کے آدمی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ قتل کی شام وہ ان کے ساتھ تھا اور وہ بالکل نارمل اور خوش باش تھا۔ انہوں نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی پی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جمالی ان کے ساتھ کھانا کھائے لیکن جمالی نے کہا تھا کہ وہ کھانا بیوی کے ساتھ ہی کھائے گا وہ اس کے انتظار میں ہو گی۔

بیوی کا ذکر آیا تو سندھو نے ان سے پوچھا کہ جمالی کے گھریلو حالات کیسے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گھریلو حالات بہت ہی اچھے تھے اور جمالی اپنی بیوی سے دلی محبت کرتا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کیا کرتا تھا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ شادی سے پہلے جمالی کے ناجائز مراسم اس بیوی کے ساتھ شروع ہو گئے تھے اور یہ عورت اسی طرح یعنی جمالی کی ہی طرح اس کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔ جمالی تو کہا کرتا تھا اس کی تو زندگی سنور گئی ہے۔

''وہ گھر کس وقت گیا تھا؟''—— سندھو نے پوچھا۔

''ہمارے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھا''—— ایک نے جواب دیا—— ''ہم نے تھوڑی تھوڑی پی اور کچھ تھوڑا سا کھایا اور پھر ہم تینوں اکٹھے نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے جمالی کے گھر تک چلے گئے اور پھر سلام دعا کے بعد وہ اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور ہم آگے نکل گئے''۔

اس سے ہم بجا طور پر یہ سمجھے کہ وہ شام کے بعد اپنے گھر چلا گیا تھا اور اس نے کھانا اپنی بیوی کے ساتھ کھایا اور پھر اسی وقت یا کچھ دیر بعد باہر چلا گیا اور قتل ہو گیا۔ یہ تو اس کی بیوی بتا سکتی تھی کہ وہ گھر سے کس وقت نکلا تھا اور کیا وہ کچھ بتا کر نکلا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

ایک دن اور صرف کر کے ہم نے پوری طرح یقین کر لیا کہ جمالی کا قاتل اس کی

زمین دوز دنیا کا آدمی نہیں اور نہ کسی کے ساتھ اس کا لڑائی جھگڑا تھا۔ البتہ انٹیلی جنس کے میدان میں اس کا کوئی دشمن تھا یا نہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہم نے اسے اس کی سوشل زندگی میں دیکھنا تھا کہ آخر ہوا کیا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔

خوبصورت جسم، خبیث روح

ہم نے مقتول کی بیوی کو ہیڈ کوارٹر میں بلایا۔ وہ پینتیس چھتیس سال کی خوبصورت عورت تھی اور واقعی وہ اپنی عمر سے کم لگتی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک بڑی ہی غور سے دیکھا اور خاص طور پر اس کے چہرے پر غور کیا۔ اس کے نقش ونگار اور ڈیل ڈول اور انداز ایسے تھے جس سے پولیس والے عموماً واقف ہوتے ہیں۔ اگر میں چہرہ شناسی میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو وہ صرف چالاک ہی نہیں بلکہ عیار عورت تھی۔ ایسی عورتیں آدمیوں کو آپس میں ٹکرا کر خون خرابہ کرا دیا کرتی ہیں اور پھر مظلوم اور معصوم بن کر الگ رونے بیٹھ جاتی ہیں۔

''قتل کی رات جمالی گھر سے کس وقت نکلا تھا؟''۔۔۔ سب انسپکٹر سندھو نے پوچھا۔

''وہ شام کو ہی نکل گیا تھا''۔۔۔ اس عورت نے جواب دیا۔

''کیا وہ کھانا کھا کر نکلا تھا؟''۔۔۔ سندھو نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔۔۔ ''نہیں، نہیں...... وہ کھانا کھا کر گیا تھا''۔

''پھر وہ کس وقت واپس آیا تھا؟''

''پھر وہ واپس نہیں آیا''۔۔۔ عورت نے جواب دیا۔۔۔ ''آدھی رات کو باہر نکلی تو اسے دروازے میں پڑا ہوا پایا......''

''وہ شام کو گھر سے نہیں نکلا تھا''۔۔۔ سندھو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔ ''وہ شام کو گھر آیا تھا...... اب بتاؤ کون سی بات سچی ہے، وہ شام کو گیا تھا یا شام کو واپس آیا تھا؟''

''وہ شام کو گیا تھا''۔۔۔ عورت نے کہا۔۔۔ ''اور پھر واپس نہیں آیا''۔

میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اس عورت کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بات کرتے ہکلا جاتی تھی۔ اس سے شک ہو رہا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''میری ایک بات سن لو بشریٰ''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم جو جھوٹ بولو گی وہ

تمہارے خلاف جائے گا اور ہم تمہیں اپنے خاوند کے قتل کے شک میں گرفتار کر لیں گے۔ ہم جانتے ہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ پہلے اس سوال کا جواب دو کہ تم جھوٹ کیوں بول رہی ہو؟''

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کبھی میرے منہ کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی سندھو کے منہ کی طرف۔ اس پر ہمیں شک ہونے لگا۔

''یہ بتاؤ''۔۔۔ سندھو نے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔۔۔ ''تمہارے پہلے خاوند کی بیوی تمہارے پاس آتی ہے؟''

''نہیں!''۔۔۔ بشریٰ نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ تو میرے ہاں کبھی نہیں آئی''۔

سندھو نے کچھ سوچ کر یہ سوال کیا تھا لیکن بشریٰ جھوٹ بول گئی۔ سندھو اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ سندھو نے اس کانسٹیبل سے کہا کہ اس عورت کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور کمرے میں بٹھا کر خود وہیں موجود رہو۔

''ملک جی!''۔۔۔ سندھو نے مجھے کہا۔۔۔ ''یہ عورت صاف نہیں...... جے پال کا نمبر ملاؤ''۔

ٹیلی فون ہمارے دفتر میں موجود تھا۔ سندھو نے خود ہی نمبر ملایا اور جے پال مل گیا۔ سندھو نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ جے پال نے بھی بشریٰ سے بیان لیا تھا۔ سندھو اس بیان میں سے کچھ باتیں جے پال سے پوچھ رہا تھا۔ جے پال نے بھی بتایا کہ اس کے مخبروں نے اسے بتایا تھا کہ جمالی فلاں فلاں آدمی کے ساتھ شام کو اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جے پال نے کچھ اور باتیں بتائیں جو بشریٰ کے خلاف جاتی تھیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بشریٰ نے جے پال کے ساتھ کچھ اور باتیں کی تھیں اور ہمارے پاس آ کر بالکل جھوٹ بول رہی تھی۔

سندھو اور جے پال کے درمیان خاصی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ بعد میں سندھو نے مجھے بتایا کہ اس عورت کے متعلق جے پال کی رائے اچھی نہیں۔ جے پال کی جو باتیں سندھو سے ہوئی تھیں وہ سندھو نے مجھے بتائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بشریٰ نے اپنے خاوند کو اگر قتل نہیں کیا تو اسے معلوم ضرور ہے کہ قاتل کون ہے یا قتل کی وجہ کیا ہے۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا اور سندھو نے بھی یہی بات نوٹ کی تھی کہ عورت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میری گل من ملکا!''۔۔۔ سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔۔۔

''اس کے پہلے خاوند کو بلاتے ہیں۔ وہ بتائے گا کہ یہ عورت چیز کیا ہے''۔

ہم نے اگلے روز اس کے پہلے خاوند کو بلا لیا۔

وہ صحیح معنوں میں معزز آدمی تھا۔ اس کی عمر پچاس سال یا اس سے ذرا ہی زیادہ ہو گی۔ چہرے سے، لباس اور انداز سے وہ عزت دار اور تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ ہم نے اسے اسی احترام سے بٹھایا جس احترام کا وہ حقدار تھا۔

''آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کی پہلی بیوی کا دوسرا خاوند قتل ہو گیا ہے''—— میں نے اسے کہا—— ''ہم آپ سے آپ کی پہلی بیوی کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امید رکھیں گے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے''۔

اس نے تعاون کا وعدہ کیا اور بشریٰ کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ عورت جتنی خوبصورت اور جسم کے لحاظ سے کشش والی ہے، اس کی فطرت اتنی ہی گندی اور خطرناک ہے۔ اس کی خوبصورتی تو حوروں جیسی ہے لیکن اندر سے یہ مکمل شیطان ہے۔ اس نے بشریٰ کو چڑیل بھی کہا اور بدروح بھی۔ اس نے کہا کہ یہ دو انسانوں کے درمیان غلط فہمیاں اور فساد پھیلانے میں لذت محسوس کرتی ہے۔ اس کی دوسری خطرناک عادت غیبت ہے۔ اس کے منہ سے کبھی صلح صفائی کی بات نہیں نکلی نہ کسی کے لئے اس کی زبان سے خیر کا کلمہ نکلتا ہے، اسے دوسروں میں نقائص اور خرابیاں ہی نظر آتی ہیں۔

اس شخص نے جس کا نام جہانگیر تھا بشریٰ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی باتیں بتائیں، میں یہ آپ کو مختصر کر کے بتاتا ہوں۔ نوجوانی کی عمر میں بشریٰ اور جہانگیر کی شادی ہوئی تھی۔ جہانگیر اس کی خوبصورتی پر مرمٹا اور اسے ایک نشہ یا جادو سمجھ کر اپنے اوپر طاری کر لیا۔ جہانگیر اسے معصوم اور بھولی بھالی لڑکی سمجھتا رہا لیکن شادی کے بعد ایک ہفتہ ہی گزرا ہو گا کہ بشریٰ نے پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ جہانگیر نے دیکھا کہ یہ جو اتنی بھولی بھالی اور معصوم نظر آتی ہے، باتوں اور حرکتوں میں بوڑھی عورتوں جیسی پختہ کار ہے اور بوڑھی عورتوں کی طرح باتیں کر سکتی ہے بلکہ کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے بشریٰ کے نوجوان اور خوبصورت جسم میں کوئی خبیث روح چھپی ہوئی ہے۔

جہانگیر کے والدین کی خاصی کشادہ حویلی تھی جس میں جہانگیر کا باپ، ماں اور اس کا بڑا بھائی جو بیوی بچوں والا تھا، رہتا تھا۔ ان سب کی گھریلو زندگی بڑی اچھی اور خوش و خرم گزر رہی تھی لیکن بشریٰ اس گھر میں بیاہ کر آئی تو اس نے جھوٹ بول بول کر ایسی فضا پیدا کر

دی کہ ہر کسی کو ہر کسی کے خلاف غلط فہمیاں سی پیدا ہونے لگیں۔ بشریٰ کچھ تو خوبصورت تھی، معصوم سی بھی لگتی تھی اس لئے سب کہتے تھے کہ یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول سکتی لیکن جھوٹ اس کی فطرت کا بنیادی پتھر تھا۔ وہ بلاضرورت بھی جھوٹ بولتی تھی۔

اس خاندان کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ جہانگیر خود بھی ملازم تھا اور اس کا باپ پنشن لیتا تھا اور زیادہ آمدنی جہانگیر کے بڑے بھائی کی تھی کیونکہ اس کا جنرل سٹور تھا جو بہت اچھا چل رہا تھا۔ یہ ساری آمدنی باپ کے پاس اکٹھی ہو جاتی تھی اور باپ اس آمدنی کو صحیح طریقے سے تقسیم اور خرچ کرتا تھا۔ اس گھر میں برکت ہی برکت تھی لیکن بشریٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اس گھر سے برکت اٹھنے لگی۔ دراصل بشریٰ چاہتی یہ تھی کہ اس کا تعلق صرف اس کے خاوند کے ساتھ رہے اور خاوند اپنی ساری تنخواہ اس کے ہاتھ میں دیا کرے۔ جہانگیر کو یہ صورت منظور نہیں تھی۔

جہانگیر نے بتایا کہ بشریٰ کسی غریب گھر سے تو نہیں آئی تھیں لیکن خرابی یہ تھی کہ بشریٰ کے ماں باپ کی نظریں بھوکی تھیں اور وہ دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھ لیا کرتے تھے۔ بشریٰ کی ماں لالچی عورت تھی، اس نے اپنے خاوند کو اس گھر میں آتے ہی اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور قبضے میں بھی ایسا لیا کہ اسے کٹھ پتلی بنا لیا تھا۔ بشریٰ نے اپنے گھر میں جو کچھ دیکھا اور ماں نے اسے جو کچھ سکھایا، اس کے مطابق وہ جہانگیر کے گھر میں ازدواجی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی اور اسی کو جائز اور صحیح سمجھتی تھی۔ جہانگیر کے گھر کی اتنی زیادہ آمدنی دیکھ کر بشریٰ کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔

جہانگیر نے تسلیم کیا کہ یہ غلطی اس کی تھی وہ اس لڑکی کے حسن سے اور اس کی فریب کارانہ باتوں سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس کے دل سے اپنے ماں باپ کا احترام اور بھائی کی محبت تقریباً نکل گئی تھی۔ بشریٰ بات ایسے انداز سے کرتی تھی کہ جہانگیر سچ سمجھ لیتا تھا۔ یوں کہیں کہ جہانگیر بشریٰ کی محبت میں عقل کا اندھا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا اور وہ جتنے پیسے مانگتی تھی دے دیتا تھا۔ یہ تو کئی سالوں بعد جہانگیر کو پتہ چلا کہ بشریٰ اس طرح پیسے بٹور کر اور مار کر اپنے ماں باپ کو دے آتی تھی۔ جہانگیر اسے اس کی فرمائش کے مطابق کپڑے سلوا دیتا تو یہ کپڑے بھی وہ اپنے میکے چھوڑ آتی تھی۔

بشریٰ کی ماں تو اور زیادہ چالاک عورت تھی۔ اس نے بھی جہانگیر پر اپنا جادو چلا رکھا تھا۔ جہانگیر کبھی ان کے ہاں جاتا تو یہ عورت اور بشریٰ مل کر اس کے ساتھ اتنا زیادہ پیار اور

اتنی زیادہ محبت کرتیں کہ جہانگیر ان کے آگے ریت کی ڈھیری بن جاتا اور اپنی جیبیں ان کے آگے خالی کر دیا کرتا تھا۔ بشریٰ کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے ناشکری تھی اور اس نے محلے میں جہانگیر کے والدین، بھائی اور بھائی کی بیوی کو بدنام کر دیا تھا۔ یہ الفاظ بشریٰ کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے کہ میں ہی جانتی ہوں کہ اس گھر میں کس طرح گزارہ کر رہی ہوں، یعنی وہ اس گھر میں بہت تنگ اور پابند تھی۔

بشریٰ نے جہانگیر کے بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ ایک روز لڑائی مول لے لی اور قرآن کی قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولے کہ غلطی اس کی نہیں بلکہ بڑے بھائی کی بیوی کی تھی۔ جہانگیر اور اس کے گھر والوں کو پہلی بار پتہ چلا کہ یہ لڑکی تو بڑی ہی لڑاکی اور خطرناک ہے اور یہ ان عورتوں میں سے ہے جو مردوں کے سر کھلوا دیا کرتی ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد بشریٰ کے بھڑکانے سے جہانگیر کی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تلخ کلامی ہوگئی اور دونوں بھائیوں میں رنجش چل پڑی۔

اس کے بعد اس گھر کا یہ حال ہوگیا کہ کسی کی کسی کے ساتھ لڑائی رہنے ہی لگی تھی۔ بشریٰ کو سارے محلے میں وہی لڑکی یا عورت اچھی لگتی تھی جو اسی جیسی تنگ نظر اور شیطان فطرت تھی۔ محلے میں اس قسم کی دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے گھروں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ بشریٰ کو سبق دیتی رہتی تھیں کہ اپنے سسرال کو چین نہیں لینے دینا چاہئے ورنہ یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ جہانگیر کے گھر والوں کو اب پتہ چلا کہ بشریٰ کے والدین اصل جھوٹے اور فریب کار لوگ ہیں۔

اس بے برکتی کے اثرات یہ دیکھنے میں آئے کہ جہانگیر کا باپ بیمار بیمار رہنے لگا اور جہانگیر کے بڑے بھائی کا کاروبار نقصان میں جانے لگا۔ باپ کی بیماری دراصل ذہنی اور اعصابی تھی۔ اس نے گھر میں شرافت، وقار اور ڈسپلن رکھا ہوا تھا۔ یہ سب طور طریقے تباہ ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے بتایا کہ گھروں میں گھر کے افراد کا چھوٹا موٹا تصادم تو ہو ہی جایا کرتا ہے اور کچھ دیر بعد کوئی نہ کوئی محسوس کرتا ہے کہ یہ تو زیادتی ہوئی ہے تو وہ جھگڑا رفع دفع کر کے گھر کی فضا کا سارا تکدر صاف کر دیتا ہے پھر کسی کے دل میں کسی کے خلاف ناراضگی نہیں رہتی لیکن اس گھر میں صلح جوئی اور درگزر تو ختم ہوگیا تھا۔ گھر میں کشیدگی بلکہ عداوت کا ماحول بنا رہتا تھا۔

بشریٰ کا عالم یہ تھا کہ وہ معاف کرنا تو جانتی ہی نہیں تھی۔ جھوٹ بول کر الزام تراشی

کرتی اور پھر اس کے بعد طے کر لیتی تھی کہ یہ طوفان کھڑا کر کے ہی رہنا ہے۔ اس کی فطرت میں کینہ پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس میں انتقامی جذبہ تھا۔ چھوٹی سی بات کا بھی وہ انتقام لے کر ہی رہتی تھی۔

تقریباً چھ سال گزر گئے تو جہانگیر کو محسوس ہونے لگا کہ بشریٰ اس کی محبت کا غلط استعمال ہی نہیں کر رہی بلکہ اس کی محبت کی توہین کر رہی ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ بشریٰ چوری چکاری بھی کر گزرتی ہے۔

جہانگیر اور اس کے والدین کی شرافت کا تو یہ عالم تھا کہ چھ سال گزر گئے تھے اور بشریٰ کا ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ دوبارہ دو مختلف لیڈی ڈاکٹروں سے چیک کروایا تو پتہ چلا تھا کہ بشریٰ کی ٹیوبیں قدرتی طور پر بند ہیں اور اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے باوجود جہانگیر کے ماں باپ نے اسے قبول کئے رکھا بلکہ اس کی پوری ابلیسیت کے باوجود قبول کئے رکھا۔ جہانگیر کو تب خیال آیا کہ بشریٰ تو کسی پہلو قابل قبول نہیں۔ اگر اس کے ایک دو بچے پیدا ہو جاتے تو شاید اس کے دل میں سچا پیار پیدا ہو جاتا۔ خدا نے بچہ بھی نہ دیا اور بشریٰ انسانیت کے درجے سے گرتی چلی گئی۔

جہانگیر نے جب دیکھا کہ اس کا باپ بالکل ہی بستر پر گر پڑا ہے تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔ جہانگیر جانتا تھا کہ اس کے باپ کو گھر کے سکون کی بربادی کا صدمہ لے بیٹھا ہے۔

اس آبادی سے تھوڑی ہی دور ایک گاؤں میں ایک بزرگ رہتا تھا جو روحانی بابا کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ لوگ اس کے پاس اپنی مرادیں اور مسائل لے کر جایا کرتے تھے۔ جہانگیر نے بھی اس کی شہرت سنی تھی لیکن اس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی عام قسم کے عاملوں اور جوتشیوں جیسا کوئی فراڈ ہوگا لیکن پتہ چلا تھا کہ وہ بندے کو دیکھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ اس شخص میں فطری نقائص کیسے ہیں اور یہ نقائص اسے کہاں تک پہنچائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ وہ کوئی عالم فاضل اور فطرت شناس تھا۔ جہانگیر نے بتایا کہ ایک روز وہ بشریٰ کو اس بہانے روحانی بابا کے پاس لے گیا کہ اسے بتائیں گے کہ اولاد نہیں ہوتی۔ جہانگیر دراصل ایک روز پہلے اس روحانی بابا کے پاس گیا تھا اور اس نے بشریٰ کے متعلق بتایا تھا کہ اس میں کیا خرابیاں ہیں اور اس کا کوئی ایسا علاج کیا جائے کہ اس کی فطرت سے شیطانیت نکل جائے اور انسانیت آجائے۔

جہانگیر نے ہمیں سنایا کہ اس بزرگ نے بشریٰ کو بڑی اچھی طرح دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر نظریں جما دیں اور پھر اس کی آنکھوں میں قریب ہو کر جھانکا اور پیچھے ہٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھنے لگا۔ آنکھیں کھول کر اس نے پھر بشریٰ کو دیکھا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ دیکھے اور بشریٰ کو باہر بھیج دیا۔

''دیکھو میاں!'' ــــ روحانی بابا نے جہانگیر سے کہا ــــ ''میں کسی کی ازدواجی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا کہ یہ گناہ ہے لیکن میں اس لڑکی کی ازدواجی زندگی کا خیال کرتا ہوں تو تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی''۔

''بابا جان!'' ــــ جہانگیر نے اس کی بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی کہا ــــ ''صرف میری نہیں بلکہ میرے پورے گھر کی پرسکون زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اسی لئے اسے آپ کے پاس لایا ہوں''۔

''پھر اسے طلاق دے دو'' ــــ روحانی بابا نے کہا ــــ ''بعض انسان منحوس ہوتے ہیں۔ یہ علم سمجھنے کی کوشش نہ کرو، یہ لڑکی اپنی فطرت میں نحوست اٹھائے ہوئے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر انسان کو فرشتوں کی پاکیزگی دے کر دنیا میں بھیجتا ہے لیکن کچھ ماں باپ ایسے ہوتے ہیں جو ان فرشتوں کو شیطان بنا دیتے ہیں۔ اس لڑکی کی فطرت ایسی بن گئی ہے جس پہ کوئی تعویذ اور کوئی روحانی عمل اثر نہیں کر سکتا۔ اگر اسے اپنے پاس رکھو گے تو یہ کسی بھی وقت خون خرابہ کرا دے گی''۔

روحانی بابا نے صاف الفاظ میں جہانگیر کو بتا دیا کہ یہ لڑکی جہاں بھی قدم رکھے گی وہاں کے حالات الٹا ہی پلٹا کھا جائیں گے۔ روحانی بابا نے عجیب بات یہ بتائی کہ یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے لئے ہی بابرکت ہے کیونکہ اس کے ماں باپ جھوٹ اور فریب کاری کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔

جہانگیر نے آخر بشریٰ کو طلاق دے دی۔ بشریٰ اس گھر سے نکلی تو یہ کہہ کر نکلی کہ جہانگیر، جب بھی موقع ملا میں تمہیں دنیا کے تختے سے اٹھا دوں گی۔

بشریٰ کا گھر اسی آبادی کے ایک اور محلے میں تھا جو جہانگیر کے گھر سے دور نہیں تھا۔ بشریٰ اپنی دوسری شادی تک یہ دھمکی دوہراتی رہی کہ وہ جہانگیر سے انتقام لے گی۔ وہ جس عورت سے ملتی اور جہاں جا بیٹھتی یہ دھمکی ضرور سناتی تھی۔

''اس عورت کا کردار دیکھیں'' ــــ جہانگیر نے کہا ــــ ''طلاق کے دو اڑھائی سال

بعد بشریٰ نے جمالی کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے۔ جمالی ان کے گھر جاتا رہتا تھا۔ مجھے دوست کہتے تھے کہ تم نے اچھا کیا کہ اُسے طلاق دے دی تھی۔ آپ اس آبادی کے کسی شخص سے پوچھ لیں، وہ آپ کو بشریٰ اور جمالی کے یارانے کی باتیں سنائے گا لیکن جناب! بشریٰ کو بدنامی کی ذرا سی بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی اور آبادی میں گھومتی پھرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ماں باپ کو بھی پرواہ نہیں تھی کہ بیٹی بدنام ہو گئی ہے۔ جمالی ان کے منہ میں ہڈی دیئے رکھتا ہو گا...... وہ تو جو ہوا سو ہوا ہو گا، میرے ساتھ ٹریجیڈی یہ ہوئی کہ والد صاحب صدمے سے فوت ہو گئے اور اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد والدہ بھی فوت ہو گئیں۔ بڑا بھائی بشریٰ کے سلوک سے اور اس کی آئے دن کی لڑائیوں سے تنگ آ کر الگ ہو گیا تھا۔ وہ اس آبادی سے ہی نکل گیا اور اپنا جنرل سٹور بھی شفٹ کر لیا۔ بشریٰ نے ہم دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا''۔

''ایک ذاتی سوال پوچھ رہا ہوں'' ــــ میں نے کہا ــــ ''آپ نے اس عمر میں آ کر ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ کیا یہ نوجوان بیوی آپ سے خوش رہتی ہے؟''

''یہ آپ اس سے پوچھیں'' ــــ جہانگیر نے مسکرا کر پراعتماد لہجے میں کہا ــــ ''میں تو یہی کہوں گا کہ خوش رہتی ہے...... میں جانتا ہوں آپ نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ آپ شاید سن کر حیران ہوں گے کہ اس لڑکی کے ساتھ میں نے نہیں بلکہ لڑکی نے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ یہ اس کی مرضی اور پسند کی شادی ہے''۔

''مجھے اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں'' ــــ میں نے کہا ــــ ''ویسے ہی پوچھ لیا ہے۔ بات دراصل یہ کرنی تھی کہ سنا ہے آپ کی بیوی بشریٰ سے ملتی ملاتی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟''

''میں نے بھی سنا تھا'' ــــ جہانگیر نے جواب دیا ــــ ''بشریٰ کا گھر کوئی زیادہ دور نہیں، عورتوں کی ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو روکا نہیں بلکہ اسے بشریٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ کس فطرت کی عورت ہے۔ میں کوئی ایسا تنگ نظر بھی نہیں کہ بیوی کے پاؤں میں بیڑیاں اور زبان پر تالے ڈال دوں۔ میں کچھ وہمی ضرور ہوں لیکن بے جا پابندیوں کا قائل نہیں ہوں۔ آپ یہ باتیں میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں''۔

''نہیں جہانگیر صاحب!'' ــــ میں نے کہا ــــ ''یہ آپ کا اور آپ کی بیوی کا ذاتی معاملہ ہے، میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ آپ سے ایک بات اور پوچھنی ہے۔ بشریٰ

کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، کیا یہ عورت قتل کروا سکتی ہے؟؟''

آج جب میں اس وقت کو ذہن میں تازہ کر رہا ہوں تو مجھے جہانگیر اپنے سامنے بیٹھا نظر آ رہا ہے۔ میرا سوال سن کر پہلے تو اس نے سر جھکا لیا اور پھر سر اٹھا کر مسکرایا۔

''یہ عورت جو چاہے کر سکتی ہے'' ــــ جہانگیر نے جواب دیا ــــ ''اور جو چاہے کروا سکتی ہے۔ ہم تو امن پسند اور عزت دار لوگ تھے، کئی باتیں ٹال جاتے تھے ورنہ اس عورت نے ہمیں پڑوسیوں سے بھی ٹکرا دیا تھا۔ میں جمالی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے ساتھ سلام دعا بھی تھی۔ وہ قتل کر بھی سکتا تھا اور قتل کروا بھی سکتا تھا لیکن چھوٹی موٹی لڑائیاں نہیں لڑتا تھا۔ اس کی بیوی یعنی بشریٰ نے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کر لئے ہوں گے۔ اس کے لئے یہ کوئی مذموم حرکت نہیں۔ اگر اس نے جمالی کو قتل کروا دیا ہے تو میں حیران نہیں ہوں گا''۔

سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو نے اس سے کچھ اور سوال پوچھے اور پھر ہم نے اسے رخصت کر دیا۔ ان دنوں وہ ایک سرکاری محکمے میں ایک گزٹیڈ پوسٹ پر تھا۔

مسلمانی کا جال

بشریٰ کو ہم نے ہیڈ کوارٹر میں ہی روکا ہوا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ کتنی پریشان ہو گی۔ ہم اسے اس سے بھی زیادہ پریشان کرنا چاہتے تھے۔ اس عورت کے متعلق ہمیں جتنی بھی رپورٹیں ملی تھیں، وہ اس کے خلاف جاتی تھیں۔ وہ ہمارے سامنے جھوٹ بھی بول چکی تھی۔ اب ہم نے اسے تفتیش کی چکی میں پیسنا تھا لیکن سندھو نے کہا کہ ابھی اسے رہنے دیں، رات کو اسے بلائیں گے۔ چنانچہ اسے ہم نے وہیں پابند رکھا۔ اس کی نگرانی پر جسے مقرر کیا گیا تھا، اس نے بتایا کہ وہ بیٹھی رو رہی ہے اور بہت ہی بے چین ہے۔ میں اور سندھو دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ بھی رابطہ رکھا ہوا تھا۔ ہم تو دعا کرتے تھے کہ انٹیلی جنس والے ہی قاتل کو پکڑ لیں لیکن ادھر فون کیا تو پتہ چلا کہ ابھی تک انہیں سراغ نہیں ملا۔

میں اور سندھو رات گیارہ بجے کے لگ بھگ اپنے ہیڈ کوارٹر میں گئے۔ بشریٰ کو جس ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر رکھا تھا، اسے کہا کہ وہ بشریٰ کو ہمارے کمرے میں بٹھا دے۔ ہم دونوں باہر کھڑے تھے۔ سندھو نے مجھے کہا کہ تم اکیلے اندر جاؤ اور اس عورت پر اپنی مسلمانی

کا جال پھینکو اور اس کے ہمدرد بن جاؤ۔ مجھے گالیاں دینا اور کہنا کہ یہ سکھ کافر ہے، تمہیں نہیں چھوڑے گا...... سندھو نے اپنے آپ کو تین بڑی ننگی اور دلچسپ گالیاں دیں اور کہا کہ یہ گالیاں دینا۔ ننگی گالیاں تو سکھوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے۔ گالیوں کے بغیر وہ اپنی ہر بات کو ادھوار سمجھتے ہیں۔

میں اکیلا کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ بشریٰ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھی اور جھپٹ کر میرے گلے لگ گئی۔ میں دراز قد آدمی ہوں۔ اس کا قد اتنا نہیں تھا۔ اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے چہرے کے بالکل قریب کر لیا۔ اس نے بے حجابی کی ایک دو حرکتیں کیں تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس کے کندھے پکڑ کر ذرا پیچھے کیا۔ وہ مجھے اپنا آپ پیش کر رہی تھی...... مرد کے لئے یہ بڑا ہی صبر آزما امتحان ہوتا ہے۔ میں نے دھیان کسی اور طرف کر لیا۔ میں شاید اچھی طرح بیان نہیں کر سکا کہ وہ کتنی زیادہ کشش والی عورت تھی۔ اس کے ساتھ وہ مرد پر حاوی ہونا بھی جانتی تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور انسپکٹر ہوتا تو وہ اتنی خوبصورت پیشکش کو کبھی نہ ٹھکراتا۔ میں اپنے دماغ میں یہ خیال لے آیا کہ یہ عورت اپنے آپ کو پیش کر کے ثابت کر رہی ہے کہ وہ بے گناہ نہیں اور اس واردات میں اس کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

''میرے پاس بہت زیور ہے'' ــــ اس نے کہا ــــ ''آپ یہ زیور بھی لے لینا۔ آج ہی نہیں، جب بھی آپ مجھے بلایا کریں گے میں پہنچ جایا کروں گی''۔

''ذرا بیٹھو بشریٰ'' ــــ میں نے کہا ــــ ''میں تمہیں ایک مسلمان عورت سمجھ کر بچانا چاہتا ہوں۔ یہ سکھ تو تمہیں چھوڑے گا ہی نہیں۔ صحیح بات بتا دو، اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تمہیں کس طرح بچا سکتا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ جب تک سچ نہیں بولو گی یہاں سے جا نہیں سکو گی''۔

''میں ہر طرح آپ کی خدمت کروں گی'' ــــ اس نے کہا ــــ ''خدمت کا مطلب آپ سمجھ گئے ہیں۔ میں نے اپنا زیور بھی پیش کیا ہے''۔

کوئی گھریلو عورت کسی تھانیدار کے ساتھ ایسی بے حجابی اور بے غیرتی کے ساتھ یہ بات نہیں کرے گی خاص قسم کی بے شرمی اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بظاہر بشریٰ بھی گھریلو عورت تھی لیکن اس نے جمالی سے یہ ہاتھ سیکھ لئے تھے۔ جمالی پولیس کے ساتھ تعلق رکھنے والا آدمی تھا اور وہ بشریٰ کے ساتھ پولیس اور جرائم کی زبان میں ہی باتیں کرتا ہو

گا۔ بشریٰ کی اس پیشکش سے اس کے کردار کا اندازہ ہوتا تھا۔ بہرحال میں نے اسے اپنے جال میں لے لیا اور سب انسپکٹر سندھو نے جو طریقہ بتایا تھا، میں نے وہ بھی استعمال کیا۔ حقیقت دراصل یہ تھی کہ بشریٰ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ اس نے اپنے پہلے خاوند جہانگیر کو ہمارے پاس آتے اور بہت سی دیر بعد واپس جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے بھی اسے اچھی خاصی بے چینی اور پریشانی ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ جہانگیر کیا باتیں کر گیا ہے اور اس نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔

''سب کچھ بتا دوں گا بشریٰ!''—— میں نے کہا—— ''وہ بہت کچھ بتا گیا ہے۔ اس نے کوئی پردہ رہنے نہیں دیا''—— میں نے جھوٹ بولا—— ''ہم دونوں جہانگیر کی دوسری بیوی سے بھی مل چکے ہیں۔ ہم اس کے گھر گئے تھے۔ تم کہتی ہو کہ اس لڑکی کے ساتھ تمہاری کوئی ملاقات نہیں ہوئی لیکن لڑکی نے کوئی اور ہی قصہ سنا دیا ہے''۔

میں نے دیکھا کہ بشریٰ کے چہرے کا رنگ بالکل ہی بدل گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں سفیدی سی آ گئی تھی۔ یہ گھبراہٹ کی انتہا کی علامت ہوتی ہے جو غشی تک بھی پہنچ جایا کرتی ہے۔ میں جان گیا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ٹھکانے پر جا لگا ہے۔

''مجھ پر آپ کو کیا شک ہے؟''—— بشریٰ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے شک نہیں یقین ہے''—— میں نے کہا—— ''تم نے خود قتل نہیں کیا، کسی سے کروایا ہے، اگر یہ بات بھی غلط ہے تو تم اتنا ضرور جانتی ہو کہ جمالی کو کس نے قتل کیا ہے''۔

میں نے سوچا وہ میرے الزام سے انکار کرے گی اور اگر اس نے سچ بولا بھی تو یہ کہے گی کہ فلاں شخص کے ساتھ جمالی کی دشمنی تھی اور دشمنی کی وجہ کیا تھی لیکن اس نے مجھ پر تو جیسے ایک بم پھینک دیا ہو۔ پہلے وہ گھبرائی ہوئی تھی، اب میں چکرا گیا۔

''جمالی کو میں نے نہیں جہانگیر نے قتل کیا ہے''—— اس نے کہا۔

''وہ کیسے؟''—— میں نے پوچھا اور باہر جا کر سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو کو اندر بلا لیا۔

میں نے سندھو کو بتایا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ ہم اسے جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس سے پھر پوچھا کہ جہانگیر نے جمالی کو کہاں اور کس طرح قتل کیا ہے۔

اس نے قتل کی وجہ یہ بتائی کہ جہانگیر کی دوسری بیوی اس کے پاس آتی رہتی تھی۔ اس کی نوجوان بیوی کا نام مریم تھا۔ مریم شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا جب اس کی پہلی

ملاقات بشریٰ کے ساتھ کسی گھر میں شادی کے موقع پر ہوئی۔ بشریٰ نے مریم کو بتایا کہ وہ جہانگیر کی پہلی بیوی ہے۔ پتہ چلا کہ مریم اس سے واقف ہے۔ بشریٰ نے اس کے ساتھ کچھ ایسا اچھا سلوک کیا کہ مریم اس سے متاثر ہو گئی۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ان کی بے تکلفی اتنی بڑھی کہ راز کی باتیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ کرنے لگیں۔ مریم نے بشریٰ کو بتایا کہ وہ جہانگیر سے تنگ آ چکی ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ جہانگیر وہمی آدمی ہے اور اس کے چال چلن پر شبہ کرتا رہتا ہے۔ شبہ بھی ایسا کہ مریم کبھی چھت پر چلی جاتی تو جہانگیر اس سے پوچھتا کہ کیا دیکھنے کے لئے چھت پر گئی تھی۔ دفتر سے جہانگیر واپس آتا تو پوچھتا آج تمہیں ملنے کون آیا تھا۔

بشریٰ نے بتایا کہ مریم نے اپنی مرضی سے جہانگیر کے ساتھ شادی کی تھی اور اسے وہ اپنی محبت کی شادی کہتی تھی لیکن جہانگیر نے اسے نہ صرف مایوس کیا بلکہ اس کی زندگی جہنم بنا ڈالی۔ بشریٰ نے اسے کہا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکی ہے اور اب بھی وقت ہے کہ وہ اس بوڑھے آدمی سے جان چھڑا لے اور کسی جوان آدمی کے ساتھ شادی کر لے۔

ایک روز مریم بشریٰ کے گھر گئی اور بہت روئی۔ اس نے بشریٰ کو بتایا کہ کل شام جہانگیر نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے اور بات کچھ بھی نہیں تھی۔ وہی وہم والا معاملہ تھا۔ جہانگیر اسے کہتا تھا کہ میری غیر حاضری میں تم اپنے کسی یار کو گھر میں بلا لیتی ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مریم نے جہانگیر پر غصہ جھاڑا جس کے جواب میں جہانگیر نے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ باتوں باتوں میں مریم نے کہا کہ میرا بس چلے تو میں اس شخص کو زہر پلا دوں۔

بشریٰ نے اسے کہا زہر پلاؤ گی تو ہی اس سے نجات حاصل کر سکو گی ورنہ یہ آدمی مرتے دم تک تمہیں آزاد نہیں کرے گا۔ بشریٰ نے اسے بھڑکانا شروع کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس کی نظر میں ایک جوان آدمی ہے جو بہت ہی اچھا ہے اور وہ مریم کو چاہتا بھی ہے۔ بشریٰ نے اس آدمی کی بہت تعریفیں کیں اور کہا کہ وہ جس طرح خوبرو ہے اسی طرح اس کی فطرت اور سیرت بھی پرکشش ہے۔ مریم بشریٰ سے متاثر تھی یا یوں کہیں کہ جہانگیر سے تنگ آ چکی تھی، اس نے بشریٰ سے کہا کہ اس آدمی کو ملوا دے یا کم از کم دکھا ہی دے۔

بشریٰ نے مریم سے کہا کہ اس نے جوانی میں بڑی مشکل سے جہانگیر سے طلاق لی تھی۔ مختصر یہ کہ بشریٰ نے جہانگیر کے وہ نقائص اور وہ برائیاں بیان کرنی شروع کر دیں جو جہانگیر میں نہیں تھیں۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی اور اپنی شیطانی فطرت کے مطابق مریم کے

دل میں اس کے خاوند کے خلاف زہر بھر رہی تھی۔ بشریٰ کے بیان سے یہ بات سامنے آئی کہ بشریٰ مریم کے دماغ میں یہی ایک بات ڈال رہی تھی کہ جہانگیر کو ختم کئے بغیر مریم کو آزادی نہیں مل سکتی۔

میں بشریٰ کا یہ بیان بہت ہی مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔ اس نے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سنائی تھیں۔ وہ بے شک چالاک اور عیار عورت تھی لیکن وہ جرائم پیشہ تو نہیں تھی اور زندگی میں پہلی بار اس کا پالا پولیس سے پڑا تھا۔ اس نے کچھ اور قسم کے گناہ کئے تھے، وہ گناہ نہیں کئے تھے جنہیں دنیا کا قانون پکڑ لیا کرتا ہے۔ اس ناتجربہ کاری میں وہ بولتی چلی گئی اور اس کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکل گئیں جو اس کی اپنی نیت کا اظہار کرتی تھیں۔

''اوئے بشریٰ!'' — سب انسپکٹر سندھو نے کہا — ''سیدھی بات کرو۔ تم جہانگیر کو قتل کروانا چاہتی تھیں۔ یہ تمہاری انتقامی کارروائی تھی۔ تم نے انتقام لینے کے لئے مریم کو بھڑکایا اور اسے استعمال کیا...... تم اگر دل کی ہر بات کہہ ہی رہی ہو تو یہ بھی کہہ دو کہ تم جہانگیر سے انتقام لینے کے لئے اسے قتل کروانا چاہتی تھیں''۔

''ہاں بشریٰ!'' — میں نے کہا — ''میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بچالوں گا بشرطیکہ تم ہر بات بتا دو پھر تمہیں بچانے کا ذریعہ نکل آئے گا''۔

اس نے سر جھکا لیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اسے جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل سچ ہے یعنی یہ عورت جہانگیر کو مروانا چاہتی تھی...... اس نے سر اٹھایا اور ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھ کر ذرا دبی سی زبان میں کہا کہ وہ جہانگیر کو مروانا چاہتی تھی اور مریم کے ساتھ اس کی کوئی جذباتی دلچسپی نہیں تھی۔

اس نے جب یہ بات کی تو میں نے اور سندھو نے بھی اسے بہت شاباش دی جیسے اس نے کوئی پائے کی غزل سنا دی ہو۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور یہ بھی کہا کہ اسے ہم گرفتار نہیں کریں گے، وہ اپنا بیان اور زیادہ واضح کر کے دے۔

ڈرامہ جو بشریٰ نے کھیلا

اس کی زبان رواں ہو چکی تھی بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ اس کی زبان بے لگام ہو گئی تھی اور یہ ہم دو تھانیداروں کا کمال تھا۔ وہ ہم کو کوئی بات کہتی تھی تو ہم دونوں اس طرح اسے داد دیتے تھے جس طرح آپ نے مشاعروں میں لوگوں کو داد دیتے دیکھا ہو گا۔ اس کی عیاریاں

اور چالاکیاں ختم ہو چکی تھیں۔ یہ تو اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ جہانگیر کو مروانا چاہتی تھی۔ جہانگیر نے ہمیں پہلے بتا دیا تھا کہ یہ عورت کینہ پرور ہے اور انتقام لے کر ہی رہتی ہے۔ مریم تو اسے ایک بہانہ یا ذریعہ مل گیا تھا۔ اس نے کہا کہ مریم کو اس نے جہانگیر کے خلاف اتنا بھڑکایا اور ایسے ایسے جھوٹ بولے کہ مریم تیار ہو گئی جیسے اس رات وہ جہانگیر کو قتل کر دے گی۔

مریم بار بار ایک ہی بات کہتی تھی کہ وہ جہانگیر کو زہر پلا کر ہی مار سکتی ہے۔ بشریٰ نے اسے کہا کہ اس طرح وہ پکڑی جائے گی اور اس کی باقی عمر جیل میں گزرے گی۔ آخر بشریٰ نے کہا کہ وہ جمالی کے ساتھ بات کرے گی اور کوئی ایسا طریقہ سامنے آجائے گا کہ جہانگیر قتل بھی ہو جائے گا اور قتل کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔

اس روز بشریٰ نے مریم کو تسلی دلاسہ دے کر اور پیار و محبت کر کے گھر بھیج دیا اور اسے یہ یقین بھی دلایا کہ اس کا کام ہو جائے گا اور اس کے بعد بشریٰ اس کی شادی خود کروائے گی ...... مریم چلی گئی۔ شام کو جمالی گھر آیا تو بشریٰ نے اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ بشریٰ نے ہمیں سنایا تھا کہ جمالی کو جہانگیر کے قتل کے لئے کس طرح تیار کیا تھا۔ جمالی کے دل میں بشریٰ کی محبت تھی جس کی خاطر وہ بشریٰ کی بات مان گیا۔ اس نے بشریٰ سے کہا کہ کسی طرح مریم کو اس سے ملوا دے اور ملنے کی جگہ گھر ہی بہتر ہے۔

بشریٰ نے ایک عورت کی معرفت مریم کو پیغام بھجوا دیا۔ یہ عورت بشریٰ کے اعتماد کی عورت تھی۔ اس عورت نے مریم کو پیغام پہنچا دیا اور دوسرے دن جب جہانگیر اپنے دفتر چلا گیا تو مریم بشریٰ کے گھر پہنچ گئی۔ جمالی گھر میں ہی تھا۔

جمالی نے جب مریم کو دیکھا تو وہ فوراً جہانگیر کے قتل کے لئے تیار ہو گیا۔ بشریٰ نے کوئی ایسی بات تو ہمیں نہ سنائی لیکن ہم دونوں تھانیدار سمجھ گئے کہ جمالی نے مریم کو نظر میں رکھ لیا تھا اور اس کی نظر بڑی ہی میلی تھی۔ جمالی ایسے کام اچھے خاصے پیسے لے کر اپنے گروہ کے کسی آدمی سے کروا دیا کرتا تھا لیکن یہ کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے مریم سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا تھا لیکن اس نے یہ کام بلا اجرت نہیں کرنا تھا۔ مریم مجسم اجرت تھی اور بڑی ہی دلکش اجرت تھی۔

اس نے مریم اور بشریٰ کو قتل کا ایک محفوظ طریقہ بتایا جو یہ تھا کہ ایک رات مقرر کر لی جائے گی اور اس رات مریم باہر کے دروازے کی زنجیر یا چٹخنی نہیں چڑھائے گی۔ آدھی رات کے وقت جمالی آئے گا اور مریم اس کا استقبال دروازے میں کرے گی اور پھر جمالی

اندر جا کر سوئے ہوئے جہانگیر کا گلا ہاتھوں سے دبا دے گا۔

وہ جب مر جائے گا تو ایک رسی ساتھ والے کمرے کے چھت والے پنکھے کے ساتھ باندھ کر اس کا پھندہ جہانگیر کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ نیچے ایک کرسی فرش پر گرا دی جائے گی۔ مریم رات کو شور شرابہ کرے گی۔ جمالی جا چکا ہوگا۔

مریم کے شور پر پڑوسی آ جائیں گے تو مریم انہیں اندر لے جا کر دکھائے گی کہ اس کے خاوند نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ یہ بھی بتائے گی کہ وہ بیت الخلاء میں چلی گئی تھی۔ وہاں سے آئی تو خاوند بستر پر نہیں تھا۔ ساتھ والے کمرے میں گئی تو اسے پنکھے کے ساتھ لٹکتا دیکھا۔

لوگ پولیس کو رپورٹ کریں گے تو جب تھانیدار آئے گا تو مریم یہ بیان دے گی کہ تھوڑے ہی دنوں سے جہانگیر نے مریم سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور تمہارے قابل نہیں رہا۔ مریم اسے بہلاتی تھی لیکن وہ روز بروز مغموم اور اداس ہوتا جا رہا تھا۔ اس شام کو بھی جہانگیر نے مریم سے کہا تھا کہ میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ اس طرح پولیس یہ لکھ لے گی کہ جہانگیر نے خودکشی کی ہے اور کام بن جائے گا۔

قتل کے لئے رات مقرر کر لی گئی۔ بشریٰ نے اپنے بیان میں کہا کہ آدھی رات کے وقت جمالی جہانگیر کو قتل کرنے کے لئے گھر سے چل پڑا۔ بشریٰ خوش بھی تھی کہ اس کا انتقام پورا ہو جائے گا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھبرا بھی جاتی تھی کہ جمالی پکڑا ہی نہ جائے یا کوئی ایسی وجہ نہ ہو جائے کہ کام بن ہی نہ سکے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے پر جاتی اور باہر دیکھتی تھی۔

ایک بار پھر وہ باہر آئی مین ڈیوڑھی میں پہنچی تو دیکھا کہ ایک کواڑ کھلا ہوا ہے اور ڈیوڑھی کے فرش پر کوئی آدمی پڑا ہے۔ اس کا تو خون ہی خشک ہو گیا۔ ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ اس کا خاوند جمالی ہے اور یہ زندہ نہیں۔ اس نے ڈیوڑھی کی بتی جلائی تو اس نے دیکھا کہ یہ تو جمالی ہے۔ جمالی کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ بشریٰ نے لاش پیٹھ کے بل کی اور اس کی نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا تو اسے پتہ چلا کہ یہ تو مرا ہوا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بھی خون تھا اور ناک سے بھی خون نکل رہا تھا لیکن وہیں جم گیا تھا۔ تب اس نے بڑی زور زور سے چیخیں ماریں اور گلی میں نکل کر پڑوسیوں کو آوازیں دیں تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔

اس کے بعد جو ہوا وہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔

''اب یہ بتاؤ بشریٰ!'' ۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ ''تم نے یہ کیسے کہہ دیا ہے کہ جمالی کو

جہانگیر نے قتل کیا ہے؟ کیا تمہیں اس کا کوئی ثبوت ملا تھا؟''

''میں نے صرف شک ظاہر کیا ہے'' ۔۔۔ بشریٰ نے جواب دیا ۔۔۔ ''وہ جہانگیر کو قتل کرنے گیا تھا اس لئے مجھے یہ خیال آتا ہے کہ جہانگیر بیدار ہو گیا ہوگا اور اس نے جمالی کو قتل کر دیا ہوگا اور اس کی لاش گھر میں پھینک گیا ہوگا''۔

میں اور سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو بیک وقت ہنس پڑے۔ بے بنیاد بات تھی کہ ایک معزز آدمی کسی کو قتل کر دے اور اس کی لاش اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔ ایسی حرکت کوئی غنڈہ اور بدمعاش یا کوئی استاد جرائم پیشہ کر سکتا ہے اور یہ ایک طنز ہوتی ہے کہ لو اپنے آدمی کی لاش وصول کر لو، میں نے انتقام لے لیا ہے۔

''مریم جمالی کے قتل کے بعد تمہارے پاس ضرور آئی ہوگی'' ۔۔۔ سندھو نے کہا۔

''نہیں!'' ۔۔۔ بشریٰ نے جواب دیا ۔۔۔ ''وہ بالکل ہی نہیں آئی۔ اسے اظہار افسوس کے لئے تو آنا چاہئے تھا لیکن نہیں آئی۔ جمالی کے قتل کے بعد اب تک میں نے اس کی شکل ہی نہیں دیکھی''۔

''کیا تمہیں اگلے روز پتہ چل گیا تھا کہ جہانگیر زندہ ہے اور وہ قتل نہیں ہوا؟'' ۔۔۔ سندھو نے پوچھا۔

''میں نے اپنے ایک ذریعے سے معلوم کر لیا تھا'' ۔۔۔ بشریٰ نے کہا ۔۔۔ ''مجھے اگلے روز ہی پتہ چل گیا تھا کہ جہانگیر زندہ ہے''۔

''کم عقل عورت!'' ۔۔۔ سندھو نے کہا ۔۔۔ ''تمہارا خاوند قتل ہو گیا اور ہم قاتل کا سراغ لگا رہے ہیں۔ تم نے ٹھیک سوچا ہے کہ اسی بہانے جہانگیر کو گرفتار کرا کے ثابت کر دیا جائے کہ جمالی کو جہانگیر نے قتل کیا ہے اور جہانگیر کو پھانسی کی سزا مل جائے''۔

بشریٰ کے آنسو بہنے لگے اور پھر اس نے ایک ہی سانس میں کئی قسمیں کھائیں اور کہا کہ جہانگیر اور مریم کو بلا کر پوچھا جائے۔ شاید جس طرح میں نے صحیح بات بتا دی ہے، وہ بھی بتا دیں۔ اس مسئلے پر ہماری بشریٰ کے ساتھ بحث ہوئی۔ ہم یہ ماننا نہیں چاہتے تھے کہ بشریٰ نے جو بیان دیا ہے یہ صحیح ہے لیکن جس طرح بشریٰ بات کر رہی تھی اس سے مجھے شک ہوا کہ بشریٰ غلط نہیں کہہ رہی اور ہمیں جہانگیر اور اس کی بیوی کے ساتھ بات کرنی چاہئے۔ یوں سمجھ لیں کہ بشریٰ نے ہمیں منوا لیا کہ وہ جو کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔ میں یہ ساری بحث لکھ تو نہیں سکتا یہ کتاب میں ہی آ سکتی ہے۔ جہانگیر اور اس کی بیوی کو شامل تفتیش کرنا اس

سیال سے بھی ضروری سمجھا کہ یہ تصدیق یا تردید ہو جائے گی کہ بشریٰ کا بیان صحیح ہے یا غلط۔ اگر اس کا بیان غلط ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے خاوند جمالی کے قتل میں وہ برابر کی شریک ہے۔ اگلے روز ہم نے جہانگیر کو اطلاع بھجوادی اور کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر کرائمز برانچ کے ہیڈ کوارٹر میں ہمارے پاس پہنچ جائے۔

بشریٰ گھر جانے کو بے تاب تھی اور وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ اسے جانے دیا جائے لیکن ہم اسے ابھی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ تفتیش کو ایسے چوراہے پر لے آئی تھی جہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ ہمارا راستہ کون سا ہے۔ بشریٰ کو ہم نے وہیں پابند رکھا۔ اس کے سونے کے لئے الگ کمرہ تھا اور کھانے پینے کا اچھا خاصا انتظام تھا۔

اگلے روز بارہ ساڑھے بارہ بجے جہانگیر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ بائیس تئیس سال کی اچھی خوبصورت اور سمارٹ لڑکی تھی۔ اس کے مقابلے میں جہانگیر کے چہرے پر بڑھاپے کے آغاز کے آثار صاف نظر آ رہے تھے لیکن وہ بوڑھا لگتا نہیں تھا۔ مریم کم عمری کے باوجود اس کے ساتھ اچھی لگ رہی تھی۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت لڑکیوں کے قد آج کل کی طرح ڈیڑھ بالشت نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ لڑکیوں کے قد آج کل کے لڑکوں سے اونچے اور پرکشش ہوتے تھے۔

میں نے اور سندھو نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس لڑکی سے بیان لیا جائے۔ ہم نے اس کی کمزور اور دکھتی رگ کو پکڑنا تھا۔ یہ لڑکی مریم گھریلو ٹائپ کی لگتی تھی اور ویسے بھی نوعمر تھی۔ اسے ہم جلدی توڑ سکتے تھے۔ پولیس کا طریقہ تفتیش بھی یہی ہوتا ہے۔ میں نے جہانگیر سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں بیٹھ جائے اور اپنی بیوی کو ہمارے پاس رہنے دے اور بالکل بے فکر ہو جائے، اس سے دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔

جہانگیر جب دوسرے کمرے کی طرف چلا تو مریم کے چہرے پر صاف گھبراہٹ آ گئی اور وہ اٹھ کر جہانگیر کے پیچھے چل پڑی۔ سندھو چپ رہا۔ میں نے مریم سے کہا کہ وہ ہمارے پاس بیٹھے۔ جہانگیر نے بھی رک کر اسے تسلی دلاسہ دیا اور ہمارے پاس بٹھا دیا۔ جہانگیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کرائمز برانچ کے پولیس آفیسر اور دوسرے لوگ وردی نہیں پہنا کرتے تھے، پرائیویٹ کپڑوں میں رہتے تھے۔ اگر ہم وردی میں ہوتے تو اس نوعمر لڑکی کا اور زیادہ برا حال ہو جاتا۔ پولیس کا ڈر کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

''مریم!''۔۔۔ میں نے بڑے پیار سے کہا۔۔۔ ''ہم سے کیوں ڈرتی ہو؟......

تمہاری طرح انسان ہیں ہم، تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے نہ یہاں کوئی تمہارے جسم کو ہاتھ لگائے گا۔ ہم پولیس کے آدمی ہیں اور پولیس کا فرض ہے کہ شہریوں کی عزت کی حفاظت کرے۔ تم سے ایک دو باتیں پوچھنی ہیں''۔

''مجھ سے آپ نے کیا پوچھنا ہے؟''۔۔۔ اس نے گھبراہٹ سے ہکلاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

''بشریٰ کو تم جانتی ہو''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''وہ بھی یہیں ہے۔ اس کے ساتھ تمہاری دوستی ہے......''

''نہیں، نہیں!''۔۔۔ مریم فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور روتے ہوئے سے لہجے میں کہنے لگی۔۔۔ ''آپ جہانگیر صاحب سے بات کریں۔ میں کچھ نہیں جانتی...... جہانگیر صاحب کو بلائیں...... میں بشریٰ کو نہیں جانتی......''

وہ ضدی بچے کی طرح رونے بھی لگی اور ہمارے لئے اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی زور سے اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی جس کمرے میں جہانگیر کو ہم نے بھیجا تھا۔ اگر سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو اکیلا ہوتا تو وہ اس لڑکی کو اٹھا کر کرسی پر پھینک دیتا اور ایسا للکارا مارتا کہ لڑکی کا دم خشک ہو جاتا لیکن سندھو میرے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور چپ بیٹھا تھا۔ میں لڑکی پر کسی قسم کی زیادتی یا تشدد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے پیار سے روکا اور کہا کہ وہ ہماری بات تو سن لے لیکن وہ تو ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ یہ آوازیں سن کر جہانگیر اس کمرے میں آ گیا۔ شاید اس نے یہ وہم کیا ہوگا کہ ہم اس کی بیوی پر دست درازی کر رہے ہیں لیکن اس نے بڑی شرافت سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مریم نے جہانگیر کو دیکھا تو وہ سکون میں آ گئی۔

''کیا بات ہے مریم؟''۔۔۔ جہانگیر نے اس سے پوچھا۔۔۔ ''یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے؟''

''یہ مجھ سے کچھ پوچھتے ہیں''۔۔۔ مریم نے جواب دیا۔۔۔ ''انہیں آپ بتائیں، میں نہیں بتا سکتی''۔

میں نے جہانگیر کو اپنے کمرے میں بٹھا لیا اور اسے کہا کہ ہم نے تفتیش کرنی ہے اور وہ اپنی بیوی سے کہے کہ یہ ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ اس موقع پر سندھو بول پڑا۔ اس نے

جہانگیر سے کہا کہ آپ پولیس والوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہاں پتھر دل ڈکیت بھی آ کر موم ہو جاتے ہیں، یہ تو کچی عمر کی لڑکی ہے، اسے کہیں کہ ہمیں پریشان نہ کرے تا کہ ہم اسے پریشان نہ کریں۔

''آپ مجھے بتائیں کیا پوچھنا ہے!''___ جہانگیر نے پُروقار لہجے میں کہا___ ''میں گزٹیڈ آفیسر ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کو اور آپ کی ذمہ داریوں کو بھی بخوبی سمجھتا ہوں۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں اور اس لڑکی کی موجودگی میں پوچھیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ یہ جھوٹ بولے گی نہ میں جھوٹ بولوں گا''۔

ہم اس کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہمیں ہمارے طریقہ تفتیش سے ہٹا رہا تھا۔ ہم نے دونوں کے بیان الگ الگ لینے تھے۔ میں نے اور سندھو نے اسے بتایا کہ اس طرح ہم اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتے۔ جہانگیر نے بڑے ہی اچھے طریقے سے اچھے الفاظ میں کہا کہ ہم میاں بیوی کو اکٹھے بٹھا کر پوچھیں اور بیان لیں اور اگر اس کے بعد ان کے بیان یا ذرا سی کوئی بات جھوٹی ثابت ہو تو دونوں کو گرفتار کر لیں...... یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ مریم کے منہ سے بات نکلوانا بڑا مشکل تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ اس سے زبردستی بات کہلوائی گئی تو یہ اُوٹ پٹانگ اور بے بنیاد باتیں شروع کر دے گی۔

کچھ دیر ہماری بحث چلی۔ سندھو مجھ سے پہلے بولا اور کہنے لگا کہ چلو ان دونوں کو اکٹھے ہی بٹھا لیتے ہیں۔ میں نے بادل نخواستہ سندھو کی تائید کر دی۔

پیار کی پیاسی

''جہانگیر صاحب!''___ میں نے کہا___ ''آپ کی پہلی بیگم نے آپ پر الزام عائد کیا ہے کہ آپ نے اس کے خاوند جمالی کو کہیں قتل کیا ہے اور اس کی لاش اس کے دروازے میں پھینک گئے ہیں''۔

''محترم انسپکٹر صاحب!''___ جہانگیر نے کسی ردعمل کے اظہار کے بغیر پُرسکون لہجے میں کہا___ ''کیا آپ میری شرافت کی تعریف نہیں کریں گے؟ میں نے ایک آدمی کو اس کے گھر سے کہیں دور قتل کیا اور اس کی لاش اس کے گھر پہنچا دی۔ البتہ یہ میری بداخلاقی ہے کہ میں اپنے مقتول کے کفن دفن کے انتظامات کے لئے اس کے گھر رکا نہیں''۔

''یہ بات تو ہم بھی تسلیم نہیں کرتے''___ میں نے کہا___ ''لیکن آپ کی سابقہ بیگم

نے ایک اور بات سنائی ہے۔ یہ آپ کے کردار پر منحصر ہے کہ اس کی تصدیق کریں یا تردید کر دیں''۔

اس نے کہا کہ اسے یہ بات سنائی جائے۔ میں نے اسے وہ سارا بیان سنا دیا جو بشریٰ نے دیا تھا اور جہانگیر اور اس کی بیوی مریم کو اس میں ملوث کیا تھا۔ میں نے اس وقت مریم کا چہرہ دیکھا، بالکل پیلا پڑ گیا تھا اور شاید اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''محترم!''___ جہانگیر نے کہا___ ''اس عورت نے میرے خلاف یا میری اس بیوی کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، کوئی شہادت پیش نہیں کی نہ ہی اس نے یہ بتایا ہے کہ اس واقعہ کا کوئی عینی شاہد ہے۔ آپ خود حیران ہوتے ہوں گے کہ ایک قاتل اپنے مقتول کی لاش اٹھا کر اس کے گھر رکھ آیا یا پھینک آیا۔ آپ مجھے اور میری بیوی کو گرفتار کر لیں اور کورٹ میں یہ کیس ثابت کر کے دکھا دیں لیکن جناب! میں ایک ذمہ دار آفیسر ہوں۔ آپ کی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا ہوں۔ میں آپ سے بڑے اچھے کردار کی توقع رکھوں گا۔ آپ مسلمان ہیں اور یہ انسپکٹر سکھ ہیں۔ یہ دونوں قومیں ہندوستان کی بہادر اور دلیر قومیں سمجھی جاتی ہیں۔ دلیر قوموں کا اخلاق اور کردار دین اور دھرم بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ میں آپ دونوں سے یہی توقع رکھوں گا اور سچ بولوں گا۔ آگے دیکھتا ہوں آپ میرے اس اچھے اخلاق کی قدر کرتے ہیں یا مجھے ذلت میں پھینکتے ہیں''۔

میں اس شخص کو آج تک نہیں بھولا۔ اس کے چہرے پر ایک نور سا تھا بلکہ میں اسے جلال کہوں گا۔ وہ ایسے پُروقار طریقے سے بولا کہ میں اور سندھو اس کے منہ کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے ایسے ہی لوگ اچھے لگا کرتے تھے اور اب بھی میں ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔

میں یہ کہانی پڑھنے والوں کی خدمت میں یہ گذارش کروں گا کہ میں نے اگر یہاں سے آگے کہانی اس طرح سنائی کہ جہانگیر نے کیا بیان دیا اور اس کے بعد مریم نے اس سے الگ ہمیں کیا بیان دیا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور بے مزہ بھی ہو جائے گی۔ ایک ایک بات دو دو تین تین بار دوہرائی جائے گی۔ میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اصل کہانی جو میں نے سنائی ہے، یہ میں سیدھے طریقے سے سنا دوں۔ جہانگیر نے بڑا ٹھیک ٹھاک بیان دیا اور اس کے بعد اس کی بیوی مریم بھی الگ بیٹھ کر بیان دینے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گزری ہوئی زندگی کی ہر ایک بات سنائی تھی۔ یہ ہے وہ کہانی جس کا پس منظر نفسیاتی تھا۔ اب آپ مجھ

سے سیدھے طریقے سے باقی کہانی سنیں۔ یہ جہانگیر اور مریم کے بیانات سے اخذ ہوئی ہے۔

جہانگیر کی پہلی شادی کا قصہ تو میں سنا چکا ہوں۔ اس نے بشریٰ سے محبت کی تھی، لیکن بشریٰ نے اس کی محبت کی توہین کی۔ جہانگیر کو ایسا صدمہ ہوا کہ اس نے عہد کر لیا کہ باقی عمر شادی نہیں کرے گا۔ ایک تو بشریٰ نے اسے صدمہ دیا اور اس سے بڑا صدمہ یہ کہ اس کا باپ بھی مر گیا اور ماں کو بھی ایسا روگ لگا کہ وہ بھی زندہ نہ رہی اور بڑا بھائی اس سے الگ ہو گیا۔

جہانگیر تنہا زندگی گذارنے لگا۔ اس نے ایک خانساماں رکھ لیا تھا اور اسی کو اس نے زندگی بنا لیا۔ وہ اللہ کو اپنا ساتھی اور اللہ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ عموماً ایسے لوگ شراب پینے لگتے ہیں یا کوئی اور بدکاری شروع کر دیتے ہیں لیکن جہانگیر کا انداز کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے آپ میں بنی نوع انسان کی محبت پیدا کر لی۔

اب آیئے مریم کے گھر کی طرف۔ مریم کی ایک بہن تھی اور دو بھائی تھے۔ مریم سب سے چھوٹی تھی۔ قدرتی بات یہ ہے کہ لڑکیوں کو باپ کے ساتھ محبت ہوتی ہے لیکن مریم کا باپ کچھ عجیب سڑیل مزاج سا آدمی تھا۔ پیار کا جواب بھی غصے سے دیتا تھا۔ مریم باپ سے پیار چاہتی تھی اور جب وہ چھوٹی سی تھی تو وہ باپ کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتی اور اس کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن باپ اسے پرے دھکیل اور دھتکار دیتا تھا۔

ہمارے گھرانوں میں یعنی چار دیواری کی دنیا میں لڑکیوں کو اسی طرح غیر اہم اور بن بلائی مہمان سمجھا جاتا ہے اور تمام تر پیار لڑکوں پر مرکوز کر دیا جاتا ہے۔ مریم کے ہاں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ گھر میں مٹھائی آتی یا کوئی ایسی چیز آتی جو بچوں کو بہت پسند ہوتی ہے تو وہ لڑکوں کو دے دی جاتی اور یہ دونوں لڑکیاں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ مریم ضد کرتی تو اسے بڑی نفرت اور حقارت سے وہ چیز ذرا سی دے دی جاتی یا اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا جاتا۔

عیدوں پر لڑکوں کے تو کپڑے بن جاتے لیکن لڑکیوں کے پرانے کپڑے دھلوا کر انہیں پہنا دیئے جاتے تھے۔

مریم بڑی ہوتی گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ آپس میں کھچے کھچے رہتے ہیں۔ کبھی تو وہ باقاعدہ لڑا بھی کرتے تھے اور پھر دونوں اپنا اپنا غصہ دونوں بچیوں پر اتارتے تھے۔ بھائی جب بڑے ہوئے تو انہوں نے لڑکیوں کو اپنی نوکرانیاں سمجھ لیا۔ ان سے اپنے جوتے پالش کرواتے اور اگر وہ نہ کرتیں تو ان کی پٹائی کر دیتے۔ مریم خود سر اور باغی ہو گئی۔

یہی وجہ تھی کہ بھائی اسے الگ پیٹتے اور ماں باپ الگ پٹائی کرتے تھے۔

مریم نے اپنے بیان میں تین چار واقعات سنائے کہ وہ کس طرح پیار کی پیاسی تھی اور یہ پیاس بجھانے کے لئے اس نے جو بھی کوشش کی وہ ناکام رہی۔ اس کا زیادہ وقت رونے میں یا اداس اور مایوس ہو کر کہیں بیٹھے رہنے میں گزرتا تھا۔

اسے سکول داخل کرا دیا گیا تھا اور اسی عمر میں اسے گھر کے کام کاج میں لگا دیا گیا۔

اس کی بڑی بہن، مریم کے الفاظ میں، خوش قسمت نکلی اسے ٹائی فائیڈ ہوا اور اسی سے وہ فوت ہو گئی۔ یہ ایک صدمہ تھا جو ابھی تک مریم کے دل پر طاری تھا۔ یہی ایک بہن اس کی ہمدرد تھی، وہ بھی نہ رہی۔ مریم کا روزمرہ کا معمول یہ تھا کہ سکول سے آتی تو ماں اسے برتن دھونے پر لگا دیتی۔ اگر وہ اتنا سا ہی کہہ دیتی کہ وہ برتن تھوڑی دیر بعد دھوئے گی تو ماں اسے گالی گلوچ کرتی اور اگر باپ سن لیتا تو وہ ایک آدھ گالی کے ساتھ ایک دو تھپڑ بھی عطا کر دیتا تھا۔

جہانگیر مریم کی ماں کی برادری کا آدمی تھا۔ شاید بہت دور کی کچھ رشتہ داری بھی بنتی تھی۔ وہ کبھی کبھی مریم کے گھر آیا کرتا تھا۔ مریم کا گھر ساتھ والے محلے میں تھا۔ کوئی دوری نہیں تھی۔ مریم کا باپ بھی جہانگیر کو اچھا سمجھتا تھا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ جہانگیر زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھا اور اس نے کبھی کوئی گھٹیا یا جلی کٹی بات نہیں کی تھی۔ ہر کسی کا دل رکھنا جانتا تھا۔

مریم کی بڑی بہن مر چکی تھی۔ جہانگیر مریم کے ساتھ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح بڑے چھوٹے بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ مریم نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ واحد شخص تھا جس سے اسے بچپن میں پیار ملا اور وہ اکثر جہانگیر کے انتظار میں رہتی تھی۔ مریم جب سکول جاتی تھی تو جہانگیر کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ مریم اس وقت پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھی جب جہانگیر نے بشریٰ کو طلاق دے دی تھی اور وہ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔

سکول آتے جاتے کبھی جہانگیر اسے نظر آ جاتا تو وہ رک جاتی۔ ایک بار وہ جہانگیر کے گھر کے اندر چلی گئی۔ وہ بچی ہی تھی۔ اتفاق سے جہانگیر گھر ہی تھا۔ جہانگیر نے اس کے ساتھ اسی طرح پیار کیا اور شفقت دی جس طرح بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہی ایک تشنگی تھی جو مریم کو بے حال کئے رکھتی تھی۔ جہانگیر نے اس کی یہ تشنگی ختم کر دی۔

مریم نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ اکثر اپنے آپ سے کہا کرتی تھی کہ خدا نے جہانگیر

کواس کا باپ کیوں نہیں بنا دیا۔ بچپن میں اس نے اپنے دل میں جہانگیر کو باپ کا درجہ دے دیا تھا۔ جہانگیر نے اس کے ساتھ پوری طرح شفقت جاری رکھی ...... میں زیادہ تفصیلات اور واقعات میں نہیں جانا چاہتا۔ میرا خیال ہے آپ بات سمجھ گئے ہیں کہ جو پیار مریم کو اپنے ماں باپ سے ملنا چاہئے تھا وہ جہانگیر سے ملا۔ مریم دراصل نفسیاتی مریضہ بن چکی تھی۔ جوں جوں جہانگیر اس کے دل میں اترتا گیا، اس کے دل سے ماں باپ کی محبت اور احترام نکلتا گیا۔ اس کے بھائی اب بھی یعنی لڑکپن میں بھی اسے مارتے پیٹتے اور اس سے اپنے کام کرواتے تھے۔ مریم کو اپنے ان سگے بھائیوں سے نفرت ہوگئی۔

اس زمانے میں مسلمان اپنی بیٹیوں کو زیادہ نہیں پڑھاتے تھے۔ دس جماعتوں کو بھی وہ بڑی تعلیم سمجھتے تھے۔ مریم نے میٹرک پاس کر لی تو اسے گھر روک لیا گیا۔ اب سارے گھر کے کام کاج اس کی ذمہ داری میں دے دیئے گئے اور اس کے ساتھ ماں باپ کی آپس کی لڑائیاں اور پھر ان کی ساری پھٹکار مریم کے حصے میں آگئی۔ ماں باپ نے دونوں بیٹوں کو شہزادہ بنا کر رکھا اور ان کی ناجائز ضرورتیں بھی پوری کرتے رہے۔ مریم کسی نہ کسی طرح وقت اور موقع ڈھونڈ کر جہانگیر کے گھر جا پہنچتی اور اس کا گھر سنوارنے لگتی تھی، مثلاً برتن اِدھر اُدھر پڑے ہوتے تو وہ اٹھا کر صحیح جگہوں پر رکھتی، جہانگیر کا بستر ٹھیک کرتی جو ہوتا ہی ٹھیک تھا لیکن مریم کو اس گھر کے ساتھ انس ہو گیا تھا کیونکہ اسے پیار اسی گھر سے ملتا تھا۔

ایک روز جہانگیر نے اسے کہا کہ وہ اب اس کے پاس نہ آیا کرے کیونکہ وہ جوان ہو گئی ہے اور وہ کتنا ہی نیک پاک کیوں نہ ہو، اس کے لئے غیر مرد ہے اور پھر لوگوں کے منہ بند نہیں کئے جا سکتے۔ مریم نے کہا کہ لوگ میرے منہ پر آ کر مجھے بدنام اور رسوا کریں تو بھی وہ پرواہ نہیں کرے گی۔ جہانگیر نے اسے کہا کہ وہ نہ آیا کرے، اس کی بجائے وہ خود اس کے گھر آجایا کرے گا۔ مریم نے یہ بھی قبول نہ کیا۔

نفسیات کے ڈاکٹروں سے پوچھیں، وہ آپ کو بتائیں گے کہ مریم کی طرح پیار کی ترسی ہوئی لڑکیاں عموماً کسی نہ کسی کے پیار کے دھوکے میں آ کر خراب ہو جاتی ہیں اور اس قسم کے فریب کار انہیں گم ہی کر دیتے ہیں۔ مریم کے کردار میں ایسی کوئی کمزوری پیدا نہ ہوئی، البتہ وہ ذہنی لحاظ سے ٹھیک نہ رہی۔ جہانگیر کے پاس جا کر وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی تھی۔ یہ جہانگیر ہی کا اثر تھا کہ اس نے مریم کو بھٹکنے یا خراب نہ ہونے دیا اور اس کے کردار میں شرافت اور پاکیزگی قائم رکھی۔

مریم کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہو گئی تو اس کے رشتے کے خواہشمند آنے لگے۔ اس کے ماں باپ دیکھنے لگے کہ اس لڑکی کا رشتہ کسے دیا جائے۔ جب تک ماں باپ نے کسی کو پسند نہ کیا، مریم خاموش رہی۔ آخر ایک لڑکا پسند کر لیا گیا۔ مریم سے تو ماں نے پوچھا ہی نہیں کہ اسے یہ لڑکا اچھا لگتا ہے یا نہیں۔ اس کی شادی حکماً کی جا رہی تھی۔ ایک روز مریم نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس لڑکے کے ساتھ اور کسی اور کے ساتھ بھی شادی نہیں کرے گی۔ یہ تو ایک بم تھا جو مریم نے اپنے گھر میں گرا دیا۔ باپ کو پتہ چلا تو اس نے مریم کی پٹائی کر دی۔ بھائیوں نے بھی اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ مریم پوری طرح باغی ہو گئی۔ اس نے کہا بہتر ہے مجھے جان سے مار دو ورنہ میں شادی کے عین موقع پر کہہ دوں گی کہ اس لڑکے کو قبول نہیں کرتی۔

مریم کا یہ رویہ سارے محلے کو معلوم ہو گیا اور عورتوں کی زبانی اس لڑکے کے گھر تک پہنچ گیا جنہیں مریم کا رشتہ دیا جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے پیغام بھیجا کہ وہ ان کی بیٹی کو قبول نہیں کریں گے اور یہ رشتہ منسوخ سمجھا جائے۔ مریم کو اس کی بھی سزا دی گئی لیکن مریم پتھر ہو چکی تھی۔ اب وہ دلیری سے جہانگیر کے گھر جاتی اور کچھ وقت گذار آتی۔ جہانگیر کی عمر پچاس برس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ جہانگیر نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ ماں باپ کو یوں ذلیل اور پریشان نہ کرے اور شادی کر لے۔ مریم کہتی تھی کہ اس کے ماں باپ نے اسے جس جہنم میں پالا ہے، اس کا اثر اس کے ذہن میں ہے اور اس پر وہ قابو نہیں پا سکتی۔ وہ ماں باپ کا کہا ماننا چاہتی تھی تو اس کے اندر کوئی ایسی قوت تھی جو اسے انکار پر مجبور کر دیتی تھی۔

مریم کو گھر میں اچھوت کی حیثیت دے دی گئی۔ ایک روز اس نے اعلان کر دیا کہ وہ جہانگیر کے ساتھ شادی کرے گی۔ یہ ایک اور بم تھا جو اس نے اپنے گھر میں گرا دیا تھا۔ اس کے دھماکے سے ماں باپ اور بھائیوں کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ ان کے لئے ایک صدمہ تو یہ تھا کہ مریم اپنی عمر کا کوئی رشتہ قبول نہیں کرتی تھی اور اب دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ ان کی بیٹی کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

مریم کے ماں باپ اور اس کے بھائی جو بڑی اچھی تعلیم بھی پا چکے تھے، یہ سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے کہ مریم جہانگیر کو کیوں اتنا زیادہ چاہتی ہے کہ اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق یہ سوچا کہ لڑکی جہانگیر سے ملتی ملاتی رہتی ہے اور جہانگیر نے اسے پھانس لیا اور اس پر نہ جانے کیسا جادو کر دیا ہے کہ لڑکی اس کی

بیوی بننے پر آ گئی ہے۔ مریم کے ماں باپ جہانگیر کے جا سر چڑھے اور اس پر الزام ٹھونسا کہ اس نے ان کی بیٹی کو گمراہ کر دیا ہے۔ جہانگیر نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تو مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

جہانگیر نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ مریم کو وہ کسی اور حیثیت سے چاہتا تھا لیکن مریم نے ایسے والہانہ طریقے سے اس کے ساتھ پیار اور محبت کا اظہار کیا کہ اس میں مردوں والی کمزوری بیدار ہوگئی اور اس نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ لڑکی راضی ہے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ اس طرح جہانگیر کے پیار و محبت کا انداز اور رنگ بدل گیا۔

مریم کے باپ نے جہانگیر کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیا اور یہ بات دور تک پہنچی۔ مریم کے بھائیوں نے جہانگیر کو کسی کی معرفت دھمکیاں دیں جن کے جواب میں جہانگیر نے کہا کہ اب وہ ان کی بہن کے ساتھ شادی کر کے ہی رہے گا۔

مریم پر ایک اور رشتہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی جو مریم نے ٹھکرا دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ گھر سے نکل جائے گی اور جہانگیر کے گھر پہنچ جائے گی اور وہاں شادی کر لے گی......

یہ بات خاصی لمبی ہے، میں اسے مختصر کر کے سناتا ہوں۔ یہ مسئلہ برادری کے پنچوں تک پہنچا۔ جہانگیر گزٹیڈ افسر ہو چکا تھا اور سوسائٹی میں اسے بڑا ہی باعزت مقام حاصل ہو گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا اور اس نے لوگوں کے ساتھ نیکی ہی کی تھی، اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔

برادری کے پنچوں یعنی بزرگوں نے حالات کا جائزہ لے کر اور مریم کا رویہ دیکھ کر اور پھر جہانگیر کی حیثیت اور کردار دیکھ کر یہ فیصلہ دے دیا کہ لڑکی کی شادی جہانگیر کے ساتھ کر دی جائے۔ اس طرح ایک روز جہانگیر اور مریم کی شادی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی بھائیوں نے مریم کے ساتھ قطع تعلق کر لیا جس کی مریم کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

جنت جہنم بن گئی

مریم کو یوں سکون اور روحانی اطمینان ملا جیسے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں آ گئی ہو۔ یہ اس پیار کا کرشمہ تھا جو اسے اس کے ماں باپ سے ملنا چاہئے تھا لیکن وہ جہانگیر سے ملا جو عمر میں اس کے باپ جیسا تھا۔ ''حکایت'' میں آپ محترم میم الف کے مضمون پڑھتے رہتے ہیں۔ میں یہی مضامین عملی شکل میں دیکھ رہا تھا۔ شعوری طور پر جہانگیر کو اپنا باپ سمجھتا تھا وہ

باپ جس کے دل میں اس کا پیار تھا اور شفقت بھی تھی۔

ایک سال پیار محبت میں ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ مریم نے اپنے بیان میں بتایا کہ تلخیاں ختم ہو گئی تھیں۔ مریم کا یہی فطری مطالبہ تھا۔ ایک سال گزر گیا تو جہانگیر کا رویہ بدلنے لگا۔ یہاں پھر نفسیات سامنے آ جاتی ہے۔ یہ اس بوڑھے آدمی کی نفسیات ہوتی ہے جو مریم جیسی کم عمر لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔

بڑھاپا ایسے خاوند کو ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مرد کی ذات میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نوجوان بیوی کے قابل نہیں۔ اگر بیوی کوئی شکایت زبان پر نہیں لاتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی ہے یا اس نے در پردہ اپنی تسکین کا کوئی ذریعہ پیدا کر رکھا ہے یعنی اس نے کسی کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہے۔ میں نے آپ کو دو تین کہانیاں سنائی ہیں کہ اس قسم کے بوڑھے خاوند نے اپنے جوان بیٹوں پر بھی شک کیا کہ انہوں نے اپنی نوجوان سوتیلی ماؤں کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات پیدا کر رکھے ہیں۔ ایسا بوڑھا خاوند اپنے جوان بیٹے کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔

جہانگیر میں بھی یہی نفسیاتی عمل یا ردِّعمل شروع ہو گیا۔ اس نے اپنے بیان میں اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ جب دیکھتا تھا کہ مریم اتنی زیادہ خوش رہتی ہے تو اسے شک ہونے لگا کہ اس کمسن لڑکی نے اپنی جسمانی تسکین کا کوئی اور ذریعہ بنا لیا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جہانگیر نے مریم کو شکی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ تو اس کی طبیعت پہلے ہی وہمی سی تھی، اب یہ وہم پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا۔ وہ بات بات پر مریم کو ٹوکنے لگا۔ دفتر سے آتا تو اس سے پوچھتا کہ وہ چھت پر گئی تھی یا نہیں۔ اگر وہ کہہ دیتی کہ گئی تھی تو جہانگیر پوچھتا، کسے دیکھنے گئی تھی؟ اور پھر اس پر الزام تھوپ دیتا۔

مریم نے الگ بیان میں کہا کہ وہ جس جہنم سے نکلی تھی وہ جہنم از سر نو پیدا ہونے لگا اور اس کی جنت جہنم میں بدلنے لگی۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ اگر مریم نے عقل کو استعمال کر کے جہانگیر کے ساتھ شادی کا فیصلہ کیا ہوتا تو وہ اب بھی عقل کو استعمال کر کے جہانگیر کے شکوک رفع کرتی اور اس کی نفسیات کو سمجھتی لیکن جہانگیر کے ساتھ شادی کا فیصلہ جو مریم نے کیا تھا اس کے پس منظر میں اس کی نفسیاتی محرومیاں اور جذباتی گھٹن تھی۔ یہی تلخیاں تھیں جنہوں نے مریم کو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کا دشمن بنا دیا تھا۔ اب جہانگیر نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک شروع

کر دیا تو مریم پھر اسی ڈگر پر آ گئی کہ یہ شخص تو اس کا دشمن ہے۔ یوں سمجھیں کہ سپیرے جن سانپوں کو پالتے ہیں ان کا زہر مار کر رکھتے ہیں یا ان میں زہر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ مریم وہ ناگن تھی جس کا زہر جہانگیر نے اپنے پیار اور شفقت سے مار دیا تھا۔ اس ناگن نے موقع دیکھا اور شہ ملی تو اس کے اندر پھر وہی زہر پیدا ہو گیا۔ اب وہ پھر ڈسنے کے لئے تیار تھی۔ ماں باپ کے گھر میں اس کے اندر جو خودسری اور سرکشی پیدا ہوئی تھی اسے جہانگیر نے دبا دیا تھا لیکن اب پھر اس میں سرکشی اور خودسری نے سر اٹھایا۔

ایک روز جہانگیر نے کچھ ایسا ہی شک کیا تو مریم نے اسے کھری کھری سنا ڈالیں۔ جہانگیر نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ یہ آخری حد تھی مریم کی برداشت کی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ جہانگیر سے انتقام لینے کے طریقے سوچنے لگی۔ اتفاق کی بات دیکھیں کہ ان ہی دنوں اس کی بے تکلفی بشریٰ کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ یہ میں پہلے بشریٰ کی زبانی سنا چکا ہوں کہ اس عورت نے مریم کی عقل کس طرح اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ مریم بھری بیٹھی تھی اور وہ سمجھی کہ اسے جو پیار ملا تھا وہ پھر اس سے محروم ہو گئی ہے۔

اس نے اپنے بیان میں کہا کہ بشریٰ نے اسے طریقہ بتایا کہ جس سے جہانگیر سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ مختصر یہ کہ مریم نے بشریٰ کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ جمالی نے جہانگیر کو قتل کرنے کا یہ طریقہ بتایا تھا۔ دراصل یہ اقبال جرم یا سچا بیان جہانگیر پہلے ہمیں دے چکا تھا اور اس نے مریم کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ سچ بولے اور جو کچھ ہوا ہے، وہ بالکل صحیح بیان کرے۔ مریم نے اس کے کہنے پر پورا پورا عمل کیا۔ اس نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ جہانگیر کو اس طرح مروا کر وہ خودکشی کر لے گی۔ اس کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ جوان آدمی بھی تھا جس کے متعلق بشریٰ نے اسے بتایا تھا۔ مختصر یہ کہ مریم ایک بڑے ہی خطرناک دوراہے پر پہنچ چکی تھی اور فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ خاوند کو مروا کر وہ کیا کرے گی۔

ایک تو یہ واردات عجیب و غریب تھی اور پھر جس طرح جہانگیر اور مریم نے بیان دیئے، وہ بھی حیران کن بات تھی۔ حیران کن اس لئے کہ اتنا سچ یا اتنی دلیری سے سچ کوئی خدا کا خاص بندہ ہی بولتا ہو گا۔ یہ کہانی ایک اور ہی مقام پر آن پہنچی۔ اس کے متعلق جہانگیر نے مجھے الگ بیان دیا اور مریم نے الگ دیا اور دونوں کے بیان ایک دوسرے کی تصدیق کرتے تھے۔

وہ رات آئی جب جمالی نے جہانگیر کے گھر آ کر اس کا گلا دبانا تھا اور اس کی لاش کو چھت کے پنکھے کے ساتھ لٹکانا تھا۔ جہانگیر کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ہو سکتی ہے۔ وہ تو روزمرہ کی طرح سویا اور پھر نیند نے اسے بالکل ہی بےخبر کر دیا۔ مریم کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کسی کو سوتے میں قتل کر دینا آسان ہے لیکن قتل کرنا آسان کام نہیں۔ یہ قتل ایسی نوعیت کا تھا جو ایک خوفناک ڈرامہ تھا۔ مریم کو پوری طرح یقین نہیں تھا کہ یہ ڈرامہ کامیاب ہو جائے گا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ جمالی کے آنے سے پہلے ہی جہانگیر کی آنکھ نہ کھل جائے۔

خاوند واپس کر دیا

مریم لیٹ تو گئی لیکن نیند نہ آئی۔ اس کے ذہن میں کشمکش جاری ہو گئی اور جمالی کے آنے کا وقت قریب آ گیا۔ مریم نے باہر والا دروازہ کھلا رکھا تھا۔ صرف کواڑ بند تھے۔ جب رات آدھی گزر گئی اور اب کسی بھی لمحے جمالی نے آ جانا تھا، مریم اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں زیرو نمبر کا نیلا بلب جل رہا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے جہانگیر کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سویا ہوا اور سکون کی سانسیں لے رہا تھا۔

مریم کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ آہستہ آہستہ مریم کا ذہن پیچھے گزرے ہوئے دنوں کی طرف چل پڑا۔ اسے اپنے گھر کی اذیتیں اور تلخیاں یاد آئیں اور پھر اسے وہ جہانگیر یاد آیا جو اس کے مجروح جذبات کو پیار سے سہلا لیا کرتا تھا۔ آج رات مریم اس جہانگیر کو قتل کر رہی تھی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پیار اور اپنی محبت کو نذر آتش کر رہی ہو۔ مریم نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ جب جہانگیر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی تو جہانگیر نہ جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یہ مسکراہٹ ایک تلوار بن گئی اور یہ تلوار مریم کے دل میں اتر گئی اور پھر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے اس کے دل میں جو زہر بھر گیا تھا وہ بہہ نکلا ہو۔ مریم کے ہاتھ جہانگیر کے چہرے کی طرف بڑھے۔ وہ اس چہرے کو ہاتھوں میں لے کر چوم لینا چاہتی تھی کہ جہانگیر کی آنکھ کھل گئی اور وہ مریم کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور پوچھا وہ کیوں جاگ رہی ہے۔

مریم اس کے ساتھ لپٹ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جہانگیر نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ مریم کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی تو روتے

روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ جہانگیر اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔

''مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دیں'' ___ مریم نے روتے ہوئے کہا ___ ''میرا گلا گھونٹ دیں۔ میں آپ کے پیار کی قیمت نہیں چکا سکی اور مجھ سے آپ ناراض ہیں''۔

جہانگیر کے دل میں اس کی محبت تو تھی ہی، اس نے مریم کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور کہا کہ اسے اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ مریم نے جہانگیر کو بتایا کہ آج رات وہ اسے قتل کروانا چاہتی تھی اور جمالی آنے ہی والا ہوگا۔ جہانگیر حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا لیکن مریم رو رو کر اسے بتا رہی تھی کہ وہ نہ جانے کس پاگل پن میں یہ ڈرامہ رچا بیٹھی تھی لیکن اب وہ دل سے ساری کدورت نکال چکی ہے اور محبت کے جواب میں وہ بتا رہی ہے کہ موت جہانگیر کی طرف بڑھی آرہی ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے جہانگیر کو بتا دیا کہ بشریٰ نے کیا طریقہ سوچا تھا اور جمالی اس طریقے پر عمل کرنے کے لئے آرہا ہے۔

جہانگیر نے اپنے بیان میں اس واقعہ کی پوری تفصیل سنائی اور کہا کہ مریم کی حالت ایسی تھی کہ اس کے دل سے مریم کے خلاف سارے وہم اور ساری شکائتیں نکل گئیں بلکہ اس لڑکی پر ترس آنے لگا کہ اپنے باپ کے گھر یہ اذیتوں میں پڑی رہی اور اسے مجھ سے محبت ملی تو میں نے اس پر بے ہودہ الزام تھوپے۔

جہانگیر نے مریم سے کہا کہ جمالی کو آنے دو۔ تم باہر دروازے پر چلی جاؤ اور اسے کہنا کہ جہانگیر شام کو گھر آیا تھا اور اسے اچانک آگرہ جانا پڑا ہے اور وہ کل شام کو واپس آئے گا۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔ جہانگیر نے مریم کو بتایا کہ کہ بشریٰ اس کی ہمدردی میں نہیں بلکہ اس کے ذریعے جہانگیر سے انتقام لے رہی تھی۔

مریم باہر چلی گئی اور باہر والے دروازے کے ساتھ اندر کی طرف جا کھڑی ہوئی۔ جہانگیر صحن میں آگیا اور ڈیوڑھی کے اندر والے دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر والا کواڑ کھلا اور جمالی اندر آیا۔ مریم نے اس کا استقبال کیا اور کہا کہ آج شام جہانگیر گھر آیا اور کسی سرکاری کام لئے فوراً ہی آگرہ کے لئے روزانہ ہو گیا تھا اور کل شام واپس آئے گا اس لئے یہ کام کل رات کریں گے۔

جمالی غنڈہ اور بدمعاش تھا اور وہ جرم و گناہ کی دنیا کا بندہ تھا۔ اس نے سنا کہ جہانگیر گھر میں نہیں اور مریم گھر میں اکیلی ہے تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور مریم سے کہا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے، آؤ اندر چلتے ہیں اور آج تھوڑا سا جشن ہی منا لیتے ہیں۔ تمہارا کام آج نہیں تو

کل ہو ہی جائے گا، چلو اندر۔ اس کے ساتھ ہی جمالی نے باہر والے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور مریم کو بازو سے پکڑا۔ مریم سمجھتی تھی کہ یہ اس کے ساتھ اندر کیوں آرہا ہے۔ اس نے جمالی سے کہا کہ وہ واپس چلا جائے اور وہ اسے اندر نہیں آنے دے گی۔

''بے وقوف لڑکی!'' ___ جمالی نے کہا ___ ''میں اس کام کے کئی کئی ہزار روپے لیا کرتا ہوں اور تمہارا کام مفت کر رہا ہوں اور تم ہو کہ مجھے مایوس کر کے گھر سے نکال رہی ہو۔ میں جہانگیر جیسا بوڑھا تو نہیں''۔

مریم نے لپک کر باہر والے دروازے کی چٹخنی کھول دی اور جمالی سے کہا کہ وہ چلا جائے اور پھر یہاں کبھی نہ آئے لیکن جمالی نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اندر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ مریم اچھل کود کر رہی تھی۔ جمالی نے اسے کمر سے دبوچ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن مریم پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی۔

جہانگیر ڈیوڑھی والے دروازے کے ساتھ صحن کی طرف کھڑا تھا۔ اس نے جونہی دیکھا کہ جمالی دست درازی پر اتر آیا ہے تو وہ دبے پاؤں دوڑتا باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے مرچ مصالحہ رگڑنے والا ڈنڈہ لے آیا۔ آپ جانتے ہیں یہ ڈنڈہ کتنا وزنی ہوتا ہے۔ جہانگیر نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ ایسا ارادہ ہوتا تو وہ باورچی خانے سے چھری لے آتا۔

جہانگیر ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ سوئچ اندر والے دروازے کے ساتھ تھا جہانگیر نے سوئچ آن کر کے ڈیوڑھی روشن کر دی۔ اس وقت جمالی مریم کو اندر والے دروازے کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ اس نے مریم کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ جہانگیر نے اتنا وزنی اور موٹا ڈنڈہ گھما کر پوری طاقت سے جمالی کے سر پر مارا۔ جمالی کے ہاتھ سے مریم کا بازو چھوٹ گیا اور وہ چکرا کر گرا۔

جہانگیر نے دیکھا تو جمالی ابھی سانس لے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہوش میں آئے تو اسے گھر سے باہر نکال دے۔ وہ جمالی کو اور زیادہ مارنا نہیں چاہتا تھا۔

مریم نے گھبرا کر جہانگیر سے کہا کہ دیکھیں، یہ مر ہی تو نہیں گیا؟...... جہانگیر نے جمالی کی نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا اور پھر انگلی اس کی ناک پر رکھی تو پتہ چلا کہ وہ مر چکا ہے۔ مریم بہت ہی گھبرائی لیکن جہانگیر ذرا بھی گھبرایا ہوا نہیں تھا۔

میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جہانگیر نے بتایا کہ اس وقت جمالی کی ناک

اور منہ سے ذرا سا بھی خون نہیں نکلا تھا۔ جہانگیر نے اپنے بیان میں کہا کہ اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو چکی تھی جس میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا کہ اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بشریٰ نے اس سے انتقام لینے کے لئے مریم کو استعمال کیا تھا اور جمالی کو بھیجا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ بشریٰ کا خاوند اسے واپس دے دوں۔

اس نے جمالی کی لاش اس طرح اپنے کندھے پر اٹھائی کہ لاش کا سر جہانگیر کی پیٹھ کے پیچھے لٹک رہا تھا اور ٹانگیں آگے کو تھیں۔ جمالی دبلا پتلا آدمی تھا اور اس کے مقابلے میں جہانگیر گٹھا ہوا اور تندرست تھا۔ اس طرح جہانگیر بے خوف وخطر جمالی کی لاش اٹھائے اس کے گھر پہنچا، دروازے کا کواڑ کھولا اور اسے دروازے کے اندر پھینکا اور وہاں سے بڑے اطمینان سے واپس آ گیا۔ وقت آدھی رات کے بعد کا تھا اس لئے گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ اسے جاتے اور آتے کسی نے بھی نہ دیکھا۔

وہ خون کے قطرے جو گلیوں میں دیکھے گئے تھے، ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جمالی کا دماغ پھٹ گیا تھا اور اس کا خون اندر ہی جمع ہو گیا تھا۔ جہانگیر نے جب لاش اٹھائی اور اس کا سر پیچھے کو لٹکا تو خون ناک کے راستے باہر گرتا رہا۔ جہانگیر نے بتایا کہ جب وہ واپس آیا تو مریم نے اسے بتایا کہ اس کے کپڑوں پر پیچھے کی طرف خون لگا ہوا ہے۔ مریم نے اسی وقت وہ کپڑے اچھی طرح دھو ڈالے۔

واردات کی بات تو یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے جو کہانی ہے وہ پولیس کا اندر کا معاملہ ہے کہ کس طرح کیس تیار کیا جائے کہ ملزموں کو سزا ہو۔ اگر یہ کیس میرے کسی تھانے کا ہوتا تو میں جہانگیر کو گرفتار تک نہ کرتا۔ مقتول جرائم پیشہ اور غنڈہ تھا اور اسے بیوی نے استعمال کیا تھا اور بیوی بھی اچھے کردار کی نہیں تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ یہ کرائمز برانچ تھی جہاں ہم کوئی رعایت نہیں کر سکتے تھے۔

سب انسپکٹر جگت سنگھ سندھو نے اچانک مجھے باوز سے پکڑا اور اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلوں۔ میں اس کے ساتھ دوسرے میں کمرے میں چلا گیا۔

''کیا خیال ہے ملک جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''اگر یہ میرے تھانے کا کیس ہوتا تو میں یہیں گول مول کر دیتا۔ ان میاں بیوی کو تو میں کبھی سزا نہیں ہونے دوں گا''۔

مجھے سندھو کی یہ بات سن کر خوشی ہوئی۔ وہ میرے خیال اور ارادے کی تائید کر رہا تھا۔ ہم نے آپس میں طے کر لیا اور پھر جہانگیر، مریم اور بشریٰ کو باقاعدہ گرفتار کر کے ان

کے خلاف کیس تیار کرنا شروع کر دیا۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ یہ یقین ہو جائے کہ یہی شخص اصل مجرم ہے لیکن شہادت کی کمی ہے تو یہ کمی پوری کر لی جاتی ہے جسے پیڈنگ کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرم بچ کر نہ جائے لیکن اس کیس میں ہم نے ذرا سی بھی پیڈنگ نہ کی اور دانستہ ایسی دو کمزوریاں رکھ دیں جن کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہو سکتی تھی اور انہیں کورٹ میں ہی جا کر ظاہر ہونا تھا۔

بہر حال یہ پولیس کے اندر کے معاملے ہیں جو آپ کی دلچسپی کے نہیں ہیں۔ آپ کو کہانی سنا دی ہے۔ ہوا یہ کہ سیشن کورٹ میں کیس چلا تو سیشن جج جو ایک ہندو تھا، بہت ہی قابل قانون دان تھا۔ اس نے تینوں کو بری کر دیا۔ اس کا فیصلہ خاصا لمبا تھا، اس میں اس نے ایک فقرہ بھی لکھا کہ عقل تسلیم نہیں کرتی کہ ایک معزز آدمی جس نے کبھی چھوٹے سے جرم کی بھی نہیں سوچی تھی، وہ ایک آدمی کو قتل کر دے اور پھر اس کی لاش اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔

یہ تو سیشن جج کے الفاظ تھے، مجھے جہانگیر کے الفاظ بھی آج تک یاد ہیں۔۔۔ ''میں نے بشریٰ کا خاوند اسے واپس کر دیا تھا''۔

+++

جھمکوں کی جوڑی

وہ مجھے گھورتا ہوا کچھ اور کہے بغیر میرے دفتر سے نکل گیا۔ میں نے ہمیشہ اور ہر حال میں غصے کو اپنے قابو میں رکھا ہے لیکن اس روز غصے پر قابو پانا بڑا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

اس قصبے کے تھانے میں مجھے ایک سال ہو گیا تھا۔ کچھ اردگرد کا دیہاتی علاقہ بھی اس تھانے کے تحت آتا تھا۔ یہ ایک پرامن علاقہ تھا۔ پرامن اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہاں قتل کی وارداتیں بہت ہی کم ہوتی تھیں۔ ڈاکہ زنی، راہزنی اور نقب زنی کی وارداتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن یوں نہیں جیسے یہ وارداتیں آج کل ہمارے ملک کے ہر شہر، قصبے اور دیہات کا روزمرہ کا معمول بنی ہوئی ہیں۔ یہ وارداتیں پیشہ ور لوگ کیا کرتے تھے اور ہر واردات پولیس کے لئے بہت بڑا چیلنج ہوتا تھا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ افسروں اور خوشحال خاندانوں کے لڑکے شوقیہ وارداتیں کرتے پھرتے ہیں۔ واردات کے علاقے کا تھانے دار ان کا حصہ دار ہوتا ہے۔ جرائم تو کسی بھی دور میں ختم نہیں کئے جا سکے۔ انسان جہاں سوسائٹی اور معاشرے کی صورت میں بستا رہتا ہے وہاں مجرم بھی ہوتے ہیں۔ پولیس اگر دیانت دار اور فرض شناس ہو تو جرائم کا گراف نیچے ہی رکھتی ہے۔

یہ مشرقی پنجاب کا ایک قصبہ تھا جو اب شہر بن چکا ہے۔ میرے وقتوں میں تو یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ اناج کی بہت بڑی منڈی تھی۔ یہ ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ اردگرد کے دیہاتی لوگ اس سٹیشن پر گاڑی سے اترتے اور یہیں سے سوار ہو کر ادھر اُدھر جاتے تھے۔ میں حسب معمول اس قصبے کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اس واردات اور اس کی تفتیش میں جن افراد کے نام آتے ہیں، ان میں سے بیشتر 1947ء میں پاکستان آ گئے تھے۔ ان میں بعض شاید زندہ بھی نہ ہوں لیکن ان کی آل اولاد یہاں موجود ہے۔ ایک پیر کا خاص طور پر نام آتا ہے۔ اس علاقے کی یہ ایک بڑی گدی تھی جس کی مریدی کا حلقہ بڑا ہی وسیع تھا۔ یہ پیر بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا اور اس کی گدی یہاں بھی دور دور تک مشہور اور مقبول ہے۔ میں صحیح نام لکھ کر اس عمر میں قتل نہیں ہونا چاہتا۔ قتل ہو گیا تو میرے پسماندگان کی رپورٹ تھانے دار لکھے گا ہی نہیں۔ تھانے دار کہے گا کہ اس بڈھے کو کل نہیں تو پرسوں مر ہی جانا تھا۔ اگر یہ آج مارا گیا ہے تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ اچھا ہوا کسی نے اسے

دو روز پہلے ہی اس دنیا سے اور اس بڑھاپے سے فارغ کر دیا ہے۔

ایک صبح ابھی دھندلی ہی تھی کہ قصبے کا ایک شخص میرے گھر آیا۔ وہ پہلے تھانے میں گیا تھا۔ دیکھا کہ میں ابھی گھر سے ہی نہیں آیا تو وہ میرے گھر چلا آیا۔ کوئی اور آدمی کسی تھانے دار کے گھر اور وہ بھی اتنی سویرے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک صاحب حیثیت شخص تھا۔ اس کا تعلق اکثر میرے ساتھ یا تھانے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کوئی بڑا افسر یا عہدے دار نہیں تھا نہ کسی اونچے رتبے والا تھا۔ مشہور فراڈیا تھا لیکن اس کا شمار قصبے کے معزز سفید پوشوں میں ہوتا تھا۔ پولیس کا بڑا پکا اور کارآمد مخبر بھی تھا۔ میں آگے چل کر اس کی فریب کاریوں کی تھوڑی سی تفصیل پیش کروں گا۔

مجھے جب پتہ چلا یہ شخص شیخ نذیر (یہ اصلی نام نہیں) آیا ہے تو میں سمجھا کوئی بڑی اہم خبر سنانے آیا ہے۔ ایسے ہی لوگ پولیس کے ذرائع ہوتے ہیں جن سے تھانے دار لوگوں کے گھروں کی اندرونی باتیں بھی معلوم کر لیتا ہے اور گہرے دفن کئے ہوئے راز بھی تھانے دار تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں فوراً باہر نکلا اور اسے کمرے میں بٹھایا۔ وہ تو گھبراہٹ کے عالم میں تھا۔

''میں تو لٹ گیا ہوں ملک صاحب!'' ___ اس نے ایسی آواز میں کہا جو کانپ رہی تھی۔

''کیوں؟...... کیا ہوا؟''

''چل کر دیکھیں تو سہی'' ___ اس نے کہا ___ ''میرے گھر کے پچھواڑے نقب لگی ہے''۔

''نقصان زیادہ ہوا ہے؟''

''تمام کے تمام زیورات نکل گئے ہیں ملک صاحب!'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''زیورات تھوڑے سے تو نہیں تھے۔ میری بیوی کا زیور تھا، دونوں بیٹیوں کی شادی کے لئے سارا زیور تھا۔ یہ تمام زیورات نکل گئے ہیں...... کچھ قیمتی کپڑے بھی اس ٹرنک میں تھے جو ڈاکو لے گئے ہیں لیکن زیورات اتنے زیادہ تھے کہ میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے''۔

میں نے اور دوسرے انسپکٹر صاحبان نے بھی جو ''حکایت'' کے لئے جرائم کی کہانیاں لکھتے ہیں، کئی بار بتایا ہے کہ نقب کس طرح لگائی جاتی تھی۔ یہاں مختصراً بتا دیتا ہوں۔ جس گھر میں واردات کرنی ہوتی تھی، اس کے پچھواڑے والی دیوار میں سے زمین کے قریب چند

ایک اینٹیں بڑی صفائی سے اور آواز پیدا کئے بغیر نکالی جاتی تھیں اور اتنا بڑا شگاف بنا لیا جاتا تھا جس میں سے ایک آدمی آرام سے پیٹ کے بل رینگ کر اندر باہر آ جا سکتا تھا اور جس میں سے ایک ٹرنک نکالا جا سکتا تھا۔ ہر جرائم پیشہ آدمی نقب زنی نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ ایک الگ تھلگ فن تھا جس کے لئے زیادہ تجربے کی ضرورت ہوتی تھی۔

نقب زنی عموماً گرمیوں کے موسم میں کی جاتی تھی جب گھر والے چھتوں پر سوتے تھے یا صحن میں۔ کمروں میں گھر کا کوئی فرد نہیں ہوتا تھا۔ نقب زنی گھر بھیدی کے بغیر ذرا مشکل سے ہی کامیاب ہوتی تھی۔ گھر بھیدی ڈاکوؤں کو بتاتا تھا کہ نقب کس کمرے کی دیوار میں لگائی جائے اور مال کہاں اور کس طرح پڑا ہوا ہے۔ نقب زنوں کا کمال یہ ہوتا تھا کہ اتنی ساری اینٹیں یا پتھر نکال لیتے تھے لیکن ذرا سی بھی آواز یا دھمک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ گھر والوں کو صبح پتہ چلتا تھا کہ وہ تو لٹ چکے ہیں۔ نقب کے لئے زیادہ موزوں وہ مکان ہوتے تھے جن کے پچھواڑے جگہ خالی ہوتی یا کھیت ہوتے تھے۔

نقب زنی کی واردات خاص طور پر ایک چیلنج ہوتا تھا جو ملزموں کی طرف سے پولیس کو ملتا تھا۔ ایسی وارداتوں کی تفتیش بہت ہی مشکل ہوتی تھی کیونکہ ملزم کوئی سراغ یا اپنی نشانی نہیں چھوڑ جاتے تھے سوائے اپنے کھروں کے۔ آج کل تو نقب زنی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کوئی بھی شخص کلاشنکوف یا ریوالور لے کر اور علاقہ تھانے دار کی آشیرباد حاصل کر کے دن دیہاڑے کسی بھی گھر میں جا کر اور گھر والوں کو ایک طرف کھڑا کر ان کے گھر کا صفایا کر سکتا ہے۔

اب آپ کو توقع ہوگی کہ میں یہ کہوں گا کہ اس شخص کے نقصان پر مجھے بہت ہی افسوس ہوا اور میرے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہو گئی اور میں موقعہ واردات کی طرف اٹھ دوڑا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ذرا جتنا بھی افسوس نہ ہوا نہ میرے دل میں اس شخص کی ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ شخص پکا فراڈیا تھا لیکن معزز اور سفید پوش سمجھا جاتا تھا۔ میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا، وہ اس طرح کہ میرے پاس آتا رہتا تھا اور مخبری تو خاص طور پر کرتا تھا۔

مخبری کے ساتھ غیبت بھی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ طرے والی پگڑی یا پھندنے والی لال ترکی ٹوپی سر پر رکھتا، سفید شلوار قمیض پہنتا اور نہایت اچھی شیروانی اس کا خاص لباس تھی۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھا کرتا تھا اور کسی نہ کسی طرح مسجد میں اپنی موجودگی

کا احساس سب کو دلا دیتا تھا۔ میں بھی اسی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ یہ شخص اپنی موجودگی کا احساس اس طرح دلاتا تھا کہ نماز ختم ہو جاتی تو یہ اٹھ کر اعلان کرتا تھا کہ بیٹھے رہو بیٹھے رہو، اور پھر دو چار منٹ کسی مسئلے پر تقریر کر ڈالتا۔ یہ نہ کرتا تو یہ تو وہ ضرور کرتا تھا کہ دعا بھی ہو جاتی تو اٹھ کھڑا ہوتا اور کہتا تھا ـــــ ''بیٹھے رہو بیٹھے رہو، بارش کے لئے دعا کرو...... بیماروں کے لئے دعا کرو کہ اللہ سب کو صحت یاب کرے''۔

اگر میں یہ تفصیل سے بتانے لگوں کہ اس کی فریب کاریاں کس طرح چلتی تھیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ مختصراً یہ مثال کے طور پر بتاتا ہوں کہ کبھی کبھار دیہاتی علاقے میں چلا جاتا اور کسی بھی گاؤں میں جا رکتا اور کہتا کہ قصبے کی جامع مسجد کا ایک مینار گرنے والا ہے یا یہ کہ جامع مسجد کا فرش اکھڑ گیا ہے یا ایسا ہی کوئی جھوٹ بول کر چندے کی اپیل کرتا اور لوگ اسے نقد چندے کے علاوہ گندم کی دو دو من کی بوریاں بھر کر دے دیتے تھے اور بیل گاڑی پر قصبے تک بھی پہنچا دیتے تھے۔ شیخ نذیر نقد رقم جیب میں رکھتا اور گندم منڈی میں بیچ ڈالتا تھا۔ قصبے کے لوگ اسے معزز آدمی سمجھ کر اس کا احترام کرتے تھے۔ شکل وصورت سے بھی وہ معزز لگتا تھا اور اصل جادو اس کی زبان میں تھا۔

اس کا ایک کمال یہ تھا کہ لوگوں کی زمینوں پر یا کسی کے مکان پر قبضہ کر لیتا تھا اس طرح کہ قبضے کی رجسٹری باقاعدہ اشٹام پر مکمل ہوتی تھی اور اس میں جعلسازی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ کوئی شخص مر رہا ہوتا تو شیخ نذیر اشٹام لے کر پہنچ جاتا اور مرتے ہوئے آدمی کے دستخط کروا لیتا یا انگوٹھا لگوا لیتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ہر کسی کے ساتھ ایسا فراڈ نہیں کھیل سکتا تھا، وہ دیکھ لیتا تھا کہ یہ شخص اس کا شکار ہو سکتا ہے۔

مجھے دلی خوشی ہوئی کہ اس شخص کو بھی کسی نے لوٹا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے جو زیوارات چوری ہو گئے ہیں ان میں ایک رتی سونا بھی حلال کی کمائی کا نہیں تھا لیکن مال حلال کا تھا یا حرام کا، یہ نقب زنی کے ذریعے نکل گیا تھا اور میرا فرض تھا کہ ملزموں کو پکڑوں۔ میں نے جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کیا، اسے بھی ناشتہ کروایا اور پھر تھانے جا کر رپورٹ درج کی۔

دو بیٹیاں ایک بہو

تھانے جاتے ہی ایک کانسٹیبل کو کھوجی کی طرف دوڑا دیا کہ وہ موقعہ واردات پر پہنچ

جائے۔ میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر شیخ نذیر کے ساتھ موقعہ پر چلا گیا۔ عام شہری جب نقب لگی ہوئی دیکھتے ہیں تو ان پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جن بھوت آئے تھے اور یہاں سے دیوار توڑ کر مال نکال لے گئے ہیں۔

نقب مکان کے پچھواڑے والی دیوار میں لگی تھی۔ پیچھے کھیت تھا جس میں کوئی فصل نہیں تھی۔ مٹی کچی تھی اس لئے نقب کے قریب کھرے بڑے صاف اور واضح تھے۔ یہ کھرے کھوجی نے آ کر دیکھنے تھے اس لئے ایک کانسٹیبل کو وہاں کھڑا کر دیا کہ کھیت میں کوئی آدمی نہ آئے۔ میں شیخ نذیر کے ساتھ اس کے مکان میں اندر چلا گیا۔

نقب والے کمرے میں جا کر دیکھا، ٹرنک اسی کمرے میں رکھے تھے۔ اس کمرے میں کچھ اور سامان بھی پڑا تھا۔ باقی ٹرنک ٹھیک رکھے ہوئے تھے۔ دو ٹرنک الگ الگ فرش پر پڑے تھے۔ شیخ نذیر نے بتایا کہ ایک ٹرنک گیا ہے اور وہ ان دو ٹرنکوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک ٹرنک اور پڑا ہوا تھا۔

اس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ اس واردات میں گھر بھیدی بھی شامل تھا۔ ملزموں کو معلوم تھا کہ نقب کہاں لگانی ہے۔ نقب ٹرنکوں والے کمرے کی دیوار میں لگائی گئی۔ پھر ملزموں کو پہلے سے معلوم تھا کہ زیورات فلاں رنگ اور فلاں قسم کے ٹرنک میں پڑے ہیں اور اس پر دو ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چل رہا تھا کہ ملزموں نے ٹرنک کو کھولا نہیں نہ تالہ توڑا ہے۔

گھر بھیدی عموماً نوکر ہوا کرتے تھے یا اس قسم کی عورتیں جو گھروں میں صرف جھاڑو برتن کے لئے جاتی ہیں اور گھر کی عورتوں کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لیتی ہیں اور یہ سراغ لگا لیتی ہیں کہ یہ لوگ رقم اور زیورات کہاں رکھتے ہیں۔ شیخ نذیر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ گھر میں ایک نوکرانی صبح سے شام کے بعد تک موجود رہتی ہے اور رات کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلی جاتی ہے۔

شیخ نذیر نے بتایا کہ یہ نوکرانی بے چاری بہت ہی غریب، شریف اور مری مٹی سی عورت ہے اور یہ ایسی جرأت کرنے کے قابل ہے ہی نہیں کہ ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر واردات کروائے...... شیخ نذیر بڑا ہی کائیاں اور گہری نظر رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کی رائے غلط نہیں ہو سکتی تھی لیکن کوئی دوسرا شخص، عورت یا مرد، اس سے زیادہ گھاگ اور کائیاں بھی ہو سکتا تھا۔ یہ رائے مجھے قائم کرنی تھی کہ نوکرانی میں اتنی جرأت تھی یا نہیں۔ میں نے جو بات

بعد میں پوچھنی تھی وہ اسی وقت پوچھ لی۔ وہ یہ تھی کہ اس نوکرانی کی کوئی جوان بیٹی ہے اور اگر ہے تو کیا وہ اس گھر میں آتی رہتی ہے؟ یہ میں نے اس خیال سے پوچھا کہ یوں بھی ہوتا ہے کہ نوکروں یا نوکرانیوں کی بیٹیاں ان کے ساتھ کبھی کبھار ان کے کام والے گھروں میں چلی جاتی ہیں اور اس گھر میں کوئی جوان لڑکی ہو تو اس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لیتی ہیں۔ شیخ نذیر کے گھر میں اس کی دو جوان بیٹیاں تھیں اور بہو بھی جوان تھی۔ بیٹا ایک ہی تھا۔

شیخ نذیر نے بتایا کہ اس نوکرانی کی ایک جوان بیٹی بھی کبھار اس کے گھر میں آتی ہے اور اس نے اسے اپنی بیٹیوں اور بہو کے ساتھ بیٹھے باتیں اور ہنسی مذاق کرتے بھی دیکھا ہے۔

میں نے شیخ نذیر سے کہا کہ اس واردات میں گھر بھیدی لازماً اور یقیناً شامل ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی نوکرانی اتنی چالاک اور مجرمانہ ذہن کی نہیں تو محلے کی کوئی عورت ہوگی جس کے سامنے بھی زیورات والا ٹرنک کھولا گیا ہوگا اور اس عورت نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ٹرنک کہاں رکھا جاتا ہے۔

''میں آپ کو یہ بھی بتا دوں ملک صاحب!''—— شیخ نذیر نے کہا—— ''جو ٹرنک گیا ہے وہ بہت ہی پرانا، خستہ حالت میں تھا اور اس کا رنگ بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ یہ میں نے خود عورتوں سے کہا تھا کہ زیورات اس میں رکھا کریں۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ کسی بھی وقت ڈکیتی یا نقب زنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکو دیکھیں گے کہ یہ تو بڑا پرانا ٹوٹا پھوٹا ٹرنک ہے، اس میں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ملزم اچھی قسم کے ٹرنک اٹھا لے جائیں گے لیکن دیکھیں کہ ایک ہی ٹرنک گیا اور وہ وہی پرانا ٹوٹا پھوٹا ٹرنک تھا''۔

اس نے عورتوں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھایا اور مجھے بلایا۔ میں نے دیکھا کہ ایک تو اس کی بیوی تھی، دو بیٹیاں اور ایک بہو تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ واردات گھر بھیدی نے کروائی ہے اور وہ سوچ کر اور یاد کر کے بتائیں کہ کسی عورت کو یہ معلوم ہوگا کہ زیورات اس ٹرنک میں رکھے ہیں۔ میں نے ان سے نوکرانی کے متعلق بھی پوچھا لیکن شیخ نذیر کی طرح انہوں نے بھی نوکرانی کو سیدھی سادی اور بے ضرر عورت کہا۔ انہوں نے نوکرانی کی بیٹی کا بھی ذکر کیا لیکن یاد کرنے کے باوجود ان میں سے کسی کو بھی یاد نہ آیا کہ اس لڑکی نے کبھی اس ٹرنک میں زیور رکھتے دیکھ لیا ہو۔

یہ چاروں عورتیں سوچتی رہیں، یاد کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی یاد نہ آیا۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ انہیں کسی پر شک تو ہوگا۔ انہوں نے کسی پر بھی شک کا اظہار نہ کیا۔

میں نے نقب کو بڑی غور سے دیکھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ نقب زن کوئی تجربہ کار آدمی ہے۔ میں نے بتایا کہ ہر جرائم پیشہ شخص نقب زنی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خاص قسم کے ملزموں کا کام تھا۔ مطلب یہ کہ ملزم اناڑی یا ناتجربہ کار نہیں تھا۔ میں ان عورتوں سے فارغ ہوا تو کھوجی نے مجھے بتایا کہ تین آدمی تھے۔ تینوں کے الگ الگ کھرے بڑے صاف پائے گئے ہیں اور یہ اتنے صاف ہیں کہ ان کے مولڈ تیار کئے جا سکتے ہیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ کھروں کے مولڈ تیار کرنے کا بندوبست کرے۔ کھوجی نے بھی کچھ دور جا کر دیکھنا تھا کہ یہ کھرے کس طرف گئے ہیں۔

تفتیش کی تفصیلات بڑی لمبی ہوا کرتی ہیں جو پوری کی پوری تحریر نہیں کی جا سکتیں، میں نہایت اہم اور ضروری باتیں سنا رہا ہوں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض اوقات کہانی سناتے کوئی ایسی بات آ جاتی ہے جس کی پوری بیک گراؤنڈ نہ سناؤ تو یوں پتہ چلتا ہے جیسے یہ ایک افسانہ گھڑ لیا گیا ہے یا یہ بات کہانی کو مزید دلچسپ بنانے کے لئے پیدا کر لی گئی ہے۔ میری کہانی میں آپ کوئی ایسی بات دیکھیں تو یہ نہ سمجھیں کہ یہ اتفاقیہ پیدا ہو گئی یا میں نے خواہ مخواہ پیدا کر لی ہے۔ اس کے پیچھے بعض دفعہ تو دو دو تین تین دنوں کی تفتیش اور پوچھ گچھ ہو چکی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ جو تفتیش سنا رہا ہوں، اس بار آپ دیکھیں گے کہ میں نے واردات والے گھر کے افراد پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی تھی۔ اس کا مجھے اچانک خیال نہیں آیا تھا بلکہ اس کے پیچھے کئی مخبروں کی رپورٹیں تھیں اور کچھ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا اور کچھ میں نے اپنے دماغ سے سوچا تھا۔

واردات والے گھر میں جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھا اور جس کسی سے جو ضروری باتیں پوچھنی تھیں وہ پوچھیں۔ ٹرنک جو چلا گیا تھا اس کا رنگ، سائز اور ساخت وغیرہ معلوم کی اور یہ بھی لکھا کہ اس ٹرنک میں کیا کچھ تھا جو ڈاکو لے گئے ہیں۔ ایک تو زیورات تھے، نقد رقم بھی تھی جو آج کے حساب سے کم و بیش دو لاکھ روپیہ بنتی تھی اور بڑے قیمتی کپڑے تھے جس میں کچھ سلے ہوئے اور کچھ ان سلے تھے۔

''شیخ صاحب!''—— میں نے شیخ نذیر سے کہا—— ''اب تک آپ میرے لئے جو مخبری کرتے رہے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے کام آتی تھی، اب آپ خود ایک واردات کا

شکار ہو گئے ہیں، دن رات ایک کر کے ٹوہ لگائیں اور میری مدد کریں۔ اللہ آپ کا مال واپس دلا دے''۔

کھوجی اپنے کام پر دور نکل گیا تھا۔ میں تھانے چلا گیا۔ اس تھانے میں میرے ساتھ ایک جونیئر سب انسپکٹر بھی تھا اور ایک اے ایس آئی تھا۔ میں نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر واردات کی تفصیلات بتائیں اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا بتایا اور انہیں کہا کہ وہ علاقے کے نقب زنوں کو بلائیں اور ان سے تفتیش کریں۔ ایسی ضرورت نہیں تھی کہ میں انہیں تفصیلی ہدایات دیتا اور ان کی ڈائریکشن کرتا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ تھانے میں ریکارڈ موجود تھا جس میں نقب زنوں کے نام الگ، ڈاکوؤں کے الگ اور رہزنوں کے الگ لکھے ہوئے تھے اور ان میں جو سزا یافتہ تھے ان کی ہسٹری بھی موجود تھی۔ میرے ان دو معاون افسروں نے مخبروں اور دیگر ذرائع کو استعمال کر کے معلوم کرنا تھا کہ واردات کی رات کون کہاں تھا مگر پیشہ ور مجرموں سے تفتیش کرنے میں ایک مشکل یہ پیش آتی تھی کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف مخبری نہیں کرتے تھے۔ کسی کو کسی کی واردات کا علم ہو بھی جائے تو وہ اس راز کو ہضم کر لیتا تھا۔ میں تشدد اور ایذا رسانی کا قائل نہیں تھا لیکن پیشہ ور مجرموں پر ہم ہر طریقہ آزمایا کرتے تھے۔ ان وقتوں کے پیشہ ور ڈاکوؤں وغیرہ نے انتہائی تشدد برداشت کرنے کی پریکٹس کی ہوئی ہوتی تھی۔ ان میں بعض تو بڑے مضبوط پتھر ہوتے تھے جو ہتھوڑے کی ضربوں سے بھی نہیں ٹوٹتے تھے۔ پھر بھی ہم لوگ ان سے اپنے کام کی باتیں اگلوا ہی لیا کرتے تھے۔

تفتیش کو میں نے دو لائنوں پر ڈال دیا۔ ایک تو یہ لائن تھی جو بتا چکا ہوں اور دوسری لائن کا تعلق شیخ نذیر اور اس کے اہل خانہ سے تھا۔ یہ لائن میں نے اس لئے اختیار کی کہ شیخ نذیر خود مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا بلکہ اس کی شخصیت اور معاشرتی زندگی کی بنیاد ہی فریب کاری اور جھوٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی بیوی، بیٹیوں اور بہو کو بڑی غور سے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں ایسی دو وارداتیں دیکھ چکا تھا جو گھر کے ہی کسی فرد نے خود ہی کروائی تھیں۔ ایسی کچھ وارداتیں دوسرے پولیس افسروں سے سنی بھی تھیں۔

بہو کسی اور کو چاہتی تھی

اس سے پہلے شیخ نذیر میرے پاس آ کر لوگوں کے گھروں کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ یہ

سب چغل خوری اور غیبت ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔ پولیس اس قسم کے لوگوں سے اچھا خاصا فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔ شیخ نذیر جیسے لوگ تھانیداروں کی آنکھیں اور کان ہوتے ہیں۔ تھانیدار تھانے میں بیٹھے بیٹھے لوگوں کے گھروں میں جھانک سکتے ہیں اور ان کی سرگوشیاں بھی سن لیتے ہیں۔

شیخ نذیر قصبے کے معززین میں شمار ہوتا تھا۔ میں نے ذہن میں یہ بات محفوظ رکھی ہوئی تھی کہ یہ شخص عموماً شہر یا اپنے محلے کے کس کس معزز فرد کے خلاف چغلیاں کیا کرتا ہے۔ اب میں نے ان معززین کو بلا رکھا تھا اور ان کے علاوہ کچھ اور مخبر بھی تھے۔ یہ رپورٹیں آپ کو سنانے کے دوران یہ پابندی نہیں رکھوں گا کہ کون سی بات مجھے کس وقت اور کس دن معلوم ہوئی۔ تمام مخبروں کی رپورٹوں کی ایک رپورٹ بنا کر آپ کو سناتا ہوں۔

اس سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیں کہ واردات والے دن کے پچھلے پہر کھوجی نے مجھے تھانے آ کر بتایا تھا کہ جائے واردات پر جو کھرے پائے گئے تھے وہ کھیتوں میں دو چار جگہوں پر بھی نظر آئے تھے اور ریلوے لائن تک چلے گئے تھے۔ اس سے آگے یہ کھرے نہیں ملے۔ میں سمجھ گیا کہ ملزم ریلوے لائن کے اندر چلے گئے ہوں گے۔ اس رپورٹ سے مجھے اتنا پتہ چل گیا کہ ملزم واردات کر کے کس طرف گئے تھے۔ ریلوے لائن قصبے سے کوئی زیادہ دور نہیں تھی۔ گھوم کر یہ لائن قصبے میں آتی تھی جہاں ریلوے سٹیشن تھا۔

شیخ نذیر کے گھر کی رپورٹیں ملنے لگیں تو میرا ذہن روشن ہوتا چلا گیا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ ملزم گھر میں ہی موجود ہے۔ مجھے کچھ مزہ سا صرف اس لئے آ رہا تھا کہ شیخ نذیر دوسروں کی چغلیاں کر کے یہ تاثر دیا کرتا تھا کہ اس کا اپنا گھرانہ صحیح معنوں میں عزت دار اور پروقار ہے لیکن مخبر کوئی اور ہی نقشہ پیش کر رہے تھے۔

یہ رپورٹیں لیتے وقت مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں لیکن میری اس وقت کیفیت ویسی ہی تھی جیسے ڈوبنے والے کی ہوا کرتی ہے اور وہ ہر طرف ہاتھ مارتا ہے کہ شاید کوئی چیز ہاتھ آ جائے جو ڈوبنے سے بچا لے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ میں اپنے ذہن میں آئے ہوئے ایک دو شکوک صاف یا مزید پختہ کرنے کی کوشش میں تھا۔

شیخ نذیر کی دو جوان بیٹیاں تھیں اور دونوں شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی تھیں۔ بیٹا ایک ہی تھا۔ میں نے اوپر شیخ نذیر کی جس بہو کا ذکر کیا ہے وہ اسی بیٹے کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کو ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اس بیٹے کا اصل نام جو کچھ بھی تھا، وہ الگ رکھیں، میں اسے قدیر

لکھوں گا۔

شیخ نذیر کا منڈی میں اپنا کچھ کاروبار بھی تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ کاروبار میں بھی فراڈ چلاتا ہوگا اور خوب ڈنڈی مارتا ہوگا۔ اصل میں اس کا کاروبار وہی تھا جو میں پہلے سنا چکا ہوں یعنی فراڈ۔ شیخ نذیر نے بہت دولت کمائی تھی۔ میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا۔ اس کے گھر کے اندر جا کر اندازہ ہوا کہ یہ ایک امیر کبیر آدمی کا گھر ہے۔ قدیر چونکہ دو بیٹیوں میں اکیلا بیٹا تھا اس لئے ماں باپ نے اسے بگاڑ کر رکھا ہوا تھا۔ بیٹوں میں اکلوتے بیٹے عموماً بگڑے ہوئے ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ عقل مند اور کام کاج کرنے والے بھی ہوتے ہیں، ان میں بگاڑ صرف یہ ہوتا ہے کہ فضول پیسہ اڑاتے اور عیش وعشرت کرتے ہیں۔ قدیر ان بیٹوں میں سے تھا جن میں عقل کی بھی کمی تھی اور کاروبار یا کمائی کرنے کا ذرا سا بھی شوق اور شعور نہیں تھا۔ تقریباً ہر مخبر نے بتایا کہ اسے بنا بنایا مال مل گیا تھا جس پر وہ شہزادہ بنا ہوا تھا۔

قدیر کی شخصیت، کریکٹر ور لوگوں میں عام رویہ اور برتاؤ ایسا تھا جسے زیادہ تر مخبروں نے فضول اور اوچھا کہا۔ لوگوں کی رائے کتنی ہی بری کیوں نہ تھی قدیر اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا تھا۔ میں اس کی زیادہ تشریح کیا کروں، اتنا کہنا ہی کافی ہونا چاہئے کہ وہ آج کل کی پنجابی فلموں کا ہیرو تھا۔ جوا کھیلتا تھا، شراب پیتا تھا اور بڑھکیں مارتا تھا۔ کام کاج کم ہی کرتا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اور اس کی یاری دوستی ایک دو جرائم پیشہ افراد کے ساتھ بھی تھی اور قصبے کے ایک دو بدمعاشوں کے ساتھ بھی جو دراصل جرائم پیشہ نہیں ہوتے بلکہ صرف بدمعاشی کرتے ہیں اور کرائے کی غنڈہ گردی بھی کر گزرتے ہیں۔

قدیر کی شادی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں جو رپورٹیں ملیں، وہ سب ایک جیسی تھیں اور ان رپورٹوں نے میرے ذہن میں آئے ہوئے شکوک کچھ پختہ کر دیئے۔ قدیر کی بیوی کو میں تاج لکھوں گا۔ یہ لڑکی جس گھرانے کی تھی وہ کوئی زیادہ شریف گھرانہ بھی نہیں تھا لیکن بدنام بھی نہیں تھا۔ اس گھر کا ہر فرد ملنسار تھا اور کسی کو اس گھرانے کے کسی بھی فرد سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ لوگ رکھ رکھاؤ والے اور دوسروں کی عزت کرنے والے تھے اور اسی وجہ سے ان کی بھی عزت قائم تھی۔ تاج کا بڑا بھائی ذرا بدمعاش قسم کا آدمی تھا لیکن مخبروں کی رپورٹوں کے مطابق، وہ اوچھا اور ہر کسی کے گلے پڑنے والا آدمی نہیں تھا۔ مجھے بدمعاش کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا، میرا مطلب یہ نہیں کہ اس شخص کو میں گھٹیا صورت میں پیش کروں، مطلب یہ ہے کہ بوقت ضرورت بدمعاشی کر لیتا تھا اور اپنا سر جائز حد تک

اونچا رکھتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ جوا کھیلتا تھا لیکن گھٹیا قسم کے لوگوں کے ساتھ نہیں جیسا کہ لوگ قبرستانوں کے تکیوں پر جا کر جوا کھیلا کرتے ہیں۔ تاج کے اس بھائی کو میں رحمان لکھوں گا۔

رحمان اور شیخ نذیر کے بیٹے قدیر کا موازانہ میں اس طرح کرتا ہوں کہ رحمان کا دوسروں پر رعب اور دبدبہ تھا لیکن اس کی لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں لوگ قدیر سے ڈرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اس کے ساتھ واسطہ نہ ہی پڑے تو اچھا ہے۔ اس کی میں اس طرح وضاحت کرتا ہوں کہ لوگ کتے سے ڈرتے ہیں اور ایک طرف ہو جاتے ہیں کہ کاٹ نہ کھائے۔ یہ مثال قدیر کی تھی۔ لوگ تندرست وتوانا اچھی نسل کے گھوڑے سے بھی ڈرتے ہیں کہ اس پر سوار ہے تو یہ گرا نہ دے لیکن لوگ اس گھوڑے سے اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح کتے سے ڈرتے ہیں۔ گھوڑے کو لوگ اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ تھا فرق قدیر اور رحمان میں۔

شیخ نذیر نے قدیر کے لئے دو گھروں سے رشتہ مانگا تھا اور دونوں گھروں نے کسی نہ کسی بہانے معذرت کر لی تھی۔ وہ عزت دار گھرانے تھے۔ یہ تو جانتے تھے کہ شیخ نذیر کے گھر میں دولت ہے لیکن وہ لوگ عزت کو ترجیح دیتے تھے۔ تاج اور رحمان کے باپ نے تاج کا رشتہ قدیر کو دے دیا۔ اس میں رحمان راضی نہیں تھا لیکن باپ کی عزت کا خیال کرتے ہوئے وہ چپ رہا۔

اس طرح تاج جو ایک خوبصورت اور سلیقہ شعار لڑکی تھی، شیخ نذیر کے گھر آ گئی۔ کچھ دنوں بعد تاج کو پتہ چل گیا کہ وہ غلط گھر میں آ گئی ہے اور ایک ایسے آدمی کی بیوی بنا دی گئی ہے جو بڑا ہی گھٹیا اور اوچھا ہے۔ رات الگ اور بند کمرے میں قدیر اور تاج کے درمیان کیا باتیں ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ دونوں کا رویہ کیا تھا، یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا، البتہ یہ بات کھل کر محلے میں نکل آئی کہ تاج اس گھر میں اور اس خاوند کے ساتھ ذرا سی بھی خوش نہیں۔ رحمان تاج سے ملنے جایا کرتا تھا لیکن اس نے وہاں جانا بہت ہی کم کر دیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ رحمان کے ساتھ قدیر کا سلوک اچھا نہیں تھا اور غالباً ایک آدھی مرتبہ قدیر نے رحمان کے ساتھ کچھ بدتمیزی بھی کی تھی۔

پولیس کے جو مخبر ہوا کرتے تھے ان کی بیویاں ان کی مخبر ہوا کرتی تھیں۔ ان میں جو عقل مند اور چالاک ہوشیار تھیں، وہ ہمدردی اور چاپلوسی کا ہر حربہ استعمال کر کے دوسری

عورتوں کے سینے کے اندر کے راز بھی نکال لاتی تھیں اور اپنے خاوندوں کو بتا کر تھانے تک پہنچا دیتی تھیں۔ ان عورتوں کے ذریعے مخبروں کو یہ راز معلوم ہوا کہ تاج ایک تو اس وجہ سے قدیر کو پسند نہیں کرتی تھی جو میں نے بیان کی ہے لیکن اصل اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ تاج ایک اور لڑکے کو چاہتی تھی اور اس نے اسی لڑکے کے ساتھ شادی کا عہد کر رکھا تھا۔ یہاں تک پتہ چلا کہ رحمان بھی اسی نوجوان کو پسند کرتا تھا لیکن اس نوجوان کا خاندان شیخ نذیر کے خاندان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ خاندان تھا تو متوسط طبقے کا لیکن شیخ نذیر کے مقابلے میں اسے غریب خاندان ہی کہوں گا۔

بوڑھی نوکرانی کی جوان بیٹی

شیخ نذیر کی بیٹیوں کے متعلق مخبروں کی رپورٹیں کوئی اچھی نہیں تھیں۔ ان کے رشتے طے ہو چکے تھے لیکن کچھ ایسی وجوہات تھیں کہ شادیاں تھوڑے عرصے بعد ہونی تھیں۔ ان دونوں لڑکیوں کے متعلق جو رپورٹ مجھ تک پہنچی اسے میں صرف ان الفاظ میں سمیٹ سکتا ہوں کہ شوباز تھیں اور اپنی نمائش کچھ زیادہ ہی کرتی تھیں۔ میں نے تقریباً ہر معزز اور عام مخبر سے یہ ضرور پوچھا تھا کہ ان دونوں لڑکیوں کا چال چلن کیسا ہے اور کیا ان دونوں کا یا کسی ایک کا کہیں عشق و محبت کا چکر چل رہا ہے؟...... میرے ان سوالوں کے جواب میں مخبروں نے ذرا مختلف رپورٹیں دی تھیں۔ کسی کو یہ یقین نہیں تھا کہ ان لڑکیوں کی یا ان میں سے کسی ایک کی کسی اور آدمی کے ساتھ محبت تھی، تین چار مخبروں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس خاندان میں پاکیزہ محبت کا شاید رواج ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ لڑکیاں چاہتی تھیں تو وہ ناجائز تعلقات ہی ہو سکتے تھے۔ میں دراصل معلوم یہ کرنے کی کوشش میں تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان دونوں میں سے کسی ایک بیٹی کو ماں باپ زبردستی کسی کے ساتھ بیاہ رہے ہوں اور وہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو تو اس لڑکی نے ماں باپ سے یوں انتقام لیا کہ اپنے چاہنے والے سے یہ واردات کروائی اور اب اس لڑکی نے گھر سے بھاگ جانا تھا اور لوٹے ہوئے مال سے ہندوستان کے کسی اور شہر میں جا کر نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ مجھے ایسا کوئی جواب نہ ملا جو میرے اس شک کی تائید کرتا۔

یہ میرے لئے کوئی نئی اور حیران کن خبر نہیں تھی کہ ان لڑکیوں کے ساتھ صاف ستھری محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی، اگر تھی تو وہ ناجائز تعلقات تھے۔ دونوں لڑکیاں شوباز اور گھٹیا ذہن

کی تھیں اور یہ بھی میرے لئے اچنبھے والی بات نہیں تھی۔ جیسا باپ تھا ویسے ہی بیٹیوں کو ہونا چاہئے تھا اور پھر حرام کی کمائی کی لعنت ایسی ہے کہ جس گھر میں حرام کی کمائی جائے گی اس گھر کی اولاد کا کردار حلالیوں جیسا ہو ہی نہیں سکتا۔ قدیر اور اس کی بہنوں کے کردار کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسا ان کا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ شیخ نذیر کے لٹ جانے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا کیونکہ یہ سارا مال تھا ہی لوٹ مار کا۔ ایک تو بیٹا اڑا رہا تھا اور پھر قدرت نے ایسا ہاتھ مارا کہ اتنی زیادہ مالیت کا زیور اور نقد رقم نکل گئی۔

مجھے سب سے پہلے شیخ نذیر کی نوکرانی اور اس کی جوان بیٹی کو شامل تفتیش کرنا چاہئے تھا لیکن کچھ سوچ کر ان دونوں کو مشتبوں کی فہرست میں کچھ نیچے کر دیا تھا۔ ان پر مجھے گھر بھیدی ہونے کا شک تھا۔ اب شیخ نذیر کی بہو تاج کے متعلق یہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے اس نوکرانی اور اس کی جوان بیٹی کی ضرورت محسوس کی۔ میرے ذہن سے ابھی یہ شک نہیں نکلا تھا کہ یہ واردات گھر کے ہی کسی فرد نے کروائی ہے یا گھر بھیدی کا رول ادا کیا ہے۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ میں نے تین مخبروں سے اس نوکرانی اور اس کی بیٹی کے متعلق پوچھا تھا۔ تینوں نے متفقہ طور کہا تھا کہ بہت ہی غریب اور دیانتدار عورت ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو بیاہنے کے لئے محنت مزدوری کر رہی تھی۔ بیٹی کے متعلق بھی کوئی ایسی ویسی رپورٹ نہ ملی البتہ یہ پتہ چلا کہ عقل اور ہوش والی لڑکی ہے اور اس کے چال چلن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ غریب کی بیٹی جوان ہو اور جال پھینکنے والے اس پر جال نہ پھینکیں۔ غریب کی بیٹی کا ہر کوئی عاشق بن جایا کرتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ لڑکی صرف جوان تھی، کسی پہلو خوبصورت نہیں تھی اور اس کا رنگ سانولا تھا۔ ملنسار اور خوش طبع تھی۔

میں نے اس ماں بیٹی کو تھانے بلوا لیا۔

اس کے بعد نوکرانی اور اس کی بیٹی تھانے میں آ گئی۔ میں نے دونوں کو اکٹھے اندر بلا لیا اور بٹھا کر تسلی دی کہ وہ ڈریں نہیں، ان سے دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی تو کچھ حوصلے میں تھی لیکن اس کی ماں تو جیسے لاش ہی بن گئی تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور چہرہ بالکل ہی دبلا پتلا جس کی ہڈیاں باہر نظر آ رہی تھیں۔ وہ بار بار میرے آگے ہاتھ جوڑتی تھی اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ جب ہاتھ جوڑتی تھی تو اس کے ہاتھ کانپتے نظر آتے تھے۔ میں نے ماں اور بیٹی کو اپنی خصوصی نظر سے دیکھا۔ ان کے چہروں پر مجھے مجرمانہ ذہنیت کی ہلکی سی بھی جھلک نظر نہ آئی۔ میں نے بیٹی کو باہر بھیج دیا۔ بیٹی باہر نکلی تو

ماں پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہوگئی۔ میں نے اسے بڑی مشکل بہلایا پھسلایا۔

میں اس سے شیخ نذیر کے گھر کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے ہاتھ جوڑ دیتی تھی۔ آخر اس نے بتایا کہ وہ اس لئے ڈرتی ہے کہ اس نوکری سے محروم کر دیا جائے گا اور شیخ نذیر کو پتہ چلا کہ اس نے اندر کی کچھ باتیں بتائی ہیں تو شیخ نذیر اسے مار بیٹھے گا اور اس کی بیٹی کے ساتھ نہ جانے کیسا گرا ہوا سلوک کرے۔ میں نے اسے تسلیاں دلاسے دیئے۔ کچھ ہمدردی اور اپنائیت کے رنگ میں باتیں کیں اور آخر تھوڑا سا ڈرایا اور دھمکایا بھی۔ اسے یقین دلایا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اس نے مجھے کچھ بتایا ہے۔

آخر وہ بولنے پر آگئی اور یوں بولی کہ وہ بہت کچھ دیکھتی رہی لیکن اس طرح لاتعلق اور انجان بنی رہی جیسے اسے کچھ نظر نہیں آتا اور کچھ سنائی بھی نہیں دیتا۔ شیخ نذیر کی بیٹیوں کے متعلق اس نے کوئی اچھی بات نہ کی۔ اس نے مخبروں کی اس رپورٹ کی تصدیق کی یہ دونوں لڑکیاں کسی کے ساتھ محبت نہیں کرتی تھیں نہ ہی پاکیزہ محبت کو مانتی تھیں۔ ان کے ہاں دوستی کا مطلب کچھ اور تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ان کے دوست کون کون تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی ایک کا نام نہیں لے سکتی کیونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں۔

اس نوکرانی نے تاج کے متعلق ایک انکشاف کیا۔ انکشاف یہ تھا کہ تاج اسلم نام کے ایک جوان سے آدمی کو بری طرح چاہتی تھی اور اس کا ارادہ اسلم کے ساتھ ہی شادی کرنے کا تھا لیکن تاج کے ماں باپ نے اسے قدیر کے ساتھ بیاہ دیا۔

''مجھے یہ بتاؤ'' —— میں نے پوچھا —— ''کیا شادی کے بعد بھی تاج اسلم سے ملتی ملاتی تھی؟''

نوکرانی نے وثوق اور اعتماد کے لہجے میں بتایا کہ تاج اسلم سے ملتی ہے اوراس نے کئی بار دیکھا ہے کہ اسلم گلی میں سے گزرتا ہے تو تاج چھت پر چلی جاتی ہے اور منڈیر سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ نوکرانی نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ شیخ نذیر کے گھر کے قریب آکر اسلم کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔

نوکرانی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاج اپنے ماں باپ کے گھر جاتی ہے تو کہیں نہ کہیں اسلم سے ملتی ہے۔ میں نے نوکرانی سے پوچھا کہ قدیر کے ساتھ تاج کس طرح رہتی ہے۔ نوکرانی نے بڑے صاف الفاظ میں کہا کہ ان دونوں کی آپس میں بنتی ہی نہیں۔ تاج جب

چاہتی ہے اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاتی ہے اور جتنے دن چاہے رہتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ قدیر اور تاج آپس میں کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ قدیر کی ماں اور بہنیں اس طرح بیچ بچاؤ کراتی ہیں کہ قدیر کی طرفداری کرتی ہیں اور تاج کو برا بھلا کہتی ہیں۔

میں اس غریب اور بوڑھی نوکرانی کی حوصلہ افزائی کرتا چلا گیا اور ایسی اپنائیت کا اظہار بھی کیا کہ وہ پوری طرح میرے زیر اثر آگئی۔ میرے ذہن میں ایک شک تھا۔ میں اس کے مطابق بات کر رہا تھا اور اس کی سن رہا تھا اور اسے لقمے بھی دیتا چلا جا رہا تھا۔ اس نوکرانی کے ساتھ میری گفتگو اور پوچھ گچھ کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی تھی۔ یہ سب سنانا محض بے کار ہے۔ صرف کام کی باتیں بتاؤں گا۔ نوکرانی کی زبانی معلوم ہوا کہ قدیر کی ماں اور بہنیں تاج کو طنزیہ انداز میں یہ تاثر دیا کرتی تھیں کہ غریب گھرانے کی لڑکی ہے اور وہ خود بہت ہی امیر کبیر لوگ ہیں۔ میں نے نوکرانی سے بطور نمونہ کچھ باتیں پوچھیں۔

نوکرانی نے بتایا کہ قدیر کی ماں اکثر تاج سے کہا کرتی تھی کہ تمہارے پورے خاندان کو بمعہ مکان ہم خرید سکتے ہیں۔ قدیر بھی تاج پر اپنی امیری کا رعب جماتا رہتا تھا۔ نوکرانی نے ایک اور ایک بات یوں سنائی کہ تاج کو قدیر کی ماں نے اس قسم کی طنزیہ باتیں کہیں اور ماں باہر نکل گئی۔ تاج اپنے کمرے میں تھی اور نوکرانی اس وقت اس کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ قدیر کی ماں طنزیہ واہی تباہی بک کر چلی گئی تو تاج کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نوکرانی نے تاج کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ خدا انصاف کرے گا۔

اس روز تاج بہت روئی اور نوکرانی اسے بہلاتی رہی۔ تاج نے کہا کہ میرا بس چلے تو میں اس گھر آگ لگا دوں اور ان کا کچھ نہ چھوڑوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ خدا نہ جانے کب انصاف کرے گا۔ ان کے ساتھ تو کسی روز میں ہی انصاف کروں گی۔

نوکرانی نے اس قسم کی دو تین اور باتیں بتائیں جو تاج نے غصے کی حالت میں انتقام کے لب و لہجے میں کہی تھیں۔ ان باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ تاج اس گھر میں سخت تنگ اور پریشان تھی بلکہ یوں کہہ لیں کہ اذیت میں مبتلا تھی اور ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کے منہ سے یہی ایک بددعا نکلتی تھی کہ یہ لوگ تباہ ہو جائیں تو انہیں پتہ چلے غربت کیا ہوتی ہے۔

نوکرانی نے مجھ پر واضح کر دیا کہ تاج اس گھر کی تباہی چاہتی تھی۔ نوکرانی کی موجودگی

میں اس کی بیٹی کو اندر بلایا اور نوکرانی سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو بتا دے کہ ڈرے بالکل نہیں اور جس طرح اس نے خود ہر بات بتائی ہے اسی طرح اس کی بیٹی بھی مجھ سے کچھ نہ چھپائے۔ نوکرانی نے اپنی بیٹی کی حوصلہ افزائی کی اور اسے کہا کہ تھانے دار صاحب بہت اچھے اور پیار والے آدمی ہیں اس لئے ان سے کوئی پردہ نہ رکھنا اور یہ ہمارا پردہ رکھیں گے...... میں نے نوکرانی کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ اپنی بیٹی کی طرف سے بالکل مطمئن رہے۔

''تھانے دار صاحب جی!''— اس لڑکی نے کہا— ''میں یتیم لڑکی ہوں اور ماں صرف میرے فرض سے فارغ ہونے کے لئے اس گھر میں نوکری کر رہی ہے۔ یہ مجھے نوکری نہیں کرنے دیتی۔ میں جو جانتی ہوں اور جو دیکھتی ہوں، وہ بالکل سچ بتا دوں گی لیکن آپ ہم غریبوں کا خیال رکھنا ورنہ یہ دھن دولت والے ہمیں پیس کر باہر کھیتوں میں پھینک دیں گے''۔

میں نے اسے اسی طرح تسلی دی اور اسے یقین دلایا جس طرح اس ماں کو دلایا تھا اور کہا کہ وہ بے فکر اور بے غم رہے...... میں نے سب سے پہلے تاج کے متعلق ایک بات کی۔

''صاحب جی!''— اس لڑکی نے کہا— ''میں تاج بی بی کی ہر بات بتا دوں گی لیکن ایک بات دل پر لکھ لیں کہ تاج بہت اچھی بی بی ہے اور اس پر اس گھر میں بہت ظلم ہو رہا ہے۔ میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں کروں گی اور چھپاؤں گی بھی کچھ نہیں''۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ لڑکی کسی پہلو خوبصورت نہیں تھی اور اس کا رنگ سانولا تھا اور چہرے پر غربت کا تاثر تھا لیکن یقین جانیں کہ مجھے یہ لڑکی اچھی لگی۔ شاید اس لئے کہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرتی تھی۔ میں نے اس میں کوئی چالاکی اور ہیرا پھیری نہ دیکھی۔

اس نے بتایا کہ وہ تاج کی بہت حد تک راز دار تھی لیکن اس کے پاس صرف اس وقت بیٹھتی تھی جب اس کی ساس اور نندیں گھر میں نہیں ہوتی تھیں یا دو پہر کے وقت کمروں میں کچھ دیر کے لئے سو جاتی تھیں۔ تاج اس لڑکی کی زبانی اسلم کو پیغام بھیجا کرتی تھی۔ یہ کوئی دہشت گردی یا تخریب کاری کے پیغام نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ یہ اگلی ملاقات کے وقت اور جگہ کے متعلق ہوتے تھے۔ نوکرانی کی اس بیٹی نے یہ بھی بتایا کہ تاج نے دو تین مرتبہ اس قسم کی بات کہی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں ڈاکے پڑتے ہیں اور چوریاں بھی ہوتی ہیں لیکن اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہوتا جس میں ساری دولت اور سارا مال اسباب حرام کا ہے۔

لڑکی نے بتایا کہ ایک بار تاج نے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس علاقے میں اتنے زبردست اور مشہور ڈاکو ہیں لیکن کوئی اس گھر کی طرف نہیں دیکھتا۔ مجھے کسی ڈاکو کا اتا پتہ اور ٹھکانا معلوم ہو جائے تو میں اسے کہوں کہ آؤ اس گھر میں بڑا مال ہے۔

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ لڑکی اتنی بھی عقل مند نہیں تھی کہ اپنے آپ ہی میرے مطلب کی باتیں کہہ رہی تھی بلکہ یہ میری عقل تھی جو اس سے یہ باتیں اگلوا رہی تھی۔ میں سوال ہی ایسے پوچھتا تھا جو میرے کام کے ہوتے تھے اور میں ایسے انداز سے پوچھتا تھا کہ اس لڑکی کو شک تک نہیں ہوتا تھا کہ میں اس سے بھید لے رہا ہوں۔ میں آپ کو بطور نمونہ بھی نہیں بتانا چاہتا کہ میرا انداز کیا تھا کیونکہ اس طرح بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلم کی اور تاج کے بھائی رحمان کی خاصی گہری دوستی تھی۔ یہ اسے تاج نے بتایا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ رحمان اور اسلم گہرے دوست ہیں۔ یہ لڑکی بھی تو گھر بھیدی ہو سکتی تھی۔ مجھے ابھی یہ شک بھی رفع یا مزید پختہ کرنا تھا۔ اسے ابھی میں نے ملتوی کر دیا۔

چاقو، چوہدری اور چوری

یہ لڑکی میرے ذہن میں کچھ اور ہی شکوک پیدا کر گئی تھی۔ میرے لئے اسلم کو شامل تفتیش کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میرا جونیئر سب انسپکٹر اور اے ایس آئی جرائم پیشہ افراد سے تفتیش میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ ان افراد سے پوچھ گچھ اور تفتیش کا طریقہ کچھ اور ہی تھا۔ تھانے میں رات کے دوران چیخ و پکار سنائی دیتی رہتی تھی لیکن ابھی تک انہیں کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ان مشتبہوں میں ایک بڑا ماہر نقب زن تھا جو کیدو کے نام سے مشہور تھا۔ اسے ایک نقب زنی میں چار سال سزائے قید ملی تھی۔ اس وقت وہ جوانی کے آغاز کی عمر میں تھا۔ شاید ناتجربہ کاری کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ اس کے دو اڑھائی سال بعد وہ ڈکیتی کی واردات میں پکڑا گیا اور پھر اسے چار سال سزائے قید ملی تھی۔ اب وہ ادھیڑ عمر تھا اور اس کا شمار نامی گرامی ڈاکوؤں میں ہوتا تھا۔

کیدو چونکہ بستہ ب کا رجسٹرڈ بدمعاش تھا اس لئے رات کے وقت گاؤں سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ واردات کی رات وہ گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ اگلے روز اسے تھانے بلا لیا گیا اور پوچھا کہ وہ رات کہاں تھا۔ اس نے بتایا کہ ساری رات پیر

صاحب کے آستانے پر رہا ہے اور پیر صاحب نے اسے کہا تھا کہ وہ رات یہیں گزارے اور عبادت کرتا رہے۔

یہ اس علاقے کا مشہور پیر تھا اور اس گدی کی شہرت دور دور تک تھی۔ میرا جونیئر سب انسپکٹر اس پیر کو تھانے میں بلانا بہت بڑی بے ادبی اور گناہ سمجھتا تھا۔ وہ پیر کے گھر گیا اور اس سے پوچھا کہ فلاں رات کیدو اس کے پاس آیا تھا اور کیا اس نے رات یہیں گزاری تھی؟

''ہاں!'' —— پیر نے جلالی کیفیت میں جواب دیا —— ''ہم جانتے ہیں اس پر پابندی ہے۔ وہ شام کے بعد آیا تھا اور فوراً واپس جانے کی کہہ رہا تھا لیکن ہم نے اسے یہیں روک لیا۔ دو تین مہینے پہلے وہ ہمارے قدموں میں توبہ و تائب کر کے ہمارا مرید ہو گیا اور ہم اسے پکا مومن بنا رہے ہیں۔ ہم نے اس سے نفل پڑھوائے تھے اور پھر ایک ورد بتایا جو ساری رات کرتا رہا تھا اور فجر کی اذان کے وقت ہم نے اسے گاؤں جانے کی اجازت دی تھی۔ اسے اب مشتبہ سمجھنا چھوڑ دو۔ وہ تائب ہو چکا ہے''۔

میرا یہ سب انسپکٹر پیر صاحب سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی تھا۔ میں اپنے اس سب انسپکٹر کے جواب سے کچھ مطمئن نہ ہوا اور اسے کہا کہ پیر کی عظمت اپنی جگہ ہے لیکن قانون کے اور تفتیش کے قواعد و ضوابط کے کچھ اپنے تقاضے ہیں جو اسے پورے کرنے چاہئیں تھے۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ اس نے دو اور افراد سے تصدیق کروالی تھی کہ کیدو نے رات پیر صاحب کے ہاں گزاری تھی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ سب انسپکٹر نے جھوٹ بولا تھا یا وہ سچ کہتا تھا۔

واردات کو پانچ چھ دن گزر گئے تھے اور یہ واردات میرے لئے ایک چیلنج بن گئی تھی۔

میں نے اپنے مخبروں کو بلا کر کہا کہ وہ اسلم نام کے ایک شخص کے بارے میں رپورٹ دیں۔ ایک معزز اور بزرگ قسم کے مخبر نے اور دو عام اور معمولی قسم کے مخبروں نے اسی وقت رپورٹ دے دی۔

رپورٹ یہ تھی کہ اسلم معمولی سے گھرانے کا جواں سال آدمی ہے۔ ایف اے پاس ہے اور ایک ہندو وکیل کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کی ہسٹری یہ بتائی گئی کہ میں جب اس تھانے میں آیا تھا، اس سے دو تین مہینے پہلے اسلم کی ایک آدمی کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اور اسلم نے اسے چاقو مارا تھا۔ اگر لوگ چھڑوا نہ لیتے تو اسلم اس آدمی کو قتل ہی کر دیتا۔ مضروب

اونچے گھرانے کا فرد تھا اور اسلم جیسا جوان تھا۔ وہ تھانے چلا گیا اور اسلم کو گرفتار کر لیا گیا لیکن جس وکیل کے ساتھ وہ کام کرتا تھا اس وکیل نے راضی نامہ کرا دیا۔

اس وقوعہ کے مہینہ بعد اسلم پر چوری کا الزام لگا اور اسے تھانے بلا کر مارا پیٹا گیا کہ وہ الزام قبول کر لے لیکن وہ اقبالی نہ ہوا۔ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس ہندو وکیل نے اسے چھڑوا لیا تھا۔ اس کے بعد اسلم کو لوگ بدمعاش سمجھنے لگے لیکن اس نے کبھی کوئی بدمعاشی والا کام نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد تو میں اس تھانے میں آ گیا تھا۔ میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا کہ اس نام کا کوئی بدمعاش ہے بھی یا نہیں۔ اب اسلم کے متعلق یہ رپورٹ ملی تو میں نے تاج کی ان انتقامی باتوں کو سامنے رکھا جو نوکرانی کی بیٹی نے بتائی تھیں۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلم میں یہ واردات کرنے یا کروانے کی صلاحیت اور جرأت موجود ہے۔ یہ بھی سوچا کہ اس کا تعلق ایک بڑے قابل اور تجربہ کار وکیل کے ساتھ ہے اس لئے اسلم جرائم اور قانون کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی ہو گی۔ یہ تو مجھے خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ خاصا ہوشیار اور جرأت مند آدمی ہے اور اچھے برے کی تمیز کرنے والا ہے...... میں نے اسے تھانے بلوا لیا۔

وہ جب میرے سامنے آیا تو پہلا خیال یہ آیا کہ اسے میں نے قصبے کی کچہری اور پھر پچیس میل دور ضلع کچہری اور سیشن کورٹ میں چند مرتبہ دیکھا ہے۔ میں نے کبھی بھی اسے کسی وکیل کا منشی نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس کا حال حلیہ اور ڈیل ڈول منشیوں والی تھی نہیں۔ نہایت اچھا جسم اور اچھا قد تھا، شکل صورت بھی اچھی تھی۔ لباس امیرانہ تو نہیں تھا لیکن صاف ستھرا قابل عزت لباس پہنتا تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس جواں آدمی کے سراپے میں ایک اچھا تاثر تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر اور انداز میں وہ ڈر یا گھبراہٹ دیکھی ہی نہیں جو ان لوگوں کے چہروں پر آ جاتی ہے جو پہلی بار تھانے میں بلائے جاتے ہیں۔ اس شخص کے چہرے پر خود اعتمادی صاف نظر آ رہی تھی۔

اسلم سے سچی باتیں اگلوانے کے لئے مجھے کوئی زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایک آدمی کو چاقو مارا تھا اور پھر اس پر چوری کا الزام بھی عائد ہوا تھا۔ میں نے صرف اتنی بات نہیں کی تھی، یہ تو آپ کو میں مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔

مجھے توقع تھی کہ وہ جھوٹ بولے گا اور اپنے آپ کو بے گناہ اور مظلوم ثابت کرے گا

لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اس نے بڑے اچھے انداز سے سنا دیا کہ اس نے چاقو کیوں چلایا تھا۔ یہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ میں نے شیخ نذیر کے بیٹے قدیر کا کردار جس طرح پیش کیا ہے ایسے ہی کردار کا ایک آدمی اس قصبے میں رہتا تھا جو اپنے آپ کو ہیرو اور باقی سب کو اپنے مزارعے یا نوکر سمجھتا تھا۔ اس اوچھے شخص نے ایک شریف اور ذرا کمزور گھرانے کی لڑکی کے ساتھ ایک گلی میں چھیڑ خانی کی۔ اسلم ادھر سے گزر رہا تھا۔ وہ اوچھا آدمی لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ اسلم نے اسے روکا تو وہ اسے اپنی توہین سمجھ کر اسلم کو برا بھلا کہنے لگا۔ اسلم کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لڑکی ہے کون۔ وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ لڑکی مسلمان ہے۔

اسلم نے مجھے بتایا کہ وہ اس طرح کی دھمکی برداشت نہیں کر سکتا جس طرح اسے اس آدمی نے دی تھی۔ اس شخص نے اسلم سے کہا تھا کہ یہ تیری چاچی تو نہیں لگتی، میرے سامنے آئے تو میں گردن مروڑ دوں گا۔ اسلم اس کے آگے آ گیا اور اسے کہا کہ تم نے ایک قدم بھی اس لڑکی کے پیچھے اٹھایا تو پھر دیکھنا گردن کس کی مروڑی جاتی ہے۔ وہ شخص اپنے آپ کو نواب یا مہاراجہ سمجھتا تھا۔ اس نے اسلم پر ہاتھ اٹھایا، اسلم نے چاقو نکال لیا اور اس طرح ان کی لڑائی ہوئی۔ لوگوں نے چھڑوا دیا لیکن اس شخص کا خون بہہ رہا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ تو شدید زخمی ہو گیا ہے۔ وہ تھانے چلا گیا۔ مخبر نے مجھے پہلے ہی جو رپورٹ دی تھی اس کی تصدیق اسلم نے کر دی۔

''قبلہ انسپکٹر صاحب!''—— اسلم نے کہا—— ''مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لڑکی کون ہے، میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مسلمان ہے اور کسی شریف گھرانے کی بچی ہے۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے اور اب تو وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ جس کسی کی بیٹی یا بہن کو چاہے چھیڑ سکتا ہے اور ان بڑے لوگوں کے مقابلے میں کوئی آ سکتا ...... میں چھوٹے یعنی مالی لحاظ سے چھوٹے خاندان کا آدمی ہوں لیکن عزت کے لحاظ سے میں بڑا ہی امیر کبیر ہوں۔ خدا کی قسم، لوگ درمیان میں نہ آ جاتے تو شاید میں اس شخص کو قتل ہی کر دیتا''۔

پھر میں نے اسلم سے پوچھا کہ اس پر چوری کا جو الزام لگا تھا، اس کی حقیقت کیا تھی۔

اس نے بتایا کہ یہ بڑے چوہدریوں کا بیٹا تھا اور اسلم نے اسے زخمی کر دیا تھا لیکن اس ہندو وکیل نے تھانے دار سے مل ملا کر معاملہ راضی نامے کی صورت میں رفع دفع کرا لیا تھا۔

اس گھٹیا شہزادے کے باپ نے یہ انتقامی وار کیا کہ چوری کی ایک واردات ہو گئی تو اسلم کو گرفتار کروا دیا اور دو جھوٹے گواہ بھی پیش کر دیئے۔ چوری واقعی ہوئی تھی جس کے متعلق اسلم کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ ان چوہدریوں کا اسلم پر انتقامی وار تھا لیکن اسلم نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ خدا میری حمایت میں تھا۔ میں کبھی تصور میں لایا نہیں کہ میں چوری بھی کروں گا۔ خدا نے میری یوں مدد کی کہ ان دونوں گواہوں کو تھانے میں ہی تھانے دار نے جھوٹا ثابت کر دیا اور مجھے بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیا۔

انہیں اتنا تنگ کرو تمہیں طلاق دے دیں

اسلم پورے اعتماد کے ساتھ بڑے ہی جرأت مندانہ طریقے سے بول رہا تھا۔ مجھے اپنے تجربے کے مطابق اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا تھا نہ اس کے ذہن میں فریب کاری ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسلم کی کبھی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی اور اس پر چوری کا الزام تھا یا یہ شخص مظلوم تھا یا ملزم تھا۔ میری ضرورت تو یہ جاننے کی تھی کہ نقب زنی کی واردات میں یہ شخص ملوث ہے یا نہیں۔ یہ بات میں نے اپنی استادی اور زبان کی ہیرا پھیری سے معلوم کرنی تھی۔ اس نے خود تھوڑے ہی کہہ دینا تھا کہ ہاں یہ واردات میں نے کروائی تھی اور گھر بھیدی کا کام تاج نے کیا تھا۔

اب میں نے اسلم سے تاج کے بارے میں پوچھا اور صاف کہا کہ اسے تاج کے ساتھ محبت ہے اور تاج کی شادی کے بعد بھی وہ اسے ملتا ہے۔

اس نے فوراً تسلیم کر لیا کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس نے کہا کہ تاج کا رشتہ اسے مل سکتا تھا کیونکہ ذات برادری ایک ہی ہے لیکن شیخ نذیر کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تاج کا باپ شیخ نذیر کے جال میں آ گیا تھا اور پتہ چلا ہے کہ اس نے کچھ نقد رقم بھی وصول کی تھی۔ اس طرح اسلم نے ہر وہ بات تسلیم کی جو مجھے مخبروں سے معلوم ہوئی تھی۔

''اسلم بھائی!''—— میں نے مسکراتے ہوئے کہا—— ''اب میں ایسی بات پوچھنے لگا ہوں جو تم صحیح نہیں بتاؤ گے''۔

''صاحب!''—— اسلم نے کہا—— ''یہ الگ بات ہے کہ آپ میری بات سچ مانیں یا مانیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے اس وقت تک آپ کے سامنے کوئی جھوٹ نہیں بولا نہ بولوں گا۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے''۔

"تاج اپنے سسرال میں بہت ہی تنگ ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہاری اس کے ساتھ ملاقاتیں جاری ہیں۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تاج کو وہاں سے آزاد کرالو گے اور پھر اس کے ساتھ شادی کرلو گے؟"

"اسے ہم دونوں کی بیوقوفی کہہ لیں"۔۔۔ اسلم نے جواب دیا۔۔۔ "میں نے تاج سے کہہ رکھا ہے کہ ان لوگوں کو اتنا تنگ کرو کہ یہ تمہیں طلاق دے دیں۔ ابھی تو تاج خود ہی بڑی تنگ اور اذیت میں مبتلا ہے اور یہ لوگ بڑے ہی ڈھیٹ اور بدکردار ہیں۔ ہم ابھی تک کوئی ٹھوس اور کارگر پروگرام نہیں بنا سکے"۔

میں نے اپنی زبان کا سارا جادو چلا ڈالا اور اپنے تجربے کو پوری طرح آزمایا لیکن اسلم اس طرح باتیں کرتا رہا جیسے اس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس واردات کا ذکر آیا تو میں نے اسلم سے افسوس کا اظہار کیا کہ یہ تو گھر بالکل لٹ گیا ہے۔

"اس کا افسوس مجھے بھی ہے"۔۔۔ اسلم نے کہا۔۔۔ "لیکن یہ خیال آتا ہے کہ یہ تو حرام کی کمائی تھی تو مجھے تھوڑی سی خوشی ہوتی ہے، البتہ ایک افسوس آتا ہے کہ تاج کا زیور بھی چوری ہوگیا ہے۔ تاج نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ساس نے اس کا وہ زیور بھی اپنے قبضے میں کرلیا تھا جو تاج کو میکے سے ملا تھا۔ وہ اتنے کم ظرف لوگ ہیں کہ تاج اپنے میکے جانے لگتی تو اس کی ساس اور نندیں بڑے غور سے چیک کیا کرتی تھیں کہ یہ کیا کیا زیور پہن کے جا رہی ہے اور جب وہ واپس آتی تھی تو ساس سب سے پہلے اس کا زیور اتروا کر اپنے قبضے میں کرلیتی تھی۔ تاج تو یہ بھی کہتی ہے کہ یہ لوگ اس کا سارا زیور رکھ لیں اور اس کے عوض اسے آزاد کردیں"۔

یہ تو مجھے یقین تھا کہ اسلم جو باتیں کر چکا تھا وہ صحیح اور سچی تھیں لیکن ابھی میں یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ یہ اس واردات میں ملوث نہیں۔ میرے ذہن میں تاج کی باتیں گونج رہی تھیں جو نوکرانی کی بیٹی نے بتائی تھیں۔ میں یہ بھی بتادوں کہ نوکرانی کی بیٹی کو بھی ابھی میں نے ان مشتبہوں کی فہرست سے نہیں نکالا تھا جو میں نے ذہن میں رکھی ہوئی تھی۔

مجھے پریشانی یہ لگ گئی تھی کہ تفتیش لمبی ہوگئی تھی اور ابھی تک میں کسی قابل اعتبار سراغ تک نہیں پہنچا تھا۔ میرے دونوں اسسٹنٹ بھی ناکام چلے آرہے تھے۔ ایک ہفتے میں تو ہم پتھروں کو بھی بلوا لیتے تھے لیکن تمام جرائم پیشہ مشتبہ تشدد برداشت کئے چلے جارہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی نہیں بولتا تھا نہ ان میں سے کوئی کسی کے خلاف شک کا اظہار کرتا تھا۔

میں نے اسلم سے تاج کے بھائی رحمان کا ذکر چھیڑ دیا۔

اسلم فوراً بولا کہ رحمان اس کا دوست ہے اور وہ بھی تاج کے متعلق پریشان رہتا ہے لیکن اتنا مجبور ہے کہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ رحمان اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہتا رہتا ہے جنہوں نے بیٹی کو بڑے گھٹیا اور فراڈیئے خاندان میں دے دیا تھا...... میں نے اسلم کو فارغ تو کردیا لیکن یہ شخص میرے ذہن میں موجود رہا۔ جاتے جاتے میں نے اسے روکا اور کہا کہ اس واردات میں گھر بھیدی یقیناً شامل ہے لیکن مجھے پتہ نہیں چل رہا وہ کون ہے۔

"میں سچی بات بتاؤں!"۔۔۔ اسلم نے کہا۔۔۔ "میں جب اس واردات کے متعلق سوچتا ہوں تو سچی بات ہے، خوشی ہوتی ہے کہ ان حرام خوروں کو یہ چوٹ پڑی ہے۔ اس سے زیادہ میں نے ابھی تک نہیں سوچا۔ کوئی پیشہ ور ڈاکو ہاتھ صاف کرگیا ہے...... اگر آپ کو یہ شک ہے کہ گھر بھیدی نے یہ واردات کروائی ہے تو وہ ان کی نوکرانی ہوسکتی ہے"۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ نوکرانی روتی زیادہ اور بولتی کم ہے۔ وہ تو اس قابل لگتی ہی نہیں کہ اتنے بڑے مجرموں کے ساتھ تعاون کرسکتی ہے۔ اسلم نے طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا کہ سنا ہے آپ تو بڑے قابل اور تجربہ کار تھانیدار ہیں لیکن آپ ایک عورت کے رونے سے متاثر ہوگئے۔ اگر میں کہوں کہ اس نوکرانی کی بیٹی بھی اس میں شامل ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا لیکن نوکرانی کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اسلم نے وجہ یہ بتائی کہ اس نوکرانی کو پیسے چاہئیں جس سے وہ اپنی بیٹی کو بیاہ سکے۔ یہ پیسے چاہے شریف لوگوں سے ملیں یا بدمعاش لوگوں سے۔ بہرحال اس نوکرانی کو پیش نظر رکھیں اور اسے صرف غریب اور نادار نہ سمجھتے رہیں۔

اسلم یہ بات کہہ کر اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ میرا دماغ کمزور تو نہیں ہوگیا۔ میں تفتیش کے دوران اتنا کمزور اور جذباتی تو کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس بوڑھی نوکرانی کے آنسوؤں اور آہوں نے کردیا تھا۔

بہن کے جھمکے

یہ میرا یقین اور عقیدہ ہے کہ انسان دیانتدار ہو تو اللہ مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ میں تو ایاک نعبد و ایاک نستعین کی حقیقت پر یقین رکھتا تھا اور یہی میری عملی زندگی کا بنیادی اصول تھا۔ یقیناً اس کی برکت اور رحمت تھی کہ اچانک پردے اٹھنے لگے جیسے افق پر چھائی ہوئی سیاہ کالی گھٹا میں سے چاند آہستہ آہستہ اوپر آرہا ہو۔

ہوا یوں کہ جس روز میں نے اسلم کو بلایا تھا' اس سے اگلے روز میں تھانے پہنچا ہی تھا کہ شیخ نذیر کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ آ گئی ۔ میں نے انہیں ان کے گھر میں دیکھا تھا اور اب انہیں دوسری مرتبہ دیکھ رہا تھا ۔ میں نے یہ ان کے گھر میں دیکھ لیا تھا کہ شیخ نذیر کی بیوی بڑی دبنگ اور مردانہ قسم کی عورت تھی اور اس کی زبان بہت چلتی تھی ۔ اس روز گھر میں اس کی بیٹیاں بہت کم بولی تھیں ۔ اب وہ آئیں تو ان لڑکیوں کی ماں نے مجھ سے جواب طلبی کے انداز سے پوچھا کہ ملزموں کا کچھ پتہ چلا ہے یا نہیں میں نے اس کی تسلی کے لئے کوئی جواب دیا تو اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک بڑا واضح اشارہ دینے آئی ہے۔

یہ سن کر مجھے خوشی سی ہوئی اور اسے کہا کہ وہ فوراً اشارہ دے دے' پہلے ہی سات آٹھ دن ضائع ہو گئے ہیں۔

''فوراً میری بہو تاج کو پکڑیں'' ـــــ اُس نے کہا ـــــ ''یہ نامراد گھر بھیدی بنی رہی ہے اور اس نے ہمارا گھر خالی کرا دیا ہے''۔

میں نے اسے بتایا کہ کوئی ثبوت بھی ہونا چاہئے ۔ ہم کسی کو بغیر شہادت اور ثبوت کے نہیں پکڑا کرتے ۔ اگر صرف شک ہی ہو تو اس کا بھی کوئی جواز ہونا چاہئے۔

''تھانے لا کر اسے پھینٹی لگائیں'' ـــــ شیخ نذیر کی بیوی نے کہا ـــــ ''خود ہی بک پڑے گی''۔

تاج پر مجھے پہلے ہی شک تھا لیکن میں کوئی جواز اور کوئی شہادت حاصل کر کے اسے پکڑنا چاہتا تھا ۔ یوں نہیں کہ کسی نے کسی کی عداوت میں یہ کہہ دیا کہ اسے پکڑ لو اور ہم نے اسے پکڑ لیا ۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ساس اپنی بہو کی دشمن ہے اور اس کی دونوں بیٹیاں بھی تاج کو اچھا نہیں سمجھتیں ۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس خیال سے آئی ہیں کہ تاج کو ذلیل و خوار کرا کے اپنی لونڈی بنا لیں گی ۔ میں نے انہیں ایسا تاثر نہ دیا کہ وہ عداوت کی تسکین کر رہی ہیں' میں انہیں یہی کہتا رہا کہ کوئی ذرا سا ثبوت یا اشارہ مجھے دے دیں۔

''کیا آپ پیر صاحب کا اشارہ بھی نہیں مانیں گے؟'' ـــــ شیخ نذیر کی بڑی بیٹی نے کہا ـــــ ''ہم تین چار دن پہلے پیر صاحب کے پاس گئی تھیں اور انہیں کہا تھا کہ ہمارے ڈاکو پکڑوا دیں ۔ پیر صاحب نے پوری رات چلہ کاٹا' مؤکل حاضر کئے اور اگلے روز انہوں نے بتایا کہ اپنی بہو کو پکڑو' واردات اس نے کروائی ہے''۔

میرا خیال ہے کہ مجھے لمبی چوڑی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ مختصر بات یہ تھی

کہ یہ خاندان اس پیر کا مرید تھا ۔ یہ ماں اور اس کی بیٹیاں پیر کے پاس گئی تھیں اور پیر نے انہیں جو کہا وہ انہوں نے مجھے آ کر بتایا۔

میں نے خاص بات یہ نوٹ کی کہ بڑی لڑکی پیر کا نام اس طرح سے لیتی تھی اور اس کی کرامات اس طرح سناتی تھی جیسے وہ پیر نہیں بلکہ کوئی نبی اور پیغمبر تھا ۔ وہ تو پیر کی عاشق معلوم ہوتی تھی ۔ چھوٹی بہن کی نسبت وہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔

میں نے پہلے اس پیر کی تھوڑی سی باتیں کی ہیں' اب چاہتا ہوں کچھ اور باتیں لکھوں ۔ یہ پیر اس وقت چالیس برس کے لگ بھگ کی عمر میں تھا ۔ بڑا ہی خوبصورت اور تندرست آدمی تھا ۔ جسم بھینسے کی طرح بھرا ہوا اور چہرہ سفید اور گلابی تھا ۔ اس کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی اس کے چہرے پر خوب پھبتی تھی ۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اُسی زمانے میں میں نے ایک انگریزی پکچر Thief Of Baghdad دیکھی تھی ۔ اس انگریزی فلم کی کہانی الف لیلہ کی داستانوں میں سے لی گئی تھی ۔ ان میں ایسا ہی ایک کردار قد آور' ہٹا کٹا اور بڑا ہی خوبرُو تھا ۔ بالکل اس پیر سے ملتا جلتا تھا ۔ فلم میں اس کا رول شیطانوں جیسا تھا اور وہ جہاں جاتا فساد پھیلاتا اور فراڈ کھیلتا تھا لیکن جو عورت اسے دیکھ لیتی تھی وہ اس کی گرویدہ ہو جاتی تھی۔

اب میں ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی پیر کی تعریفیں کرتے سن کم رہا تھا اسے دیکھ زیادہ رہا تھا ۔ اس کے انداز میں والہانہ پن اور وارفتگی تھی ۔ میں اُس وقت سمجھ گیا تھا (اور بعد میں تصدیق بھی ہو گئی تھی) کہ یہ لڑکی اس پیر کی روحانیت سے نہیں بلکہ اس کی سانڈ جیسی مردانگی سے متاثر ہوئی تھی۔

میں نے ان عورتوں کے ساتھ جھوٹے سچے وعدے کر کے انہیں چلتا کیا اور سوچا کہ میں اس پیر کے پاس جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ آپ کو گھر بھیدی نظر آ گیا ہے' ذرا اور ہمت کریں' ہو سکتا ہے آپ کو ملزم بھی نظر آ جائیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ پیر نے شیخ نذیر کی بیوی سے اچھی خاصی رقم بٹور لی ہوگی۔

وہ دن گزرا اور رات بھی گزر گئی ۔ اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو تاج کا بھائی رحمان میرا منتظر بیٹھا تھا ۔ اسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا ۔ تیس بتیس سال عمر کا بڑا اچھا جوان تھا ۔ اس کے متعلق مخبروں نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں اور میرے ذہن میں اس کے خلاف بھی تھوڑا سا شک پیدا ہو گیا تھا ۔ اس نے اپنا تعارف کرایا ۔ میں نے اسے اندر اپنے کمرے میں لے جا کر

بٹھایا۔اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سونے کے بنے چھوٹے چھوٹے جھمکوں کی ایک جوڑی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟

''نقب زنی کا ایک ملزم بے نقاب ہو گیا ہے'' ـــ رحمان نے کہا ـــ ''یہ جھمکے میری بہن کے ہیں جو اس ملزم سے مجھے ملے ہیں۔ شیخ نذیر کا جو زیور چوری ہوا ہے' اس میں میری بہن تاج کا زیور بھی تھا اور اس زیور میں یہ جھمکے بھی تھے''۔

میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کوئی پولیس آفیسر ہی ٹھیک طرح کر سکتا ہے۔ اس واردات کی تفتیش نے مجھے پریشان اور بے حال کر دیا تھا۔ میں نے رحمان سے کہا کہ وہ نہایت واضح طریقے سے مجھے بتائے کہ اسے یہ جھمکے کہاں سے ملے ہیں اور وہ ملزم کون ہے۔ اس نے اپنی اس بُری عادت کو چھپانے کی کوشش کی ہی نہیں کہ وہ کبھی کبھی قبرستان میں تکئے پر جا کر جوا کھیلا کرتا ہے۔ وہ کوئی پسماندہ اور ان پڑھ آدمی نہیں تھا' اچھا خاصا پڑھا لکھا تھا لیکن بری عادت کسی کی تعلیم یا سوشل حیثیت نہیں دیکھا کرتی۔ چرس چوہڑے چمار بھی پیتے تھے اور چوہدری بھی۔ اس طرح رحمان کو نہ جانے کیسے جوئے بازی کی لت پڑ گئی تھی۔

اُس نے بتایا کہ گذشتہ رات بڑی جم کر بازی لگی اور ایک بڑا پکا جواری ہارتا ہی چلا گیا اور بالکل ہی خالی ہو گیا۔ ایک تو وہ چرس کے نشے میں تھا اور پھر ہارا ہوا جواری پورا نہیں نیم پاگل ضرور ہو جاتا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جوئے باز جب ہارتا ہے تو اپنی سگی بہن یا ماں یا بیٹی کا زیور چوری کر کے لے جاتا اور بازی لگاتا ہے۔ اس کے ذہن میں سوچ یہ ہوتی ہے کہ وہ جیت جائے گا اور یہ زیور واپس رکھ دے گا جہاں سے چوری چھپے اٹھایا تھا۔

رحمان نے مجھے سنایا کہ وہ جواری آخری داؤ بھی ہار گیا تو اس نے کہا کہ ابھی اٹھنا نہیں' میں واپس آتا ہوں۔

وہ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس نے جھمکوں کی یہ جوڑی جواریوں کے سامنے رکھ دی اور جواریوں نے مل کر اس کی قیمت مقرر کی اور پھر بازی لگی۔ اتفاق دیکھیں کہ یہ جھمکے رحمان نے جیت لئے۔ رحمان نے مجھے بات سناتے ہوئے کہا کہ یہ جھمکے کوئی اور جیت لیتا تو بھی یہ تھانے پہنچ جاتے۔

رحمان نے اپنے بیان میں کہا کہ تاج کی شادی سے چند پہلے اس نے یہ جھمکے ایک آدمی سے خریدے تھے جسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ایک تو وہ جھمکے در پردہ بیچنا چاہتا تھا اور دوسرے اسے یہ ڈر تھا کہ زیادہ تر سنار ہندو تھے وہ دھوکہ دے کر رقم بڑی تھوڑی دیتے

تھے۔ رحمان نے یہ جھمکے خرید لئے اور اپنی بہن کو دے دیئے۔

رحمان نے کہا کہ ان جھمکوں کو اچھی طرح دیکھیں۔ ایک جھمکے کی وہ ہک تھی ہی نہیں جو کان کے سوراخ میں ڈالی جاتی ہے۔ رحمان نے بتایا کہ اسے یہ جھمکا اسی حالت میں ملا تھا۔ ان جھمکوں کے نیچے جھالر سی بنی ہوئی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے سفید موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک جھمکے کے تین موتی غائب تھے۔ کہیں گر گئے ہوں گے۔ یہ اس وقت بھی نہیں تھے جب یہ جھمکے رحمان نے خریدے تھے۔ رحمان نے یہ جھمکے اپنی بہن تاج کو دے کر کہا تھا کہ کسی وقت وہ اس میں سونے کی ہک بھی ڈلوا دے گا اور موتی بھی فٹ کرا دے گا لیکن تاج نے یہ اسی طرح اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ اسے ماں باپ نے بہت ہی اچھا اور خاصا زیور دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ ان جھمکوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہو گی لیکن میرے لئے یہ جھمکے بہت ہی اہم بن گئے۔

کون کس انجام کو پہنچا!

میں نے رحمان سے اس آدمی کا نام پوچھا۔ اس نے بتایا تو یہ کچھ مانوس لگا۔ میرا اے ایس آئی اس تھانے میں زیادہ پرانا تھا۔ اسے بلا کر یہ نام بتایا تو اس نے یاد دلایا کہ یہ ایک وارداتیا ہے اور چار یا پانچ ہفتے پہلے دو سال جیل کاٹ کر آیا تھا۔ اس کی کچھ ہسٹری اور بھی تھی لیکن میں نے یہ بات دلچسپی سے نوٹ کر لی کہ وہ اس پیر کے خاص مریدوں میں سے تھا۔ بہر حال جرائم پیشہ تھا۔

''ایک دلچسپی یہ ہوئی'' ـــ رحمان نے کہا ـــ ''رات کو تو وہ چرس کے نشے میں اور ہار جانے کے غم و غصے میں دوڑتا گیا اور چوری کے جھمکے اٹھا لایا لیکن آج صبح میں ابھی جاگا ہی تھا کہ میرے دروازے پر آ دستک دی اور کہنے لگا کہ وہ جھمکے مجھے دے دو میں دوپہر تک کیش رقم دے دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ پہلے وہ رقم لے آئے اور جھمکے لے جائے۔ یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ اس وقت ٹل جائے اور یہ جھمکے آپ تک پہنچا دوں۔ وہ تو ہاتھ جوڑنے لگا کہ میں اسے جھمکے واپس دے دوں، آخر وہ میرے پاؤں میں بیٹھ گیا اور منتیں کرنے لگا کہ جھمکے واپس دے دو، میں ابھی پیسے لاتا ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے ٹالا اور یہ کہا کہ وہ گھر چلے میں جھمکے لے کر آتا ہوں''۔

میں نے بڑی تیزی سے حرکت کی۔ اے ایس آئی سے کہا کہ وہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور

دو تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لے اور ابھی اس شخص کے گھر چھاپہ مارے اور خانہ تلاشی کے بعد اسے تھانے لے آئے۔

کم و بیش دو گھنٹوں بعد اسے گرفتار کر کے لے آئے۔ اس کے گھر سے اور کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ رقم تو وہ ساری گذشتہ رات ہار گیا تھا اور وہاں سے کیا ملنا تھا۔ اسے میرے پاس لائے تو میں نے اسے اتنا ہی کہا کہ بالکل سچ بتا دو کہ یہ جھمکے تمہارے پاس کہاں سے آئے ہیں اور پھر جاؤ۔ تمہاری چھٹی۔ وہ جھوٹ بولنے لگا لیکن میں نے اسے زیادہ بولنے نہ دیا اور اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے لے جاؤ اور تب چھوڑنا جب یہ اقبالی بیان دے دے گا۔

یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ جھمکے تاج کے تھے اور اس زیور کے ساتھ نکل گئے تھے جو نقب زنی کی واردات میں چوری ہوا تھا۔ میرے پاس اب اس ملزم کے لئے ذرا سا بھی رحم نہیں تھا۔

یقین کریں کہ صرف آدھے گھنٹے بعد اے ایس آئی اسے میرے پاس لایا۔ اس نے اقبالی بیان دے دیا تھا۔ اس میں اس نے بتایا کہ یہ واردات پیر نے کروائی تھی اور مشہور نقب زن کیدو نے کی تھی۔ کیدو کے ساتھ ایک تو یہ آدمی تھا اور اس نے اپنے تیسرے ساتھی کا نام بھی بتا دیا۔ واردات کے بعد یہ سارا مال پہلے پیر کے ہاں گیا تھا۔ پیر اتنا کم عقل نہیں تھا کہ ڈکیتی کا مال اپنے پاس رکھ لیتا۔ اسے کیدو پر اعتماد تھا۔ اس نے کیدو سے کہا کہ یہ تمام زیور اپنے قبضے میں رکھے اور تین چار مہینوں بعد اسے کہیں دور فروخت کیا جائے گا۔

یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی کہ ایک پیر نے نقب زنی کی واردات کروائی تھی۔ میں نے ''حکایت'' میں مدیر ''حکایت'' کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے ایک لفظ استعمال کیا تھا۔ ''پیر مافیا''۔ کسی پولیس آفیسر سے پوچھیں کہ یہ لفظ کس قدر صحیح اور سچ ہے۔ مافیا کا لفظ جرائم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ پیر میرے وقتوں میں بھی جرائم پیشہ غنڈوں کو اپنے پاس رکھتے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اس وقت سے پہلے بھی پیروں نے اسی طرح غنڈہ پروری اپنے لئے ضروری سمجھ رکھی تھی، آج بھی پیر اپنے ساتھ جرائم پیشہ اور غنڈوں کا ایک گروہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر میں بڑا ہی طویل اور سیر حاصل مضمون لکھ سکتا ہوں اور شاید کبھی لکھوں بھی، یہاں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اس پیر نے بھی غنڈوں اور مجروں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا۔ یہ پیر اپنے دیہاتی علاقے کی سیاست

سے لے کر پورے ملک کی سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

میں نے اتنی تیزی سے کارروائی کی کہ کیدو اور اس کے دوسرے ساتھی کو ابھی پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ ان کی نشاندہی ہو گئی، میں نے انہیں گھروں سے گرفتار کر لیا۔ کیدو نے تمام زیور برآمد کروا دیا۔ ٹرنک میں جو کپڑے وغیرہ تھے وہ بھی ابھی محفوظ پڑے تھے۔ لوٹے ہوئے مال کی تقسیم دو چار مہینوں بعد ہونی تھی۔

یہ میری خوش قسمتی اور ان مجرموں کی بدقسمتی تھی کہ یہ جھمکے جس سے برآمد ہوئے اس نے مال سے چوری چوری کھسکا کر اپنے پاس رکھ لئے تھے۔

تھانے لا کر کھروں کے مولڈوں سے ان کے کھرے ملائے گئے تو وہ بالکل صحیح نکلے۔ ان کا ایک ساتھی تو پہلے ہی اقبال جرم کر چکا تھا، کیدو اور اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اقبال جرم کر لیا۔ شیخ نذیر کی نوکرانی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور وہ بھی مان گئی کہ اس نے ان ڈاکوؤں کی رہنمائی کی تھی اور بتایا تھا کہ مال والا ٹرنک کہاں پڑا ہے۔

اب اس کہانی کا سب سے زیادہ اہم اور عبرت ناک حصہ سنیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں پیر کو گرفتار کر کے سے زیادہ سزا اسے دلاتا لیکن دو وجوہات تھیں جنہوں نے مجھے مجبور اور بے بس کر رکھا تھا۔ ایک یہ کہ انگریز کوشش کرتا تھا کہ کسی پیر کو یا دوسرے مذہبوں کے پیشواؤں کو گرفتار نہ کیا جائے۔ انگریز کو معلوم تھا کہ مسلمان خدا اور رسولؐ کے حکم کو مانیں یا نہ مانیں وہ اپنے پیر کا حکم مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ساری مرادیں پیر صاحب پوری کر دیتے ہیں اور وہی خلق خدا کے ان داتا ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ تینوں ملزموں نے بیان میں کہا کہ انہیں پیر نے یہ واردات کرنے کو کہا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں گرفتار نہیں ہونے دے گا اور اس طرح پیر نے انہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلایا تھا۔ یہ کوئی جرم نہیں بنتا تھا۔ ملزم کسی کا نام لے کر کہہ دیں کہ ہمیں فلاں شخص نے یہ جرم کرنے کو کہا تھا تو قانون اس شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنے دیتا۔ میں اپنی اس مجبوری میں اتنا سٹپٹایا کہ تھانے میں اپنے عملے میں بیٹھ کر پیر کو برا بھلا کہتا رہا اور میں نے یہ الفاظ بھی کہے کہ اس پیر کو میں کبھی نہ کبھی گرفتار ضرور کروں گا۔

مجھے خیال نہ رہا کہ جذبات میں آ کر میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے عملے میں اپنے جونیئر سب انسپکٹر اور اے ایس آئی سمیت اس پیر کے مرید ہیں۔ ان میں سے کسی نے پیر کو جا بتایا کہ یہ تھانیدار اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ پیر کو یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی ڈکیت پارٹی

پکڑی گئی ہے۔ وہ اس پارٹی کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اور مجھے ڈرانے کے لئے اگلے ہی روز تھانے میں آ گیا۔

وہ گھوڑی پر سوار تھا اور سر پر طرے والی پگڑی تھی۔ میرا تو سارا عملہ اس کے استقبال کو اُٹھ دوڑا اور میں اپنے دفتر میں بیٹھا رہا۔ وہ میرے دفتر میں آیا تو میں نے سرد مہری سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بٹھایا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں جب کیدو سے بیان لے رہا تھا تو اس دوران شیخ نذیر کی بڑی بیٹی کا ذکر آ گیا تھا۔ کیدو نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لڑکی پیر کی باقاعدہ داشتہ بنی ہوئی تھی اور پیر کے ساتھ شادی کرنے کو بھی تیار تھی۔ غور کریں کہ اس لڑکی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

کہانی پہلے ہی خاصی لمبی ہو گئی ہے اس لئے میں پیر کی ساری مکالمہ بازی نہیں سناؤں گا، اُس نے آتے ہی عجیب سی جلالی کیفیت میں مجھے کہا کہ میں اس کو بدنام کر رہا ہوں کہ یہ واردات اس نے کروائی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے مؤکلوں یعنی جنات کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے بڑے برے انجام تک پہنچائیں گے اور میرے گھر کے بچے بچے کو بڑی اذیت ناک موت ماریں گے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ اسے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ اس واردات کے ملزم کون کون ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس نے کہا تھا کہ شیخ نذیر کی بہو نے گھر بھیدی کا کام کیا ہے۔ وہ بولا کہ وہ اس نے جلد بازی میں کہہ دیا تھا اور آج اس نے میرے پاس آنا ہی تھا کہ میری رہنمائی کرے۔

وہ کافی کچھ بول چکا تو میں نے اسے اتنا ہی کہا کہ جناب پیر صاحب، قانون نے مجھے مجبور کر رکھا ہے ورنہ میں آپ کو گرفتار کر کے بھی دکھا دوں۔ میری یہ بات سن کر اس نے دھمکی آمیز لہجے میں بات کی اور کہا کہ میں اس کی بے ادبی سے باز نہ آیا تو بہت برے انجام کو پہنچوں گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''فوراً اٹھو''...... میں نے کہا اور نہ جانے مجھے غیب سے کوئی اشارہ ملا تھا یا کیا ہوا تھا کہ میں نے یوں کہا...... ''یہاں سے نکل جاؤ اور دیکھتا ہوں کون کیسے انجام کو پہنچتا ہے۔ تم خدا کے بندوں کے خدا نہیں ہو۔ اس فرعونیت سے باز آ جاؤ''۔

وہ مجھے گھورتا ہوا کچھ اور کہے بغیر میرے دفتر سے نکل گیا۔ میں نے ہمیشہ اور ہر حال میں غصے کو اپنے قابو میں رکھا ہے لیکن اس روز غصے پر قابو پانا بڑا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ایک آدمی گھوڑی پر سوار گھوڑی دوڑاتا تھانے میں آیا اور

یہ اطلاع دی کے پیر صاحب راستے میں گھوڑی سے گر پڑے ہیں اور بے ہوشی کی حالت میں انہیں اٹھا کر ایک گھر میں رکھا گیا ہے۔ میں اس اطلاع پر اٹھ دوڑا۔ پیر کا گھر تھانے سے تقریباً دو میل دور تھا۔ تھانے سے رخصت ہوتے وہ ابھی ایک میل بھی نہیں گیا تھا، عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق، تین چار کتے لڑتے لڑتے پیر کی گھوڑی کی ٹانگوں میں آ گئے۔

گھوڑی جو آرام آرام سے چل رہی تھی۔ اچانک دوڑ پڑی۔ پیر کو یہ جھٹکا پڑا تو اس کی پگڑی گر پڑی۔ آگے بڑ کا درخت تھا جس کا ایک بڑا موٹا ٹہن زمین سے تھوڑا ہی اوپر تھا۔ بے لگام گھوڑی سرپٹ دوڑتی اس ٹہن کی طرف جا رہی تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ گھوڑی بے قابو ہو گئی تھی اور دائیں بائیں مڑتی ہی نہیں تھی۔

پیر کے سر سے پگڑی پہلے ہی گر چکی تھی۔ اس کا ماتھا بڑ کے ٹہن سے ٹکرایا اور وہ گھوڑی سے گر پڑا۔ ٹہن اتنا ہی اونچا تھا۔ پیر خوش قسمت تھا کہ اس کے دونوں پاؤں رکابوں سے نکل آئے تھے۔ ایک بھی پاؤں رکاب میں پھنسا رہ جاتا تو گھوڑی اسے گھسیٹ گھسیٹ کر بری موت مارتی۔ پیر گر پڑا اور گھوڑی آگے نکل گئی۔

جن لوگوں نے دیکھا وہ دوڑے آئے اور پیر کو اٹھا کر قریب ہی ایک گھر میں لے گئے۔ پیر بے ہوش تھا۔ میں گیا اور پیر کو شہر کے ہسپتال پہنچایا۔

ان تفصیلات کو جانے دیں کہ پیر کا کیا کیا علاج ہوا اور اسے کہاں لے گئے، میں اس شخص کا انجام بتاتا ہوں جو یہ تھا کہ اس کے سر کے اگلے حصے پر ٹہن کی چوٹ اتنی شدید پڑی تھی کہ وہ حصہ بے کار ہو گیا اور پیر کی یادداشت ختم ہو گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔

اس کی گدی اس کے بڑے بیٹے نے سنبھال لی تھی۔ ڈاکٹروں نے پیر کو لا علاج قرار دے کر گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ کم و بیش بیس سال زندہ رہا اور اس طرح رہا کہ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کیا تھا اور کس انجام کو پہنچا ہے۔ وہ پاکستان میں آ کر مرا تھا۔ اس عرصے میں پاکستان میں بھی اس کی گدی قائم ہو گئی تھی جس نے بڑی ہی تیزی سے شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی۔

یہ تو پیر کے انجام کی بات تھی۔ تینوں ملزموں کو خاصی لمبی سزائیں دی گئی تھیں اور نوکرانی کو صرف ایک سال سزائے قید ملی تھی۔

+ + +

ممتا کی موت

وہی مقتولہ جس میں اتنی ذہنی گھٹن تھی کہ محلے کی عورتوں سے بھی ملنے ملانے سے گریز کرتی تھی، ایسی آزاد خیال ہوگئی جیسے اس نے مر کر نیا جنم لیا ہو اور اس میں ایسی شگفتہ مزاجی پیدا ہوگئی کہ عورتیں جیسے بھول ہی گئی ہوں کہ یہ تو بڑی جھوٹی، سیاست باز اور مکار عورت ہے۔

قتل کی یہ واردات ہندوستان کے شہر سہار نپور کی ہے۔ مجھے اس تھانے کا ایس ایچ او بنے ایک سال گزر گیا تھا۔ سہار نپور امن و امان والا شہر تھا۔ چھوٹے بڑے جرائم ہوتے تھے لیکن کم۔ قتل کی واردات بھی کبھار ہوتی تھی۔ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ ہندو فریب کاری اور مکاری کر سکتا ہے اور ہجوم کی صورت میں مسلمانوں پر حملہ کر کے خون خرابہ کیا کرتا ہے۔ جہاں تک قتل کی واردات کا تعلق ہے یہ جرم مسلمانوں کے حصے میں آیا ہے۔ قتل کی یہ واردات جو سنانے لگا ہوں، مسلمانوں کی واردات تھی۔

پچیس چھبیس سال عمر کا ایک خوبرو جوان صبح تھانے میں رپورٹ لے کر آیا کہ اس کی ماں کی لاش محلے کے ساتھ ہی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑی ہے۔ اس نے کہا کہ کپڑوں پر خون کا کوئی نشان نہیں، معلوم نہیں وہ کس طرح مری ہے یا اسے مارا گیا ہے۔

''اگر وہ تمہاری ماں تھی'' ___ میں نے کہا ___ ''تو تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ رات کس وقت گھر سے نکلی تھی اور کیا بتا کر نکلی تھی''۔

''میں رات اپنے گھر گیا ہی نہیں'' ___ اس نے بتایا ___ ''ایک دوست کے گھر تاش کھیلنے بیٹھے۔ آدھی رات گزر گئی تو وہیں سو گئے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی نے بتایا اور میں دوڑا آگیا پھر آپ کے پاس آگیا''۔

یہ ذہن میں رکھ لیں کہ یہ خوبرو جوان جو مجھے ماں کی لاش کی اطلاع دے رہا تھا، میرے تھانے کے ریکارڈ پر تھا۔ جوا بازی میں تین چار بار پکڑا گیا تھا۔ ایک بار اسے ڈیڑھ ماہ سزائے قید ہوئی تھی۔ وہ مشتبہوں کی لسٹ پر تھا۔ تین مہینے پہلے اسے ڈکیتی میں دو سال سزائے قید ہوئی تھی لیکن اپیل میں بری ہوگیا۔ یہ مجھ سے پہلے والے تھانیدار کا بنایا ہوا کیس تھا جو اس نے بہت کمزور بنایا تھا، اس لئے بری ہوگیا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ڈکیتی کا پکا مجرم تھا۔

اس کا نام صدر الدین تھا اور بھولا کے نام سے مشہور تھا۔ تھانے میں اس کا نام

صدرالدین عرف بھولا لکھا ہوا تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کی آپس میں عداوت چلتی رہتی ہے۔

میں نے بھولے سے پوچھا کہ اس کی ذاتی یا خاندانی دشمنی کسی کے ساتھ ہوگی۔ اس نے بڑے پکے لہجے میں کہا کہ اس کی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں نہ کسی سے خاندانی دشمنی ہے۔

پہلے تو مجھے جا کر یہ دیکھنا تھا کہ اس کی ماں مری کیسے ہے۔ باہر نکلی تو ایسے زہریلے سانپ نے ڈاس لیا ہوگا کہ گھر تک نہ پہنچ سکی۔ کوڑے کے ڈھیر پر گری اور مرگئی یا حرکت قلب بند ہوگئی ہوگی۔ ضروری نہیں تھا کہ قتل ہی ہوئی ہے۔ میں نے رپورٹ درج نہ کی اور بھولے کے ساتھ چلا گیا۔

وہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاصا وسیع اور عریض میدان تھا جس میں بارشوں کے پانی کا چھپڑ بھی تھا۔ محلے کے ساتھ ہی محلے والوں کے پھینکے ہوئے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر ایک عورت کی لاش ایک پہلو کے بل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کر ہی اپنے آپ سے کہہ دیا کہ یہ قتل ہے۔ کسی اور وجہ سے مرتی تو ڈھیر کے قریب گرتی۔ یہ تو ڈھیر کی ڈھلان پر پڑی تھی۔ میری سراغرساں نظریں کہہ رہی تھیں کہ لاش کہیں سے لا کر یہاں پھینکی گئی ہے۔

میں لاش کے قریب نہ گیا۔ بہت بدبو تھی۔ لاش کے قریب ایک کتا مرا پڑا تھا جس کا جسم پھول گیا تھا۔ سارے محلے کی نہ جانے کتنے سالوں کی گندگی اس ڈھیر پر گل سڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے تجربے اور ایمان کی رو سے کہا کہ یہ کوئی بہت ہی گناہگار عورت ہے جسے قبر کی بجائے غلاظت کا یہ ڈھیر ملا ہے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا جس نے کوئی کھرا نہیں رہنے دیا تھا۔ میں نے لاش ڈھیر سے اٹھوا کر صاف جگہ رکھوائی۔ پیٹھ کے بل پڑی لاش کا چہرہ دیکھا تو موت کا باعث معلوم ہوگیا جس کی تصدیق گردن پر نشانات نے کر دی۔ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ آنکھیں زیادہ کھلی ہوئیں، منہ کھلا ہوا اور زبان باہر آئی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا گلا کہیں اور گھونٹا گیا اور لاش یہاں پھینک دی گئی۔

میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوائی اور ایف آئی آر تحریر کرنے کا بندوبست کر دیا۔ میرے اندازے کے مطابق مقتولہ کی عمر 45 سال کے لگ بھاگ تھی۔ آنکھیں اور منہ اتنا زیادہ کھلا ہوا تھا اور زبان باہر آنے کی وجہ سے اور پھر چہرے پر تکلیف کے آثار ہونے کی وجہ سے چہرہ ڈراؤنا سا ہوگیا تھا۔ یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ زندگی میں اس عورت کا چہرہ

کیسا تھا۔ یہ پتہ چل رہا تھا کہ چہرے پر بڑھاپے کے آثار نہیں تھے۔

خاص بات یہ دیکھی کہ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ سٹک لگی ہوئی تھی۔ گالوں پر بہت ہی ہلکی سرخی تھی اور آنکھوں میں سرمہ یا کاجل تو ذرا دور سے بھی نظر آجاتا تھا۔ کپڑے ایسے نہیں تھے جو عورتیں عام طور پر گھروں میں پہنتی ہیں۔ کپڑے خاص تھے جو کسی تقریب یا بیاہ شادی پر پہنے جاتے ہیں۔ کانوں میں بڑے سائز کے رِنگ تھے۔ ایک بازو میں سونے کا وزنی کڑا اور انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

اس میک اپ، لباس اور زیور سے پتہ چلتا تھا کہ مقتول کسی کے ہاں بیاہ شادی یا تیل مہندی کی تقریب پر جارہی تھی یا واپس آرہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ زیور کی موجودگی بتاتی تھی کہ یہ رہزنی کی واردات نہیں۔ یہ انتقامی قتل تھا۔ مقتولہ کے ساتھ قتل سے پہلے کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ زیادتی اور دست درازی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

میرے کہنے پر میرے بیٹھنے کا انتظام ایک معزز آدمی کے گھر کی بیٹھک میں کیا گیا۔ اُدھر جاتے ہوئے میں نے بھولے سے پوچھا کہ اس کی ماں نے کسی بیاہ شادی میں جانا تھا؟ بھولے نے جواب دیا کہ وہ شام کے بعد گھر گیا ہی نہیں۔ پھر پوچھا کہ گھر میں اور بھی افراد ہوں گے۔ اس کا باپ ہوگا، بہنیں بھائی ہوں گے!

''میرے والد کو فوت ہوئے چار سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا ہے''۔۔۔ بھولے نے جواب دیا۔۔۔ ''دو بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ بڑی شہر سے باہر بیاہی ہوئی ہے۔ چھوٹی کے سسرال یہیں ہیں۔ وہ کچھ دنوں کے لئے آئی ہوئی ہے۔ رات وہ گھر ہی تھی''۔

رات کے کپڑے پلنگ پر

میں کچھ سوچ کر مقتولہ کا گھر دیکھنے چلا گیا۔ وہ تو اپنے وقتوں کا نہایت اچھا کم وبیش پندرہ مرلے کا مکان تھا۔ گھر میں محلے کی بہت سی عورتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ ڈیوڑھی کے ساتھ بیٹھک تھی۔ اس میں جا کر دیکھا۔ فرنیچر اور سج دھج سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اپر مڈل کلاس کی فیملی ہے۔

میرے پوچھنے پر مجھے وہ کمرہ دکھایا گیا جس میں مقتولہ سویا کرتی تھی۔ وہاں اچھی قسم کا پلنگ اور اس پر دیدہ زیب پلنگ پوش تھا۔ میں نے پلنگ پر زنانہ شلوار قمیض پڑی دیکھی۔

پلنگ کے ساتھ گھر میں پہننے والے سلیپر پڑے تھے۔ میں نے مقتولہ کی بیٹی کو بلوایا۔ بائیس تئیس سال عمر کی یہ لڑکی کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام شکیلہ بتایا۔ نام کے علاوہ میں نے اس سے صرف یہ پوچھا کہ یہ شلوار قمیض اور یہ سلیپر کس کے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کے ہیں۔

میں نے بھولے سے کہا کہ شکیلہ کو وہاں لے آئے جہاں میرے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

تفتیش کی ابتدا شکیلہ سے کی۔ سب سے پہلے یہ پوچھا کہ اس کی ماں کسی کے ہاں شادی پر گئی تھی یا کسی اور تقریب میں گئی تھی؟...... شکیلہ نے بتایا کہ وہ روزمرہ کی طرح اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔ میں نے دوسری بات یہ پوچھی کہ اس نے کپڑے کون سے پہن رکھے تھے؟...... شکیلہ نے بتایا کہ اس نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو پلنگ پر پڑے ہوئے تھے۔ اس ...اب سے یہ معلوم ہوا کہ مقتولہ کپڑے بدل کر اور میک اپ کر کے یعنی تیار ہو کر گھر سے نکلی تھی۔ اس کے پاؤں میں اچھی قسم کے سینڈل تھے۔

''کیا تمہیں پتہ نہیں چلا وہ رات کس وقت گھر سے نکلی تھی؟''___ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''___ شکیلہ نے جواب دیا___ ''ہم دونوں صبح بہت سویرے اٹھا کرتی ہیں۔ میں امی کے کمرے میں گئی۔ پلنگ پر اس کے کپڑے پڑے تھے۔ میرا بھائی بھولا گھر نہیں تھا۔ بھولا راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا ہے اور کبھی آتا ہی نہیں۔ کبھی کبھی امی اسے ڈھونڈنے آدھی رات کو باہر نکل جاتی ہے۔ میں روکتی ہوں لیکن ماں کا دل ہے، اسے چین نہیں لینے دیتا...... میں سوچ ہی رہی تھی کہ امی کپڑے بدل کر کہاں چلی گئی ہے کہ دو عورتیں دوڑتی اور ہاتھ ملتی آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ امی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر مری پڑی ہے۔ میں باہر کو دوڑ پڑی''۔

شکیلہ کو معلوم نہیں تھا کہ مقتولہ رات کس وقت گھر سے نکلی تھی۔ میں نے مقتولہ کی ذہنی اور مزاجی کیفیت پوچھی۔ اس نے بتایا کہ ذہنی طور پر وہ بالکل نارمل تھی۔ شکیلہ نے یہ بھی بتایا کہ مقتولہ ہر وقت شگفتہ موڈ میں رہتی تھی۔ اس نے مقتولہ کے جو اوصاف بیان کئے وہ ایک زندہ دل اور خوش مزاج عورت کے اوصاف تھے۔ البتہ بھولے کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتی تھی کہ اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا اور وہ بھی آوارہ اور بدکار ہو گیا۔

میرے ذہن میں یہ سوال تڑپ رہا تھا کہ مقتولہ رات کو کپڑے بدل کر اور تیار ہو کر جا

کہاں رہی تھی؟ کیا اپنے کسی آشنا کے پاس جا رہی تھی یا اسے مل کر واپس آ رہی تھی؟ یہ سوال مقتولہ کے بیٹے یا بیٹی سے پوچھنا بے کار تھا۔ وہ اپنی ماں کے خلاف ایسا الزام یا شک کبھی تسلیم نہ کرتے۔

ایک اور بات ذہن میں آ گئی۔ بعض لوگوں کو نیند میں چلنے کی ذہنی بیماری ہوتی ہے۔ ایسے ذہنی مریض رات کو اٹھتے ہیں اور نیند میں ہی گھر کے اندر اور بعض گھر کے باہر گھوم پھر کر اپنے بستر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ صبح پوچھو تو وہ مانتے ہی نہیں کہ رات کو وہ چلتے رہے ہیں۔

مجھے ایک اینگلو انڈین جوان لڑکی یاد آئی۔ دلی میں میرے ساتھ ایک اینگلو انڈین انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔ یہ لڑکی اس کی سالی تھی۔ اس انسپکٹر نے بتایا کہ یہ لڑکی ہفتے دس دن میں ایک بار رات نیند میں اٹھتی، کپڑے بدلتی، میک اپ اور کنگھی وغیرہ کر کے گھر کے اندر ٹہلنے لگتی اور کبھی باہر کمپاؤنڈ میں نکل جاتی اور کچھ دیر ٹہل کر واپس بستر پر آ جاتی تھی۔ پھر وہ کپڑے نہیں بدلتی تھی۔ صبح اٹھتی تو حیران ہوتی تھی کہ اس نے کپڑے کس وقت بدل لئے تھے۔ وہ گھر کے کمپاؤنڈ سے باہر نہیں جاتی تھی۔

مجھے یہ لڑکی یاد آئی تو شکیلہ سے پوچھا کہ اس کی ماں کو نیند میں چلنے کی بیماری تو نہیں تھی؟ شکیلہ نے واضح الفاظ میں جواب دیا کہ مقتولہ میں ایسی کوئی بیماری نہیں تھی۔ بڑی پُرسکون نیند سویا کرتی تھی۔

''یاد کرو شکیلہ!''___ میں نے کہا___ ''اپنے بھائی کو تم جانتی ہو۔ اس نے کسی کے ساتھ کوئی بدمعاشی کی ہو گی۔ کسی کی بہو بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو گا۔ ماں نے تمہارے بھائی بھولے کی وکالت کی ہو گی اور لڑکی والوں کے بے عزتی کر دی ہو گی۔ لڑکی والوں نے اس طرح انتقام لے لیا''۔

''ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا''___ شکیلہ نے کہا___ ''ایسا واقعہ معمولی نہیں ہوا کرتا۔ ہوا ہوتا تو سارے محلے کو پتہ چل جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھولا محلے میں بدمعاشیاں نہیں کرتا بلکہ محلے میں کوئی اور آ کر بدمعاشی کرے تو بھولا اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے۔ ایسے وقت پورا محلّہ بھولے کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ محلے میں کسی سے پوچھ لیں۔ میری ماں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے والی عورت تھی ہی نہیں''۔

میں نے شکیلہ کو بہت کھنگالا۔ ایسی باتیں بھی کیں جو اسے سوچنے میں مدد دے سکتی

تھیں لیکن وہ تو کوری تختی ثابت ہوئی۔ اس کے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں کا قتل معمولی صدمہ نہیں تھا۔ کبھی تو بولتے بولتے وہ سسکیاں لینے لگتی تھی۔ اسے مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھا دیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے مقتولہ اور اس کے خاندان کے متعلق میرے کام کی معلومات کہاں سے ملیں گی۔ ایک تو یہ آدمی تھا جس نے مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھایا تھا۔ یہ اس نسل کا معزز آدمی تھا جس کے متعلق میری اور دوسرے انسپکٹر صاحبان کی تفتیشی کہانیوں میں اکثر ذکر آتا ہے۔ یہ روپے پیسے یا زمین جائیداد کی وجہ سے عام لوگوں سے اونچی حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں بعض تھانیداروں کے خوشامدی اور مخبر بن جاتے ہیں۔ لوگ انہیں چغل خور کہتے ہیں لیکن تھانیداران پر خوش ہوتے ہیں کہ یہ صحیح مخبری کرتے ہیں۔ یہ ہر گھر کی خبر رکھتے ہیں اور چاردیواری کے اندر کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔

میں نے اسی آدمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور پوچھا کہ وہ اس خاندان کے متعلق کیا کچھ بتا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ شاید اپنے خاندان کے متعلق اتنا کچھ نہ بتا سکے جتنا مقتولہ اور اس خاندان کے متعلق بتا سکتا ہے۔

حسن نے اندھا کر دیا

اس نے بات ان الفاظ سے شروع کی کہ مقتولہ چال چلن کی ٹھیک عورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً کسی آشنا کے پاس جا رہی تھی یا ملاقات سے واپس آ رہی تھی۔ میری ڈائری میں اس معزز آدمی کا نام لکھا ہوا ہے۔ مجھے اتنی زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود یاد ہے کہ یہ نام مجھے دلچسپ اور شاعرانہ لگا تھا اس لئے میں نے ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ نام تھا امتیاز فردوسی!

"آپ نے اس عورت کو زندہ نہیں دیکھا" ـــــ فردوسی نے کہا ـــــ "اس کی عمر 45 سال سے کچھ زیادہ ہی ہو گی لیکن 30 سال سے ایک دن اوپر کی نہیں لگتی تھی۔ آپ نے ایک سے بڑھ کر ایک حسین عورت دیکھی ہو گی۔ مقتولہ بھی حسین ہی تھی لیکن اس کے حسن اور سراپا میں، بولنے کے انداز اور چال ڈھال میں کوئی طلسماتی سا تاثر تھا۔ دیکھنے والا مسحور سا ہو جاتا تھا"۔

فردوسی نے بتایا کہ مقتولہ کسی اور شہر کی رہنے والی تھی۔ اپنے خاوند کی رشتہ داری اور برادری میں سے نہیں تھی۔ خاوند کی چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ آمدنی بہت تھی۔ خاوند کی شادی کا

وقت آیا تو لڑکیوں والے خود اسے پیغام بھیجنے لگے لیکن اس شخص کو بہت ہی خوبصورت لڑکی کی تلاش تھی۔ اس کے ایک دوست کے والدین نے اسے مقتولہ کا رشتہ دلا دیا۔ لڑکی بھی دکھا دی۔ وہ شخص لڑکی کے حسن سے ہی اندھا ہو گیا اور لڑکی کے خاندان اور اس کی اچھی بری شہرت کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوشش نہ کی۔ شادی ہو گئی اور لڑکی اس گھر میں آ گئی۔

لڑکی (مقتولہ) نے میٹرک پاس کی تھی جو اس زمانے میں ایک مسلمان لڑکی کے لئے بہت زیادہ تعلیم تھی۔ لڑکی بظاہر تہذیب یافتہ لگتی تھی لیکن بڑی ہی جلدی اس نے اپنے کردار سے پردہ اٹھا دیا۔ میں مقتولہ کا کردار، اس کے اوصاف اور اس کی فطرت بہت ہی اختصار سے بیان کر رہا ہوں۔ فردوسی نے تفصیلات سنا سنا کر مجھے بور کر دیا تھا۔

مقتولہ بڑی بھولی اور معصوم لگتی تھی لیکن ذہنی طور پر پختہ کار تھی۔ اس گھر میں آ کر اس نے خاوند کے سوا کسی اور فرد کو اپنا نہ سمجھا۔ مقتولہ کی ساس اور سسر شائستہ اور پروقار لوگ تھے۔ مقتولہ نے انہیں غیر اور بن بلائے مہمان سمجھ کر ان سے بدسلوکی شروع کر دی اور خاوند پر اپنے حسن اور نازنخروں کا جادو چلا کر اپنی مٹھی میں لے لیا۔ خاوند اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا۔ ایک وقت آیا کہ خاوند اپنے والدین کو برا سمجھنے لگا۔

اس لڑکی میں کچھ ابلیسی اوصاف تھے۔ مثلاً فسادی ذہنیت والی تھی۔ غیبت کو جائز سمجھتی تھی۔ جھوٹ بولنا تو اس کا بنیادی وصف تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سچ بولنا گناہ سمجھتی ہو۔ اس میں ذہنی گھٹن تھی جس نے اسے کم ظرف اور تنگ دل بنا رکھا تھا۔ اس میں خوبی صرف یہ تھی کہ خوبصورت تھی اور یہ بھی کہ چال چلن کی صاف تھی۔

ایک سال تک محلے والوں کو بھی پتہ چل گیا کہ یہ خاوند سے پیسے لے کر اور کچھ دھوکے سے مار کر اپنے ماں باپ تک پہنچا دیتی ہے پھر یہ بھی پتہ چل گیا کہ جھوٹ اور فریب کاری اس کا فیملی کیریکٹر ہے اور اس کے ماں باپ کا یہی دین دھرم ہے۔ ماں باپ نے اس کی فطرت میں اپنی فریب کاریاں سمو دی تھیں۔

وقت گزرتا گیا۔ مقتولہ کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹیاں بڑی ہوئیں تو ماں جیسی خوبصورت نکلیں لیکن ماں نے ان کی تربیت ویسی ہی کی جیسی ماں نے اس کی تھی۔ انہیں جھوٹ بولنا اور پھر جھوٹ پر قائم رہنا سکھایا۔ اپنے تینوں بچوں کے دلوں میں ان کے دادا دادی کے خلاف نفرت پیدا کی اور انہیں یہ سبق دیئے کہ ان کی کوئی بات نہیں ماننی۔

دادا دادی اپنی اپنی آئی پر مر گئے اور اولاد جوان ہو گئی۔ بیٹے کو ماں باپ نے اتنا بگاڑ

دیا کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہی وہ مجرمانہ راستوں پر چل نکلا۔ ماں نے اسے شہزادہ بنا دیا اور پھر اپنی فطرت کے سانچے میں ڈھال لیا یعنی اس کی فطرت میں بھی جھوٹ اور فریب کاری اور ضدی پن پیدا ہو گیا۔ جرائم اور جواء بازی اس کی روزمرہ زندگی کا معمول بن گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ماں کو ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا اسی عمر میں تباہ و برباد ہو گیا ہے اور معلوم نہیں کیسے برے انجام کو پہنچے۔

یہ تھا بھولا جس کے متعلق میں پہلے کافی کچھ بتا چکا ہوں۔ فردوسی نے تفصیلی باتیں کی تھیں جو میں سنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ بھولا تھانے کے ریکارڈ پر تھا اور سزایافتہ بھی تھا۔

پھر فردوسی نے مقتولہ کی بیٹیوں کے متعلق بتایا۔ بڑی بیٹی سہارنپور سے تیس پینتیس میل دور ایک شہر میں بیاہی گئی اور چھوٹی یعنی شکیلہ کی شادی سہارنپور میں ہی ہوئی۔ فردوسی نے بڑی لمبی تفصیلات سنائیں کہ یہ دونوں بہنیں اپنے اپنے سسرال جا کر کس طرح ذلیل و خوار ہوئیں۔ اس وقت تک مقتولہ کی ساس بھی اور سسر بھی فوت ہو چکے تھے۔ اب مقتولہ بالکل ہی آزاد تھی اور خاوند کو اس نے زرخرید غلام بنا رکھا تھا۔ خاوند کی سادگی اور غلامانہ ذہنیت کا یہ عالم کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

مقتولہ نے دونوں بیٹیوں کو اپنے جیسا بنا لیا تھا اور انہیں اب بھی وہی سبق دیتی تھی جو اس کی ماں اسے دیتی رہی تھی۔ سب سے بڑا اور اہم سبق یہ تھا کہ صرف خاوند کو اپنا بناؤ اور اسے پوری طرح اپنی مٹھی میں لے کر پیسے بٹورو اور گھر پہنچاتی رہو۔ جھوٹ اور فریب کاری تو انہیں خاص طور پر ماں نے سکھا دی تھی۔ پھر ہوا یہ کہ مقتولہ کو تو شریف اور بدھو خاوند اور شائستہ قسم کے ساس سسر مل گئے تھے اس لئے وہ اپنی مجرمانہ حرکتوں میں کامیاب ہو گئی لیکن دونوں بیٹیوں کو ایسے سسرال اور خاوند ملے جنہوں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ یہ لڑکیاں مخلص اور دیانتدار نہیں اور نہ ہی ان میں وہ معصومیت ہے جو نئی دلہنوں میں ہوا کرتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹیوں کے خاوندوں نے ان لڑکیوں کو لگام ڈال لی اور گھر میں ذرا سا بھی اختیار نہ دیا۔ دونوں بہنیں فطری طور پر کچھ اور تھیں لیکن آگے معاملہ بالکل ہی الٹ نکلا۔ اس کے نتیجے میں دونوں کے گھروں میں آئے دن جھک جھک ہونے لگی۔ بڑی بیٹی کے سسرال نے بڑا سخت حکم جاری کر دیا جو یہ تھا کہ اس لڑکی کا میکے جانا بالکل ہی بند کر دیا۔ مقتولہ نے شور شرابہ کیا لیکن وہ لوگ بڑے سخت ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹی کو

گھر لے جانا ہے تو طلاق لو اور لے جاؤ۔ مقتولہ نے ہار مان لی۔

چھوٹی بیٹی کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ چونکہ وہ اسی شہر میں بیاہی گئی تھی اس لئے سسرال میں ذرا سی بھی چپقلش ہوتی تو وہ ماں کے پاس آ جاتی۔ ماں صلح سمجھوتے کی بجائے اسے نئے داؤ پیچ سکھاتی اور سسرال بھیج دیتی۔

اب وہ پھر گھر آئی بیٹھی تھی۔ یہ تھی شکیلہ جس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے گھر آئی ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لڑ کر آئی ہے اور معلوم نہیں اس لڑکی کا کیا انجام ہو۔

یہاں مجھے کچھ شک ہوا کہ ایسا تو نہیں کہ شکیلہ کے سسرال نے یہ محسوس کیا ہو کہ اسے اس کی ماں سسرال میں صحیح طریقے سے بسنے نہیں دے رہی اور بات اتنی سنگین ہو گئی ہو گی کہ ان لوگوں نے شکیلہ کی ماں کو قتل کر دیا۔

یہ شک میرے ذہن میں آیا اور جلدی نکل گیا۔ اگر یہ واقعہ پنجاب کے دیہاتی علاقے کا ہوتا تو یہ شک کیا جا سکتا تھا۔ وہاں تو لوگ ذرا ذرا سی بات پر خون خرابے پر اتر آتے تھے۔ یہ سہارنپور شہر تھا جہاں کے لوگ شائستہ، تہذیب یافتہ اور امن پسند تھے۔ پھر یہ لوگ تعلیم یافتہ بھی تھے اور خاندان وقار والے بھی تھے۔

خاوند کے مرنے سے جوان ہو گئی

ایک بات نوٹ کر لیں کہ میں یہ نہیں لکھ رہا کہ فلاں واقعہ کب ہوا تھا اور کتنے عرصے بعد فلاں بات ہوئی، مطلب یہ کہ میں ماہ و سال کی پابندی نہیں کر رہا۔ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ جب مقتولہ قتل ہوئی اس وقت اس کے خاوند کو مرے چار ساڑھے چار سال گزر گئے تھے۔ میں نے فردوسی سے پوچھا کہ ان کی فیکٹری چل رہی تھی یا نہیں اور اگر چل رہی تھی تو کون اور کس طرح چلا رہا تھا۔

''فیکٹری تو چل رہی ہے حضور!'' ۔۔۔ فردوسی نے جواب دیا ۔۔۔ ''اگر بھولے پر ہوتا تو فیکٹری کبھی کی بند ہو چکی ہوتی۔ اس نے تو باپ کے مرتے ہی فیکٹری سے روپیہ پیسہ اڑانا اور عیش و عشرت میں تباہ کرنا شروع کر دیا تھا، مقتولہ نے فیکٹری کو چالو رکھا لیکن برائے نام''۔

اب فردوسی نے ایک نئی بات سنا کر مجھے چونکا دیا۔ اس نے کہا کہ فیکٹری تو برائے

نام چل رہی ہے لیکن مقتولہ کے گھر کے حالات اور اس کی اپنی زندگی دیکھتے تو آپ کہتے کہ یہ تو بہت بڑی سیٹھانی ہے جس کی آمدنی کا کوئی حساب ہی نہیں۔ فردوسی نے بتایا کہ فیکٹری کی بجائے مقتولہ نے اپنے حسن و جوانی اور اپنے دلکش جسم کو چلا لیا تھا۔ اس نے خاوند کی زندگی میں ہی ایک جواں سال مسلمان تاجر کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ یہ تاجر یہیں موجود ہے اور یہ مقتولہ کے خاوند کا دوست تھا اور ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ دیکھنے والے بتاتے تھے کہ وہ جب مقتولہ کے گھر آتا تھا تو مقتولہ خاوند کو کھڈے لائن لگا کر اس دوست کی خاطر تواضع کرتی تھی۔

وہی مقتولہ جس میں اتنی ذہنی گھٹن تھی کہ محلے کی عورتوں سے بھی ملنے ملانے سے گریز کرتی تھی، ایسی آزاد خیال ہو گئی جیسے اس نے مر کر نیا جنم لیا ہو۔ اس نے محلے کے ہر گھر میں آنا جانا شروع کر دیا اور اس میں ایسی شگفتہ مزاجی پیدا ہو گئی کہ عورتیں جیسے بھول ہی گئی ہوں کہ یہ تو بڑی جھوٹی، سیاست باز اور مکار عورت ہے۔ مختصر یہ کہ سارے محلے میں عورتیں اور کچھ مرد بھی مقتولہ کی خوش مزاجی کے گرویدہ ہو گئے۔

خاوند کی وفات کے وقت مقتولہ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے خاوند کے مرنے سے وہ جوان ہو گئی ہو۔ ہلکا ہلکا میک اپ کر کے اور نہایت اچھے کپڑے پہن کے باہر نکلتی تھی...... فردوسی جب مجھے مقتولہ کی یہ باتیں سنا رہا تھا کہ وہ جوان ہی ہوتی جا رہی تھی تو میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ عورت کس طرح بڑھاپے کی طرف جانے کی بجائے واپس جوانی کی طرف آ گئی تھی۔ وجہ بڑی صاف ہے۔ انسان بے حس اور بے غیرت ہو جائے تو اسے سب سے پہلا فائدہ یہ ملتا ہے کہ اس کی صحت نہایت اچھی ہو جاتی ہے۔ انسان حساس ہو جائے اور ذرا ذرا سی بات محسوس کرنے لگے تو وہ جلتا اور کڑھتا ہے، اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جلنا اور کڑھنا جوانی میں ہی بوڑھا کر دیتا ہے۔ فردوسی نے بتایا کہ مقتولہ نے شرم و حیا اتار پھینکی تھی لیکن شرم و حیا کی اداکاری ایسی خوبی سے کرتی تھی کہ دیکھنے والے متاثر ہو جاتے تھے۔

مقتولہ نے جسے دوست بنایا تھا وہ تاجر تھا اور اس کے باپ کی ٹھیکیداری بھی تھی۔ مقتولہ نے اس کے ساتھ کھلے عام دوستی رکھی اور اسے خوب لوٹا۔ فردوسی کے کہنے کے مطابق سارا محلہ جانتا تھا کہ مقتولہ اپنے اس ناجائز دوست سے نقد کے علاوہ کتنے قیمتی تحفے وصول کر رہی ہے۔

یہ دوستی دو اڑھائی سال چلی۔ غالباً اس جواں سال تاجر کے باپ نے یہ دوستی تڑوائی تھی۔ باپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ بیٹا کاروبار کو تباہ کر رہا ہے۔ تین چار مہینوں بعد مقتولہ کو ایک اور شکار مل گیا۔ یہ پہلے شکار سے زیادہ موٹا تھا۔ یہ نئی دوستی ابھی تک چل رہی تھی۔ اس نئے دوست کا شمار جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ شہر کے قریب سے اس کے سبزیوں اور پھلوں کے باغات شروع ہوتے تھے اور اس سے آگے اس کی زرعی زمین شروع ہو کر بہت دور جا کر ختم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں اس کے خاندان میں کوئی نواب ہو گزرا تھا یا نہیں بہر حال وہ اپنے آپ کو نوابزادہ کہلاتا تھا۔ اپنا پورا نام نوابزادہ حامد علی خان لکھتا تھا۔

میرے ساتھ اس کی دوستانہ راہ و رسم تھی۔ یہ اس لئے نہیں تھی کہ میں اسے بہت بڑا جاگیردار سمجھ کر دوست بنانا چاہتا تھا بلکہ اسے میری دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ملک احمد یار خان کا نہیں بلکہ ایک تھانیدار کا دوست تھا۔ یہ کوئی دلی دوستی نہیں تھی لیکن میں اسے دلی دوستی کا تاثر دے کر اپنا مخبر اور چغل خور بنا چکا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس قسم کے افراد پولیس کی خوشنودی کے طلبگار رہتے تھے اور تھانیداروں کی دوستی کی قیمت مخبری اور چغل خوری کی صورت میں ادا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ نوابزادہ عیاش آدمی ہے۔

اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ میں نے جب اس تھانے کا چارج لیا تھا تو یہ نوابزادہ آموں کا ٹوکرا لایا تھا جو میں نے قبول نہیں کیا تھا۔ مجھے پہلے روز ہی بتا دیا گیا تھا کہ مجھ سے پہلے کے تھانیداروں کو یہ خوب کھلاتا پلاتا تھا اور ہر تھانیدار کو اپنی مٹھی میں لے لیتا تھا۔ میں نے اسے مٹھی میں لے لیا۔

گھر کا بھیدی

یہاں مجھے یہ شک محسوس ہونے لگا کہ مقتولہ کے پہلے دوست نے رقابت کے جوش میں مقتولہ کو مروا دیا گا لیکن غور کیا تو میں اس شک سے آزاد ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ رقابت کا جوش فوری اشتعال کی طرح ہوتا ہے۔ دو اڑھائی سال گزر جانے کے بعد رقابت کا جوش دل سے نکل چکا ہوتا ہے۔ یہاں سچی محبت کا تو معاملہ ہی نہیں تھا۔ یہ ناجائز تعلقات کا معاملہ تھا۔ پہلے دوست نے مقتولہ جیسی کسی اور عورت کے ساتھ یاری لگا لی ہو گی۔ یہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔

فردوسی کا کہنا کہ نواب زادہ حامد علی خان نے تین چار جرائم پیشہ غنڈے پال رکھے تھے، میرے لئے کوئی نئی نہیں تھی۔ یہ تو میں نہایت اچھی طرح جانتا تھا۔

فردوسی سے میں نے کہا کہ کسی ایسے آدمی کو میرے پاس بھیج دو جو تم سے زیادہ باتیں بتا سکے...... وہ فوراً اٹھا اور پندرہ بیس منٹ بعد اسی محلے کا ایک اور معزز آدمی میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے بتایا کہ وہ نواب زادہ حامد کے گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔

اس آدمی نے مقتولہ اور اس کے خاندان کے متعلق سو فیصد وہی باتیں سنائیں جو فردوسی نے سنائی تھیں۔ ذرا سی بھی کمی بیشی نہیں تھی۔ اس سے فردوسی کے بیان کی خاطر خواہ تصدیق ہوگئی۔ نواب زادہ کے گھر کے جو حالات اس نے بتائے وہ یوں تھے کہ نواب زادہ کی بیوی نواب زادہ اور مقتولہ کی دوستی کے سخت خلاف تھی اور ان کے گھر میں میاں بیوی لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

نواب زادہ اور مقتولہ کی دوستی ڈھکی چھپی رہی ہی نہیں تھی۔ نواب زادہ جب چاہتا مقتولہ کے گھر جاتا اور مقتولہ کو نوابزادہ کے باغات میں جاتے اکثر دیکھا گیا تھا۔ نواب زادہ کے دو سالے تھے۔ دونوں جوان اور شادی شدہ تھے۔ وہ نوابزادہ جتنے بڑے زمیندار تو نہیں تھے لیکن ان کا زمیندارہ معمولی بھی نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ دونوں بھائی معاشرتی طور پر بھی اچھی حیثیت رکھتے تھے اور غنڈہ گردی میں ان کا ایک مقام تھا۔ اس معزز آدمی نے بتایا کہ ان کی دوستی نامی گرامی غنڈوں کے ساتھ ہے۔ ان میں اتنی طاقت اور ہمت ہے کہ نوابزادے کے خلاف بڑی سے بڑی مجرمانہ کارروائی کروا سکتے ہیں۔

یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کی نوابزادہ کے ساتھ سلام دعا اور بول چال بند ہوگئی ہے اور نوابزادہ کی بیوی لڑ جھگڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر آ جاتی ہے۔ برادری کے بزرگ اکٹھے ہو کر صلح صفائی کروا دیتے ہیں۔ نوابزادہ ایسا ڈھیٹ آدمی ہے کہ بزرگوں کے سامنے ہر شرط مان لیتا ہے مگر اس کے بعد پھر اپنی ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ پتہ چلا کہ اس نے اپنی بیوی سے ایسے الفاظ بھی کہے ہیں کہ وہ اس عورت (مقتولہ) کی دوستی سے باز نہیں آئے گا اور اگر بیوی اسے زیادہ پریشان کرے گی تو وہ اس عورت کے ساتھ شادی کر لے گا۔

اب مجھے بات بنتی نظر آنے لگی۔ نظر یہی آ رہا تھا کہ مقتولہ کو نواب زادہ حامد کے سالوں نے مروایا ہے لیکن میں انہیں کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر پکڑنا تو در کنار تھانے بھی نہیں بلا سکتا تھا یا بلانا چاہتا ہی نہیں تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو وہ چوکنے ہو جاتے اور شہادت گم

ہو جاتی۔ اگر میں ایسا اناڑی ہوتا تو نواب زادہ میرا دوست بھی تھا اور مخبر بھی۔ میں اس سے بات کرتا کہ اس کے متعلق یہ خبریں ملی ہیں اور یہ کہاں تک سچی ہیں لیکن میں نے اسے ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا۔

غالباً چار بج چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی اور اس کے ساتھ مقتولہ کی لاش بھی اس کے گھر آن پہنچی اور محلے میں شور و غل برپا ہو گیا۔ موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت ساڑھے گیارہ اور بارہ بجے رات کے درمیان لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ مقتولہ اگر اپنے آشنا کے پاس جا رہی تھی تو اس تک ابھی پہنچی نہیں تھی۔ راستے میں ہی قتل کر دی گئی۔

میں اب کہہ سکتا تھا کہ سراغ مل گیا ہے اور اب میں ملزم تک جلدی پہنچ جاؤں گا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ شہادت اور ثبوت کی فراہمی بہت ہی مشکل کام تھا۔ دونوں پارٹیاں یعنی نواب زادہ اور اس کے سالے روپے پیسے اور اثر و رسوخ والے لوگ تھے اور واردات جرائم پیشہ لوگوں نے کی ہوگی۔ بہر حال مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میرے اور خفیہ ذرائع بھی تھے۔ اب میرا وہاں بیٹھے رہنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ میں تھانے چلا گیا اور اپنے خاص مخبروں کو بلایا۔ ایسی تشریح ضروری نہیں کہ یہ خاص مخبر کیسے تھے۔

ان میں ایک مخبر اس معاملے میں بہت ہی تیز نکلا۔ وہ نواب زادہ کے ذاتی اور گھریلو حالات سے کچھ زیادہ ہی واقف تھا۔ اس نے تقریباً وہی باتیں بتائیں جو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں۔ اس شخص نے ایک کمال یہ دکھایا کہ نواب زادہ حامد کے گھر کی نوکرانی کو اگلے روز ایسے وقت میرے پاس لے آیا جب گھر میں اس نوکرانی کا کوئی کام نہیں تھا۔ نوکرانی گھر سے اس طرح نکلی کہ گھر میں کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ تھانے جا رہی ہے۔ یہ مخبر اسے تیار کر کے لایا تھا۔ یہ نوکرانی بڑی صاف ستھری عورت لگتی تھی اور اس کے بولنے کے انداز میں خود اعتمادی اور جرأت مندی تھی۔ اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان میں آپ کے کام کی بات یہ ہے کہ یہ نوکرانی نواب زادہ حامد کی بیوی کی ہمراز تھی۔

اس نے بتایا کہ نوابزادہ کی بیوی اچھے کردار اور وقار والی عورت ہے اور اس میں اتنی زیادہ جرأت ہے کہ لوگ اسے دہشت والی عورت کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ مقتولہ نواب زادہ کے باغات میں کبھی دن کو اور کبھی رات کو بھی جایا کرتی تھی۔ نواب زادہ مقتولہ کو اپنا

نوکر کی زبانی پیغام بھیجا کرتا تھا کہ فلاں وقت آنا۔ نواب زادہ نے باغات میں دو کمروں کا چھوٹا سا ایک خوبصورت مکان بنوا رکھا تھا۔ یہ مکان ایسی ہی بدمعاشیوں اور عیاشیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

تین مرتبہ ایسے ہوا کہ اِدھر مقتولہ کو پیغام پہنچا کہ نواب زادہ نے فلاں وقت بلایا ہے اور اُدھر نواب زادہ کی بیوی کو اطلاع مل گئی کہ مقتولہ اس وقت نواب زدہ کے پاس ہے۔ ان لوگوں کا گھر شہر میں ہے۔ تینوں بار ایسے ہوا کہ بیوی نے تانگہ منگوایا اور باغات والے مکان میں پہنچی لیکن تینوں بار مقتولہ جا چکی تھی۔

نواب زادہ نے ٹوہ لگائی کہ اس کی بیوی کو کون بتا دیتا ہے کہ مقتولہ آئی ہوئی ہے۔ نوکر چاکر روپے پیسے اور نواب زادہ کی خوشنودی کے لالچ میں کسی کا پردہ نہیں رہنے دیتے۔ نواب زادہ کو آخر پتہ چل گیا کہ جو نوکر مقتولہ کے پاس پیغام لے کر جاتا ہے وہی نواب زادہ کی بیوی کو بھی بتا دیتا ہے۔ نواب زادہ نے اس نوکر کی بہت پٹائی کروائی اور اسے اپنی نوکری سے نکال دیا۔

یہ عورت موت کو آواز دے رہی تھی

نوکرانی نے بھی بتایا کہ نواب زادہ اپنی بیوی کو دھمکیاں دیتا تھا کہ وہ مقتولہ کے ساتھ شادی کر لے گا۔ نوکرانی نے اس کی بیوی سے دو تین بار کہا کہ یہ عورت یعنی مقتولہ ہے ہی کیا، بدکار عورت ہے، اس کا ہی کچھ بندوبست کیوں نہیں کرا دیا جاتا۔ نواب زادہ کی بیوی نے کہا تھا کہ نواب زادہ باز نہ آیا تو اس عورت کو بیوی کے بھائی ہی راستے سے اٹھا کر ایسی جگہ پھینک دیں گے کہ وہ پھر اس راستے پر نہیں آئے گی۔

نوکرانی نے یہ بھی کہا کہ نواب زادہ کے یہ دونوں سالے کہتے تھے کہ یہ عورت اپنی موت کو آوازیں دے رہی ہے، آخر اسے ہی غائب کرنا پڑے گا۔

اس نوکرانی نے میرا دماغ روشن کر دیا۔ اس نے منت سماجت کی کہ میں پتہ نہ چلنے دوں کہ وہ یہاں آئی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اسے پردے میں رکھا جائے گا اور پھر اسے تھوڑا سا نقد انعام بھی دیا۔

اس نوکرانی نے بڑے ہی کام کی یہ بات بتائی کہ جس رات مقتولہ قتل ہوئی تھی اس دن نواب زدہ اور اس کی بیوی کا بڑا ہی زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ نواب زادہ بیوی کو یہ کہہ کر

کہ وہ اس گھر میں رہے گا ہی نہیں، باغات والے مکان میں چلا گیا تھا۔ اس نے رات بھی وہیں گزاری تھی۔ صبح پتہ چلا مقتولہ کی لاش ایک کوڑے کے ڈھیر پر پڑی ملی ہے۔

''کیا اس رات مقتولہ باغات میں گئی تھی؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں''۔۔۔ نوکرانی نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس نوکر کے بعد مقتولہ تک نواب زادہ کے پیغام کون پہنچاتا تھا؟''

''نہیں!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

اس نوکرانی سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ جس نوکر کو مار پیٹ کر نکالا گیا تھا وہ اب کہاں ہوگا۔ وہ ساڑھے تین چار میل دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے نوکرانی کو فارغ کر کے اسی وقت اس نوکر کو اپنے ساتھ لانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میں نے بھولے اور اس کی بہن شکیلہ کو ذہن سے نکال نہیں دیا تھا۔ ان سے ابھی بہت کچھ پوچھنا تھا اور کچھ شکوک میرے ذہن میں موجود تھے۔

نواب زادہ کے نکالے ہوئے جس نوکر کو میں نے بلوایا تھا وہ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے میرے کانسٹیبل کے ساتھ آ گیا۔ بہت ہی ڈرا ہوا تھا کہ نہ جانے اب کیا مصیبت آن پڑے۔ جاگیرداروں کے نوکروں چاکروں کی زندگی بڑی ہی قابل رحم ہوتی ہے۔ یہ لوگ دولت اور دھونس کے نشے میں ان غریب نوکروں چاکروں سے مجرمانہ حرکتیں کرواتے ہیں اور پکڑ دھکڑ تک نوبت آ پہنچے تو انہی کو بے یار و مددگار آگے کر دیتے ہیں۔

میں نے اس نوکر کو تسلی دلاسہ دیا۔ چائے پانی سے تواضع کی اور اس سے مقتولہ اور نواب زادہ کے تعلقات کے متعلق تفصیلات پوچھیں۔

اس نے ان باتوں کی تصدیق میں بیان دیا جو نوکرانی دے گئی تھی۔ اسے نواب زادہ کی بیوی پیسے دیتی تھی اس لئے وہ اس عورت کو بتا دیا کرتا تھا کہ اس وقت مقتولہ نواب زادہ کے پاس ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اسے معلوم ہے کہ اس کے بعد مقتولہ تک کون پیغام لے جاتا تھا۔ وہ ایک مزارعہ کی بیوی تھی۔ پیغام رسانی کا کام اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ یہ میاں بیوی اس نکالے ہوئے نوکر کے رشتہ دار تھے۔

اس سابق نوکر سے بھی میں نے بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ اس نے میرے کام کی یہ بات بتائی کہ نواب زادہ کے دونوں سالوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا۔ انہوں نے کہا

تھا کہ وہ اس طوائف کو ا ہ ادیں گے۔

مجھے اب اس عورت کی ضرورت تھی جو اس کے بعد پیغام رسانی کا کام کرتی تھی لیکن اسے میں اس طرح بلانا چاہتا تھا کہ نواب زادہ کو اور اس کے کسی بھی نوکر چاکر کو پتہ نہ چلے۔ میں نے یہ مسئلہ اس سابق نوکر کے آگے رکھا۔ اس نے کہا کہ وہ گاؤں جا کر اس عورت کو کسی بہانے بلوا لے گا اور تھانے بھیج دے گا۔

میں نے اس نوکر کے ساتھ اپنا ایک خاص آدمی کر دیا جو پولیس کا ملازم نہیں تھا' خفیہ طور پر پولیس کے لئے ہی کام کرتا تھا۔

یہ عورت اگلے روز پچھلے پہر میرے آدمی کے ساتھ آ گئی۔ اس کے ساتھ بھی میں نے بڑا اچھا سلوک برتاؤ کیا اور اسے یہ تاثر دیا کہ وہ ملزم نہیں بلکہ مجھے اس کی مدد درکار ہے۔ اس طرح اسے اہمیت دی تو وہ بے فکر ہو کر میرے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ پیغام رسانی کرتی رہتی ہے۔

میں نے اس سے قتل کی رات سے پہلے دن کے بارے میں پوچھا کہ اس روز نواب زادہ نے مقتولہ کو باغ میں بلوایا ہوگا۔ یہ خیال مجھے اس لئے آیا تھا کہ نوکرانی نے بتایا تھا کہ اس روز نواب زادہ کی اپنی بیوی کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اور نوابزادہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہے گا۔ میں نے سوچا کہ اس رات نواب زادہ نے مقتولہ کو اپنی جذباتی تسکین کے لئے ضرور بلایا ہوگا۔

اس عورت نے ذرا پس و پیش کے ساتھ بتایا کہ یہ ٹھیک ہے' نواب زادہ نے اسے کہا تھا کہ وہ مقتولہ کے ہاں جائے اور اسے کہے کہ رات یہاں ضرور آئے۔ وہ پیغام لے گئی تھی اور مقتولہ نے کہا تھا کہ وہ رات گیارہ بجے کے ذرا بعد نواب زادہ کے پاس پہنچ جائے گی۔

مجھے ایک اور خیال آ گیا جو یہ تھا کہ نواب زادہ کی بیوی کو پتہ چل گیا تھا یا نہیں کہ آج رات مقتولہ اس کے خاوند کے پاس جا رہی ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے یہ عورت مجھے اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے گی۔ میں نے پولیس والوں کی طرح پوچھا۔

''بی بی کو کس نے بتایا تھا کہ یہ عورت آج رات گیارہ بجے نواب زادہ کے پاس جا رہی ہے؟''—— میں نے پوچھا اور ساتھ ہی کہہ دیا—— ''ہاں ہاں' تم نے ہی بتایا تھا''۔

میں نے دیکھا کہ اس عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور گھبراہٹ کا تاثر نظر آنے لگا۔ میں اپنی زبان کی استادی دکھائی اور یہ عورت ڈرے ڈرے لے لہجے میں مان گئی کہ اسی

نے نوابزادہ کی بیوی کو بتا دیا تھا کہ آج یہ عورت وہاں جا رہی ہے۔ یہ بتا کر اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میری منتیں کر رہی تھی کہ میں کسی کو پتہ نہ چلنے دوں۔ وہ کہتی تھی کہ ایک نوکر کو نوابزادہ نے مار پیٹ کر نکال دیا تھا اور مجھے تو وہ قتل ہی کروا دے گا۔

''کیا بیوی اس وقت گھر سے کہیں چلی گئی تھی؟''—— میں پوچھا—— ''میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے بھائیوں سے ملی تھی یا نہیں؟''

''میں نے اسے کہیں جاتے نہیں دیکھا''—— اس نے جواب دیا—— ''میں وہاں سے اس ڈر سے جلدی اٹھ آئی تھی کہ پکڑی نہ جاؤں''۔

''اس نے کچھ تو کہا ہوگا!''—— میں نے کہا۔

''بی بی نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں آج رات اس چڑیل کا بندوبست کرتی ہوں''۔

اپنی ضرورت کی کچھ اور باتیں پوچھ کر اس عورت کو میں نے تھوڑے سے پیسے دے کر فارغ کر دیا۔

بظاہر میرے ملزم نوابزادہ کے دونوں سالے تھے لیکن پھر وہی بات سامنے آتی تھی کہ کچھ شہادت اور ثبوت بہت ضروری تھے۔ یہ بات تو اب صاف ہو گئی تھی کہ مقتولہ نوابزادہ کے باغات میں جا رہی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کی موت کا وقت ساڑھے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان لکھا گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ پورے گیارہ بجے ہی گھر سے نکلی ہو۔ کچھ دیر ہو گئی۔ اس کی لاش جس جگہ سے ملی وہاں سے اس کے گھر تک کا فاصلہ پانچ سات منٹ کا ہی تھا۔ قاتل نے اسے اس کے گھر سے کچھ زیادہ دور تک بھی نہ جانے دیا۔ اس کے چہرے پر جو ہلکا پھلکا میک اپ تھا اور اس نے اچھی قسم کے جو کپڑے پہن رکھے تھے' یہ سب نواب زادہ کے لئے ہی تھا۔ اگر وہ واپسی پر قتل ہوئی ہوتی تو موت کا وقت ایک اور دو بجے کے درمیان ہوتا۔ مجھے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ نوابزادہ تک پہنچی تھی یا نہیں۔ میرا یقین یہ تھا کہ وہاں تک وہ نہیں پہنچ سکی۔

باز آ جا ماں!

اس سوال کا جواب مجھے اگلے روز نوابزادہ حامد علی خان سے مل گیا۔ میں نے اگلے ہی روز اسے تھانے بلوا لیا۔

''نوابزادہ صاحب!''___ میں نے بغیر کسی تمہید کے اسے کہا___ ''وہ بے چاری آپ تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ آپ انتظار کرتے رہ گئے اور دشمن اپنا کام کر گئے''۔

اس اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا۔ پہلے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی پھر اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کیا کہے اور کیا کرے۔

''وہ تو وعدے کے مطابق ٹھیک وقت پر گھر سے نکلی تھی''___ میں نے کہا___ ''آپ کو معلوم ہے اسے کس نے قتل کیا ہے۔ آپ کو پہلے روز ہی میرے پاس آ جانا چاہئے تھا۔ اگر آپ کے ساتھ اس کی جائز یا ناجائز دوستی تھی تو یہ کوئی جرم نہیں۔ میں تو قتل کی تفتیش کر رہا ہوں''۔

یہ خود ساختہ نوابزادہ اپنی حیثیت کے مطابق رعب دار اور پروقار لہجے میں بات کیا کرتا تھا لیکن اس وقت لگتا تھا مر ہی گیا ہو...... ایک اور پہلو پر بھی غور کریں۔ اگر میں اس کے آموں کے ٹوکرے کھاتا رہتا اور پہلے تھانیداروں کی طرح اس کی نوازشوں تلے دبا ہوا ہوتا تو اس کے آگے میرا سر جھکا ہوا ہوتا اور یہ شخص مجھے اپنے مطلب کے مشورے دے رہا ہوتا۔

''میں سوچ رہا ہوں ملک صاحب!''___ اس نے دبی دبی آواز میں کہا___ ''ایک طرف یہ عورت ہے جو میری داشتہ تھی اور دوسری طرف میری بیوی ہے، بیوی کے بھائی ہیں۔ میں جانتا ہوں قتل انہوں نے ہی کروایا ہے''۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''___ میں نے پوچھا___ ''کیا آپ کوئی ٹھوس اشارہ دے سکتے ہیں؟''

''ہمارے نوکر بڑے خبیث ہیں''___ اس نے کہا___ ''میرا پیغام اس عورت (مقتولہ) کو دے آتے اور میری بیوی کو بھی بتا دیتے تھے۔ بیوی نوکروں مزارعوں کے ساتھ اپنے بچوں جیسا پیار کرتی ہے اس لئے ان کی دلی وفاداری اسی کے ساتھ ہے''۔

اس نے اپنے نوکروں اور نوکرانیوں کی ''غداری'' کی وہی باتیں سنائیں جو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں۔ میں انجان بن کر سنتا رہا۔ اس نے آخر میں کہا کہ اسے اپنے دونوں سالوں پر شک ہے۔ وہ ہر جگہ کہتے پھرتے تھے کہ نوابزادہ باز نہ آیا تو وہ خود باز کرا لیں گے۔

''کیا انہوں نے بتایا نہیں کہ وہ باز کرانے کے لئے کیا کارروائی کریں گے؟''___

میں نے پوچھا۔

''نہیں!''___ نوابزادہ نے جواب دیا___ ''مجھ تک ان کی جو دھمکیاں پہنچیں وہ یہی تھیں۔ اپنے نوکروں سے پتہ چلا تھا کہ میری بیوی اور وہ کہتے ہیں کہ اس عورت کو غائب کر دیں گے''۔

میرے پاس نوابزادہ کے سالوں کے خلاف سوائے شک کے اور دوسروں سے سنی ہوئی باتوں کے سوا کوئی شہادت نہیں تھی لیکن میں اور زیادہ انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نوابزادہ سے میں نے ایک آخری سوال کیا۔

''ذرا یاد کر کے بتائیں''___ میں نے پوچھا___ ''مقتولہ نے کبھی آپ کو بتایا تھا کہ آپ کی بیوی یا اس کے بھائیوں کی طرف سے اسے کوئی دھمکی ملی تھی؟''

''نہیں!''___ اس نے کہا اور چونک کر چپ ہو گیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ذرا سوچ کر بولا___ ''یاد آیا، دوبارہ مقتولہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے بھولے نے اسے کہا کہ اس کے بیٹے بھولے نے اسے کہا ہے کہ نوابزادہ کے ہاں جانا چھوڑ دو۔ پہلی بار ماں نے کچھ باتیں کہہ کر ٹال دیا لیکن دوسری بار بھولے نے ماں کو دھمکی دی کہ اس نے نوابزادہ سے ملنا نہ چھوڑا تو وہ اس کا گلا گھونٹ دے گا''۔

''ماں اپنے بیٹے کی اس دھمکی پر پریشان ہو گی!''___ میں نے کہا___ ''اس نے کچھ تو کہا ہو گا!''

''کچھ بھی نہیں''___ نواب زادہ نے کہا___ ''اتنا ضرور کہا تھا کہ چرس کے نشے میں ایسی ہی باتیں کیا کرتا ہے''۔

نواب زادہ نے مجھ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ مقتولہ نے اپنے بیٹے کی دھمکی کو ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی لیکن میری سراغرسانی کی حس بیدار ہو گئی۔ میں بھولے کی ہسٹری جانتا تھا۔ کوئی یہ کہتا کہ اپنی ماں کا قاتل اس کا بیٹا بھولا ہی ہے تو میں ذرا سا بھی حیران نہ ہوتا۔ عام لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں میں غیرت ہوتی ہی نہیں۔ آج کل کا معاملہ کچھ اور ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت جرائم پیشہ لوگ اپنے آپ کو اسی طرح باعزت اور باغیرت سمجھا کرتے تھے جس طرح شریفانہ پیشوں کے لوگ اپنے آپ اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ شریف آدمی کی غیرت پر زد پڑتی تو وہ شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرتے تھے لیکن جرائم پیشہ لوگ فوری اور انتہائی برا انتقام لیتے تھے۔

میں نے بھولے کو اپنے ذہن میں ایک اہم مشتبہ قرار دے لیا اور یہ سوچ لیا کہ تھوڑی سی شہادت مل جائے تو اسے شامل تفتیش کرلوں گا۔

نواب زادہ کو میں نے چلتا کیا اور اس کے دونوں سالوں کو تھانے بلوایا۔ نواب زادہ کی بیوی کو بھی تھانے طلب کرنا تھا لیکن میری کوشش یہ تھی کہ وہاں تک نوبت نہ آئے۔

گھنٹے سوا گھنٹے تک دونوں بھائی آ گئے۔ نواب زادہ کے ساتھ میری اتنی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ کچھ باتیں ذہن سے نکل ہی گئیں۔ اس کے دونوں سالوں کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے نواب زادہ کو اس کے ان سالوں کی دھمکیاں یاد دلائی تھیں اور پوچھا تھا کہ ان میں اتنی جرأت اور ہمت ہے کہ قتل کی واردات کرسکیں؟

''ہاں صاحب!''۔۔۔ نواب زادہ نے کہا تھا۔۔۔ ''ہیں تو ہمت والے لوگ لیکن اتنی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے کہ میری دوست کو قتل کر دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے پاس روپیہ پیسہ بھی ہے، پولیس کے ساتھ بھی میری دوستی ہے اور ضلعے کا ڈپٹی کمشنر بھی میرے ہاتھ میں ہے اور پھر غنڈوں اور بدمعاشوں کی جو طاقت میرے ہاتھ میں ہے اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتے''۔

یہ نواب زادہ کی بات تھی لیکن ستایا ہوا اور زخم خوردہ آدمی وقتی طور پر عقل کا اندھا اور دلیر ہو جایا کرتا ہے...... میں نے دونوں بھائیوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ امیر زمیندار تھے اس لئے چہروں پر رونق تھی اور گھبراہٹ یا تذبذب کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔ میں نے دونوں بھائیوں سے دوستانہ انداز میں بات کی۔

''ایک بات غور سے سن لیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اگر تم دونوں کو یہ خیال ہے کہ نواب زادہ حامد علی خان میرا دوست ہے اور بڑا جاگیردار ہے اور میں اس کا اثر قبول کروں گا تو یہ خیال ذہن سے نکال دیں۔ میں تو انگریزوں کا بھی لحاظ نہیں کیا کرتا جن کا میں نوکر ہوں۔ اگر تم دونوں سچ بولو گے تو مجھ سے فائدہ اٹھاؤ گے اور اگر میرے ساتھ ہیرا پھیری کرو گے تو پھر معاملہ کچھ اور ہو جائے گا۔ ذرا اس پر بھی غور کرو کہ میری نگاہ میں نواب زادہ کی بیوی بھی مشتبہ ہے۔ یہ خاتون تمہاری بہن ہے۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ میں اسے بھی تھانے بلواؤں لیکن میں خود عزت اور غیرت والا مسلمان ہوں، پوری کوشش کروں گا کہ ایک معزز خاتون تھانے نہ چڑھے۔ تمہاری تو وہ سگی اور بڑی بہن ہے۔ اس کی عزت کا خیال رکھنا''۔

''ہم جانتے ہیں صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں''۔۔۔ بڑے بھائی نے کہا۔۔۔ ''ہم دونوں آپ کے مشتبہ ہیں۔ آپ نے ہمیں سچ بولنے کو کہا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ آپ کو یقین دلا سکیں کہ ہم جو بیان دے رہے ہیں یہ سچ ہے''۔

میں نے بڑے بھائی کو اپنے پاس بیٹھا رہنے دیا اور چھوٹے کو باہر بھیج دیا۔ چھوٹے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی نوعمر لڑکا تھا، وہ ستائیس اٹھائیس سال کا جوان آدمی تھا۔

نوابزادہ کسی اور عورت کو پھانس لیتا

میں نے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا اور وہ جو جواب دیتا تھا میں اس میں سے کوئی اور بات نکال لیتا اور اس طرح اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کرتا اور بات سے بات نکالتا چلا گیا۔ یہ شخص ذرا سا بھی نہ گھبرایا۔ ہر سوال کا جواب پورے اعتماد کے ساتھ دیتا تھا۔

میں اسے کہہ رہا تھا کہ دونوں بھائیوں نے اور ان کی بہن نے دھمکیاں دی ہیں کہ وہ اس عورت کو غائب کر دیں گے۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ کئی بار ایسے الفاظ کہہ چکا ہے کہ اس عورت کو غائب کرا دے گا اور اس نے اپنی بہن یعنی نواب زادہ کی بیوی سے بھی کہا تھا کہ وہ اس کا مسئلہ اس طرح حل کرے گا کہ اس عورت کو ہی راستے سے ہٹا دے گا۔

''لیکن صاحب!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''ہم دونوں بھائی اپنی بہن کی تسلی کے لئے غائب کرانے والی بات کہا کرتے تھے۔ اگر ہم نے یہ کام کرنا ہوتا تو سال ڈیڑھ سال پہلے اس وقت ہی کر دیتے جب ہمیں پتہ چلا تھا کہ نواب زادہ نے اس عورت کو داشتہ بنا لیا ہے۔ ہم تنا لمبا انتظار نہ کرتے۔ ہمیں غصہ تو بہت تھا لیکن اپنی عقل کو ہم نے ٹھکانے رکھا ہوا تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ اس ناجائز دوستی میں اس عورت کا کوئی قصور نہیں۔ اس عورت نے اپنے آپ کو زبردستی نواب زادہ پر مسلط نہیں کیا تھا۔ کوئی شخص طوائفوں کے بازار میں جاتا ہے تو اس میں طوائفوں کا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ سارا قصور نواب زادہ صاحب کا تھا۔ انہیں اپنی بیوی کا خیال ہوتا تو اس عورت کو اپنے باغات میں داخل ہی نہ ہونے دیتے۔ یہاں تو یہ حال رہا ہے کہ نواب زادہ صاحب اس عورت کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔ اگر اس عورت کو ہم قتل کر دیتے تو نواب زادہ ایسی کسی اور عورت کو پھانس لیتا......

''یہ تو نواب زادہ صاحب کا شغل ہے۔ اس عورت کی دوستی سے پہلے بھی نواب زادہ صاحب ایسی ہی عیش وعشرت میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن فرق یہ تھا کہ نواب زادہ صاحب

نے کسی عورت کے ساتھ اس طرح دوستی نہیں رکھی تھی جس طرح اس عورت کے ساتھ رکھی۔ اگر قتل ہی کرنا ہوتا تو ہم نواب زادہ صاحب کو کرتے۔ کئی بار نواب زادہ صاحب اور ہماری بہن کے درمیان اتنی ناچاقی ہوئی کہ وہ گھر آ بیٹھی اور بزرگوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ نواب زادہ صاحب ہماری بہن کو طلاق ہی دے دیں۔ انہوں نے یہ بھی نہ مانا''۔

میں نے اپنے تجربے اور عقل سے کام لیتے ہوئے اس شخص کے قدم اکھاڑنے کی بہت کوشش کی لیکن میں ناکام رہا۔ پھر میں نے ایک اور زاویے سے حملہ کیا اور اس میں مقتولہ کے بیٹے بھولے کا بھی ذکر آ گیا۔

''ہاں...... ایک بات یاد آ گئی ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''بھولے کو میں نے اور میرے بھائی نے بھی اس عرصے میں تین یا شاید چار مرتبہ کہا تھا کہ تم اتنے بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو اور اپنے گھر کا تمہیں پتہ نہیں کہ تمہاری ماں کس طرح خاندان کی عزت لٹا رہی ہے۔ پہلے دو تین مرتبہ تو بھولا بالکل ہی چپ رہا اور اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے آخری بار اسے کہا کہ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری ماں پر جھوٹا الزام لگا رہا ہوں تو اپنی ماں کی نگرانی کرواو اور اپنی آنکھوں دیکھو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ......

''تیسرے دن بھولا مجھے ملا۔ وہ کوئی بات کہنا چاہتا تھا لیکن بول نہیں رہا تھا۔ میں جانتا ہوں بھولا بڑی جرأت اور دلیری والا بدمعاش ہے لیکن ہمارے سامنے وہ سر نہیں اٹھا سکتا۔ میں نے اسے چپ دیکھا تو کہا، کیا بات ہے بھولے، اگر میں نے جھوٹ بولا تھا تو صاف کہہ دو پھر دیکھنا کہ میں تمہاری ماں کو اس دنیا سے کس طرح اٹھاتا ہوں......

''اس وقت بھولا سر اٹھا کر بولا''۔۔۔ یہ کام میں کروں گا، تمہیں یہی بتانے آیا تھا''۔۔۔ یہ کہہ کر بھولا چلا گیا اور میں نے اس کی بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں نے سوچا کہ چرسی بھنگی آدمی ہے، ویسے ہی بڑ مار گیا ہے۔ یہ بھی سوچا کہ اس نے یہ بات مجھے خوش کرنے کے لئے میرے ڈر سے کہی ہے کہ میرا منہ بند رہے''۔

''یہ کب کی بات ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''یہی کوئی پانچ چھ دنوں کی بات ہے''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ بھولا یوں کہتا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بے غیرت آدمی ہے، ماں کی کمائی کھاتا رہے گا اور کرے گا کچھ بھی نہیں۔ میرے بھائی نے کہا کہ بھولے کو وہ مجھ سے زیادہ

جانتا ہے، بھولا جو کہہ چکا ہے وہ کر کے بھی دکھا دے گا''۔

''قتل کی رات بھولا ساری رات گھر سے باہر رہا تھا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ہو سکتا ہے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں نواب زادہ کے ہاں جا رہی ہے''۔

''یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میری عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ میں اپنی بات کر سکتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتبار آتا ہے یا نہیں''۔

بھولے پر میرا شک پختہ ہی ہوتا جا رہا تھا لیکن ابھی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس بھائی کو باہر بھیج کر اس کے چھوٹے بھائی کو بلایا اور پھر پوچھ گچھ کا وہی سلسلہ شروع کر دیا جو اس کے بڑے بھائی سے ہو چکا تھا۔ اس کا بیان اور ہر سوال کا جواب بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس کے بڑے بھائی کا تھا۔ میں نے اسے دھوکا دینے کی بھی کوشش کی۔ وہ اس طرح کہ اس کے کسی جواب پر میں نے کہا کہ تمہارا بھائی تو یوں کہتا ہے اور تم کچھ اور ہی کہہ رہے ہو۔ اس نے پورے اعتماد سے اور زیادہ پختہ آواز میں کہا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میرا بھائی کوئی غلط بات کہہ دے۔

مجھے اتنا تجربہ تو تھا کہ یہ پتہ چل جاتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اس نے میرا دماغ کچھ اور زیادہ روشن کر دیا۔ وہ اس طرح کہ میں نے اس سے پوچھا کہ بھولے نے کیا اسے بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو دنیا سے اٹھا دے گا؟

''ہاں جناب!''۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ''اس نے جب یہ الفاظ کہے تھے تو میں نے اسے اس کی ماں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور یہاں تک کہا کہ تمہاری ماں تمہاری بہن کو بھی اپنے راستے پر چلا رہی ہے یا چلانے کی کوشش کر رہی ہے''۔

''تم نے اس کا کچھ اثر دیکھا تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''جی ہاں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے بڑا صاف اثر دیکھا تھا۔ کہتا تھا کہ پہلے میں اپنی آنکھوں دیکھ لوں کہ میری ماں نواب زادہ کے ہاں جاتی ہے...... میں نے اسے بتایا کہ نواب زادہ کے مزارعوں کی ایک عورت ہے جو تمہاری ماں کے پاس نواب زادہ کا پیغام لے کر جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں اسے اس عورت کا نام بتا دوں۔ میں نے بتا دیا۔ معلوم نہیں آپ کو کسی نے یہ بتایا ہے کہ نہیں کہ یہ عورت نواب زادہ کے پیغام لے کر جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہماری بہن کو بھی بتا دیتی تھی۔ غریب عورت ہے۔ دونوں اطراف

سے کمارہی ہے''۔

''کیا بھولا اس عورت سے ملا تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے معلوم نہیں''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

اس بھائی کے بیان سے بات کچھ اور زیادہ صاف ہوگئی تھی لیکن میں ایسا اناڑی بھی نہیں تھا کہ کسی نے کچھ کہہ دیا اور میں ادھر کو ہی اٹھ دوڑا۔ سب سے پہلے تو مجھے اس عورت کو بلانا تھا۔ اس سے تصدیق کرا کے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ اس بھائی کو بھی میں نے فارغ کر دیا اور ایک کانسٹیبل کو اس عورت کا نام بتا کر بھیجا کہ اسے ساتھ لے آئے۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ عورت میرے پاس آ چکی تھی اور اس نے بڑا صحیح اور سچا بیان دیا تھا۔

اپنے کرتوت سے باز نہ آئی

یہ عورت آ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور میں نے پوری رات تفتیش جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس عورت سے میں نے پوچھا کہ اس نے کیا بھولے کو بتایا تھا کہ آج رات اس کی ماں نواب زادہ کے پاس جا رہی ہے؟...... اس نے بلا پس و پیش کہا کہ بھولے کو اس نے بتایا تھا۔

''کیا بھولا تمہیں پہلے سے جانتا تھا؟''

''نہیں جی!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میرے خاوند کو کوئی آدمی ملا تھا۔ خاوند کے کہنے پر میں بھولے سے ملی تھی۔ بھولے نے جو پوچھا وہ میں نے بتا دیا''۔

مجھے زیادہ تفصیلات کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اس عورت نے بھولے کو بتایا تھا کہ آج رات اس کی ماں اپنے آشنا کے پاس جا رہی ہے۔

اس عورت کو میں نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ بھولا جہاں کہیں بھی ہے اسے ساتھ لے آئے۔ دوسرے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ بھولا تھانے آ جائے تو اس کی بہن کو اس طرح تھانے لے آئے اور ایک طرف بٹھا دے کہ بھولے کو معلوم نہ ہو سکے۔

امید نہیں تھی کہ بھولا گھر سے ہی مل جائے گا۔ وہ گھر مل گیا۔ وہ جونہی تھانے پہنچا دوسرا ہیڈ کانسٹیبل اس کے گھر جا کر اس کی بہن شکیلہ کو لے آیا اور الگ ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ میں نے اپنا کھانا وہیں منگوا لیا تھا۔ اس رات گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بھولے سے اس کے اس دوست کا نام پوچھا جس کے گھر وہ قتل کی رات تاش کھیلتا رہا اور وہیں سو گیا تھا۔ پھر اس کے ان دوستوں کے نام اور پتے پوچھے جو اس کے ساتھ تاش کھیلتے رہے تھے۔ ان کی تعداد بھولے کو نکال کر چار تھی۔ ایسے کانسٹیبل مل گئے جو انہیں جانتے تھے۔ یہ سب چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے لوگ تھے اس لئے کانسٹیبل انہیں جانتے تھے۔ ان کے آنے تک بھی بھولے کو ایک کانسٹیبل کے حوالے کر کے کانسٹیبلوں کی بیرک میں بٹھا دیا۔ شکیلہ کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ اس کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کی باتیں کیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی بڑی بہن بھی آئی ہوئی ہے۔ وہ ماں کے قتل پر آئی تھی اور ابھی اس نے یہیں رہنا تھا۔

میں نے پہلے بتایا کہ شکیلہ خوبصورت لڑکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی اخلاقی لحاظ سے ماں جیسی ہی ہوگی اور شاید یہی وجہ ہے کہ سسرال میں اس کی بنتی نہیں اور اکثر ماں کے پاس آتی رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ خاوند کو اس سے کیا شکایت ہے کہ وہ اسے ماں کے پاس بھیج دیتا ہے۔

''کوئی ایسی بڑی شکایت نہیں''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''چھوٹی موٹی شکایتیں اور ناراضگیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں لیکن میرا معاملہ ایسا ہے کہ ذرا سی بات بہت بڑی بنالی جاتی ہے''۔

''کون بناتا ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''تمہارے سسرال والے بناتے ہوں گے؟''

''نہیں جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میری ماں...... میری ماں سے تو میری ساس اچھی ہے''۔

میں نے خاص طور پر دیکھا کہ شکیلہ ذہنی لحاظ سے نارمل حالت میں نہیں تھی۔ ماں کے مرنے کا غم تو تھا ہی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اور بات بھی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اور زیادہ ہمدردی اور شفقت کا اظہار کیا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اسے کہا کہ اس کے اندر کوئی غبار بھرا ہوا ہے اور یہ غبار میرے آگے نکال دے۔ ایسی ہی کچھ اور باتیں کر کے میں نے اسے اپنے زیر اثر لے لیا۔ میں نے کہا کہ ماں کا غم اسے زیادہ پریشان کر رہا ہے اور وہ اس صدمے کو اپنے مستقبل کی خاطر برداشت کرنے کی کوشش کرے۔

''ماں کے مرنے کا غم تو ہے''۔۔۔ اس نے بڑی ہی اداس آواز میں کہا۔۔۔ ''لیکن

میرے دل کی بات پوچھیں تو میں کہوں گی کہ ماں کی موت میرے مستقبل کے لیے اچھی ہی ہوگی''۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس کا سینہ بڑے ہی زہریلے غبار سے بھرا ہوا تھا۔ میرے ہمدردانہ اور مشفقانہ رویے سے وہ اتنی متاثر ہوئی کہ وہ بھول ہی گئی کہ تھانے میں ایک تھانیدار کے پاس بیٹھی بیان دے رہی ہے۔ اس نے بڑی لمبی بات سنادی جو مختصراً اس طرح ہے کہ ماں نے اس کی شادی تو کر دی لیکن اسے سبق اس طرح کے دیئے کہ سسرال میں صرف اپنے خاوند کو اپنا سمجھے اور باقی سب کے ساتھ ایسا سلوک کرے جیسے وہ اس گھر میں بن بلائے آن گھسے ہوں۔ اس نے بتایا کہ ماں نے دونوں بہنوں کو کم عمری میں ہی یہ سبق دینے شروع کر دیئے تھے کہ اصل چیز پیسہ اور ذاتی مفاد ہے اور اس کے لئے جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا بالکل جائز ہے۔

شکیلہ نے گھر میں ماں کو دیکھا تو کہ وہ اس کے باپ کو کس طرح اپنے قبضے میں رکھتی اور اپنی ہر بات منواتی تھی۔ ماں خوبصورت تھی اور اس خوبصورتی کو ماں بڑی کامیابی سے استعمال کرتی اور شکیلہ کے باپ کو الو بنائے رکھتی تھی۔ شکیلہ اور اس کی بڑی بہن نے ماں کو جھوٹ بول کر اپنا مطلب نکالتے دیکھا تو وہ سمجھی کہ یہ سب مکاری اور عیاری جائز ہے اور یہی اصل زندگی ہے۔

بچوں کو وعظ اور لیکچر کے انداز سے پند و نصیحت کرتے رہو لیکن ان کا کردار اسی سانچے میں ڈھلتا ہے جو وہ ماں باپ کو عملاً کرتے دیکھتے ہیں۔ شکیلہ اور اس کی بہن کے خیالات اور ان کا کردار ماں کا رنگ پکڑتا گیا۔ ماں نے ان لڑکیوں کے ساتھ یہ زیادتی کی کہ انہیں محلے کی لڑکیوں کے ساتھ ملنے جلنے ہی نہ دیا اور خود ہی ان پر چھائی رہی۔ لڑکیوں کو سکول تو بھیجا، تعلیم اچھی دلائی لیکن بڑی سخت پابندی رکھی کہ لڑکیاں سکول جائیں پھر سیدھی واپس گھر آئیں اور کسی سہیلی کے گھر نہ جائیں۔

شکیلہ نے دیکھا تھا کہ ماں نے کیسی کیسی استادیاں چلا کر اور جھوٹ بول بول کر اس کے باپ کو، باپ کے والدین اور رشتہ داروں سے بالکل ہی الگ کر لیا تھا...... زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اپنے محلے یا گاؤں میں ایسی کوئی نہ کوئی عورت ضرور دیکھی ہوگی۔

دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں۔ شکیلہ نے بتایا کہ دونوں بہنوں نے سسرال میں جا

کر ویسا ہی رویہ اختیار کر لیا جیسا انہوں نے ماں کا دیکھا تھا اور بچپن سے دیکھتی جوان ہوئی تھیں۔ انہیں صحیح راستہ دکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ شکیلہ کا باپ تو شریف اور بدھو آدمی تھا، وہ مقتولہ کی انگلیوں پر ناچتا رہا اور اس کے ماں باپ اور دیگر لواحقین شرافت سے اس سے الگ ہو گئے لیکن دونوں بہنوں کے سسرال کچھ اور قسم کے نکلے۔ انہوں نے لڑکیوں کو لگام ڈال لیں۔

میں یہ تفصیلات پہلے ایک معزز فرد امتیاز فردوسی کی زبانی سنا چکا ہوں۔ اب میں مقتولہ کے مرنے کے بعد کی بات کرتا ہوں۔ شکیلہ نے سنایا کہ اسے اپنے خاوند سے اور خاوند کو اس سے بے پناہ دلی محبت ہے لیکن ماں نے اس کا دماغ اپنے سانچے میں ڈھال رکھا تھا اس لئے وہ ایسی کشمکش میں مبتلا رہنے لگی تھی جو اسے چین کی نیند سونے بھی نہیں دیتی تھی۔ شکیلہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حصہ ماں کا مرید تھا اور دوسرا حصہ خاوند کی محبت میں گرفتار تھا۔

شکیلہ کی ساس کوئی بری عورت نہیں تھی لیکن شکیلہ کی ماں اس کے دماغ میں یہ ڈالتی تھی کہ اس کی ساس بہت بری عورت ہے۔ شکیلہ کو ماں یہ سبق دیتی تھی کہ خاوند کی آمدنی سے پیسے اُڑا کر گھر لے آیا کرو۔ شکیلہ یہ حرکت کرتی تھی لیکن اسے خوشی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ضمیر پر جرم کا بوجھ پڑ جاتا تھا کہ وہ اتنے پیارے خاوند کو دھوکہ دے رہی ہے۔

یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی کس چکر میں پس رہی ہے۔ مجھے اس کی ان گھریلو باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے اپنی مٹھی میں رکھنے کی خاطر سنتا رہا اور پھر میں اسے اس جگہ لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا۔

''وہ تو تمہیں کسی اور راستے پر بھی چلانا چاہتی تھی'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''معلوم نہیں تم نے اس کی یہ بات مانی تھی یا نہیں''۔

''کون سی بات؟''

''تمہیں معلوم ہی ہوگا'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''ان دنوں اس کی دوستی ایک بڑے امیر کبیر جاگیردار کے ساتھ چل رہی تھی''۔

''معلوم ہے'' ـــــ شکیلہ نے کہا ـــــ ''ابھی اس نے مجھے ایسی کوئی بات کہی تو نہیں تھی لیکن میں اس کی نیت سمجھ گئی تھی۔ یہ اس طرح ہوا کہ دو مرتبہ یہ جاگیردار نواب زادہ ہمارے گھر آیا۔ میری ماں دونوں بار اس طرح باہر نکل گئی جیسے اسے اچانک کوئی کام یاد آ گیا ہو۔

پہلی بار تو میں نے اس شخص کو ذرا سی بھی لفٹ نہ کرائی۔ ماں میرے آگے اس کی بہت تعریفیں کیا کرتی تھی کہ بڑا ہی مخلص اور نیک آدمی ہے......

''دوسری بار وہ آیا تو پہلے سے زیادہ بے تکلف ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے میرے ہونٹ چوم لئے۔ پہلے کی طرح ماں باہر نکل گئی تھی۔ مجھے اس شخص کی یہ حرکت بہت بری لگی اور میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے ماں سے تو کچھ نہ کہا، بھولا گھر آیا تو اسے الگ کر کے بتایا۔ بھولا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے ماں سے کہا کہ آئندہ یہ شخص اس گھر میں نہ آئے ورنہ میں اس کا بھی اور تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ ماں نے بھولے کو بڑے پیار سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ چپ تو ہو گیا ٹھنڈا نہ ہوا''۔

''قتل کی رات یاد کرو''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا اس رات بھولا گھر تھا یا باہر چلا گیا تھا؟''

''ساری رات گھر نہیں آیا''۔۔۔ شکیلہ نے جواب دیا۔۔۔ ''ماں کے ساتھ تو اس نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ بھولے کے منع کرنے کے باوجود ماں اپنی کرتوت سے باز نہیں آئی۔ قتل کے روز میں نے آپ کے آگے جھوٹ بولا تھا کہ ماں رات کو بھولے کو ڈھونڈنے نکل جاتی ہے۔ میں نے اس رات اٹھ کر ماں کو بستر سے غائب پایا اور اس کے گھر والے کپڑے پلنگ پر پڑے دیکھے تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کہاں گئی ہے''۔

شکیلہ کے اس بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ بھولا ماں کی اس دوستی پر سخت بھڑکا ہوا تھا، یہاں تک کہ ماں کے ساتھ بول چال بند کر دی تھی اور گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ شکیلہ کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ رات کے وقت جوان لڑکی کا اکیلے گھر جانا مناسب نہیں تھا۔

میں نے عہد پورا کر دیا

شکیلہ کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ وہ آدمی آئے ہیں یا نہیں جن کے ساتھ بھولا تاش کھیلتا رہا تھا۔ ان میں سے تین آ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ کسی ایک کو میرے پاس بھیج دیں۔ ایک جواں سال آدمی میرے سامنے آیا۔ یہ چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والا آدمی تھا۔ ایسے وارداتئے ایک تھانیدار کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھولا ان کے ساتھ تاش کھیلتا رہا تھا؟...... اس نے بتایا کہ وہ تاش کھیلتے

رہے تھے اور پھر بھولا وہیں سو گیا تھا۔

پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس رات وہ خوش تھا یا ناراض تھا یا اس کا مزاج کیسا تھا۔

''یہ تو میں نے ٹھیک طرح نہیں دیکھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''یہ ضرور دیکھا کہ اس رات اس نے بہت ہی زیادہ چرس پی لی تھی اور نشے کی حالت میں تاش کھیلتا رہا تھا''۔

''کیا وہ ہیں سو گیا تھا؟''

''سب سے پہلے میں سویا تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میں صبح اٹھا تو بھولا وہاں نہیں تھا''۔

دوسرے آدمی کو بلایا۔ اس نے بتایا کہ تاش کھیلتے کھیلتے بھولا اٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ سب یہیں رہنا میں ابھی واپس آتا ہوں۔ پھر وہ کچھ دیر بعد آ گیا اور وہیں سو گیا تھا۔

''وقت کیا تھا؟''

''ہم میں سے کسی کے بھی پاس گھڑی نہیں تھی''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''میرا اندازہ ہے کہ بارہ بجے سے پہلے کا ٹائم تھا''۔

''وہ جب واپس آیا تو اس نے کچھ کہا تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کس موڈ میں تھا یا وہ نشے میں جھوم رہا تھا''۔

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا، یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا، کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ بھولے نے کہا تھا کہ یہ کسی کو پتہ نہ چلنے دینا کہ میں باہر نکلا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے کہ وہ باہر نکلنے کو راز میں رکھنا چاہتا ہے؟ اس نے غصے سے کہا کہ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔

تیسرے آدمی کو بلایا۔ اس نے بھی بالکل ایسا ہی بیان دیا۔

اس کے بعد میں نے بھولے کو بلایا۔ اس وقت بھی وہ چرس پئے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پہلے تو بڑے پیار کے ساتھ باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ کچھ بے تکلف کر لیا۔ ''بھولے یار!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس حرامزادے نواب زادے کا گلا بھی گھونٹ دیتے تو مجھے بہت خوش ہوتی''۔

''مجھے پھانسی چڑھا کر آپ کیوں خوش ہوتے ہیں؟''۔۔۔ اس نے بڑے شگفتہ لہجے

میں کہا۔

''جہاں ایک کو گلا گھونٹ کر مارا ہے وہاں اس پاپی کو بھی ختم کر دیتے''۔۔۔ میں نے کہا۔

''میں نے کسی کا گلا نہیں گھونٹا''۔۔۔ بھولے نے کہا۔۔۔ ''آپ صاف بات کریں''۔

''میں شک شبے کی بات نہیں کر رہا بھولے!''۔۔۔ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔۔۔ ''تم نے اپنی ماں کا گلا گھونٹا ہے۔ تمہیں اس وقت بلایا ہے جب میرے پاس پوری شہادت آ گئی ہے۔ اقبالی بیان دے دو......''

''اور پھانسی چڑھ جاؤ''۔۔۔ بھولے نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''سن بھولے!''۔۔۔ میں نے ہاتھ لمبا کر کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔۔۔ ''تم پھانسی کی بات کرتے ہو، میں تمہیں عمر قید بھی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ایک مسلمان بھائی کا وعدہ ہے''۔

میں نے اسے اس کے خلاف شہادت کی کچھ جھلکیاں دکھائیں اور ایسی باتیں کہیں کہ وہ بول پڑا۔ اسے کوئی دھمکی نہ دی نہ کوئی لالچ دیا بلکہ اس کی غیرت مندی کی تعریفیں کیں اور اس کے جذبات کو اتنا بھڑکایا کہ وہ بول پڑا۔

اقبالی بیان دیتے ہوئے اس نے اپنی ماں کی وہی خصلتیں اور وہی فطرت بیان کی جو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اسے ماں نے جس طرح بگاڑا، خراب کیا، جھوٹ اور مکاری سکھائی، وہ سب اس نے سنایا اور اپنی بربادی کا ذمہ دار ماں کو ٹھہرایا اور پھر جو بات اسے پاگل کر گئی وہ ماں کی ناجائز دوستی تھی اور ماں اس کی بہن کو بھی اس نواب زادہ کی داشتہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے تسلیم کیا کہ مزارعہ کی بیوی نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کی ماں رات گیارہ بجے کے بعد نواب زادہ کے ہاں جا رہی ہے۔ اس نے اس لئے چرس بہت زیادہ پی لی تھی کہ ماں کو دیکھ کر اس کا ہاتھ رک نہ جائے۔ وہ صحیح وقت پر تاش کھیلتے ہوئے اٹھا اور گلی کی نکڑ پر جا چھپا۔ اس نے ماں کو گلی میں آتے دیکھا۔ بھولا پیچھے ہٹ گیا۔ ماں گلی کا موڑ مڑ گئی تو بھولے نے پیچھے سے اس کا گلا دونوں ہاتھوں میں دبوچا۔ ماں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بھولے کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ بھولے کے ہاتھوں کا شکنجہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس کی ماں کے

دونوں ہاتھ نیچے گر پڑے تو بھولے نے ماں کو گرنے نہ دیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ماں مر چکی ہے۔ اسے بھولے نے کندھے پر ڈالا اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر چڑھ کر لاش وہاں پھینکی اور اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔

میں نے بھولے کو حوالات میں بند کر دیا۔ اگلے روز اس نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان لکھوا دیا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اسے زیادہ سزا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے فوری اشتعال کا مقدمہ بنایا یعنی قتل کا باعث فوری اشتعال لکھا اور تمام شہادت اس طرح تیار کی جس سے فوری اشتعال ثابت ہوتا تھا۔ اس کی بہن کی گواہی بھی ڈلوائی کہ ماں اسے بھی نواب زادہ کی داشتہ بنانا چاہتی تھی اور نواب زادہ کے دونوں سالے اور اس کی بیوی بھی عدالت میں آئے اور مقتولہ اور نواب زادہ کے ناجائز تعلقات ثابت کئے تھے۔

یہ کوئی پولیس آفیسر ہی سمجھ سکتا ہے کہ ایسا مقدمہ تیار کرنے میں کس قدر محنت اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر حال میں نے اپنا عہد پورا کر دیا اور بھولے کو صرف پانچ سال سزائے قید دی گئی۔ بھولے کے وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ اپیل ڈویژن بنچ نے سنی۔ ایک جج ہندو اور دوسرا اینگلو انڈین تھا۔ انہوں نے سزا میں تخفیف کر کے پانچ سال کی بجائے تین سال کر دی۔

+ + +

آہ جو دل سے نکلی

میں نے آپ کو دل سے قبول نہیں کیا لیکن میں، آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرا جسم آپ کا ہے، آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن جذباتی طور پر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔

دِلی کی سی آئی اے (کرائمز برانچ) میں ایک انگریز ایس پی کہیں سے تبدیل ہو کر تعینات ہوا۔ اس کا نام پی ایل تھامسن تھا لیکن پولیس کے ہم ہندوستانی افسر ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے انگریز بھائی بند بھی اسے باسٹرڈ کہا کرتے تھے۔ باسٹرڈ کے معنی آپ جانتے ہوں گے...... وہ شخص جو اپنے باپ کا نہ ہو...... ایس پی تھامسن بہت ہی سخت طبیعت افسر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی تھی۔ ڈسپلن کا اتنا سخت کہ اپنے ماتحتوں کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ کسی مجبوری کے تحت کسی سے ذرا سی کوتاہی ہو جاتی تو مجبوری کو تسلیم کر کے بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ صرف ماتحتوں کے ساتھ اس کا یہ رویہ نہ تھا، وہ ڈی آئی جی اور آئی جی کے بھی گلے پڑ جایا کرتا تھا۔

اس کے اس رویے کی وجہ یہ تھی کہ ہر وقت اپنے کام میں جتا رہتا تھا۔ نہ خود دو منٹ آرام کرتا تھا نہ کسی کو آرام کرنے دیتا تھا۔ اردو بڑی صاف اور صحیح بولتا تھا۔ دو باتیں اپنے سٹاف کے افسروں سے ہفتے میں ایک بار ضرور کہتا تھا۔ ایک یہ کہ لوگوں کی عزت، جان اور ان کے گھروں کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ واردات ہو جائے تو ملزموں کو پکڑنے کے لئے ہندوستانی تانگے کے گھوڑے کی طرح کام کرو۔

آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہو گا کہ تانگہ بان گھوڑے کو صبح تانگے کے آگے جوت کر رات کو کھولتے ہیں۔ سارا دن دوڑاتے رہتے ہیں۔ ایک درجن سواریاں مل جائیں تو تانگے میں بھر لیتے ہیں۔ گھوڑے کو پوری خوراک بھی نہیں دیتے۔ اسے چھوڑتے اس وقت ہیں جب گھوڑا سڑک پر گر کر مر جاتا ہے۔ ہندوستان کے تانگہ بان بھی اپنے گھوڑوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے تھے۔

ایس پی تھامسن اپنے ماتحت افسروں کو تانگے کے گھوڑے بنا دیا کرتا تھا اور اس کی زبان کرخت تھی لیکن اس کے ماتحت کام کرنے والے افسر سراغرسانی اور تفتیش میں مہارت حاصل کر لیتے تھے۔ میں نے خود اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ سب سے زیادہ کارآمد سبق جو

اس سے حاصل کیا وہ یہ تھا کہ مستقل مزاجی سے محنت جاری رکھو۔ ایسی مایوسی کو قبول ہی نہ کرو کہ ناکام ہو جاؤ گے۔ شک ذرا سا بھی ہو، اسے نظرانداز نہ کرو۔ شک باپ پر ہو تو اسے بھی شاملِ تفتیش کرو۔ تمہاری ساری ہمدردی مظلوم کے لئے ہو۔

اب دیکھئے کہ جس تھامسن کو ہم باسٹرڈ یعنی حرامی کہا کرتے تھے وہ کتنا انصاف پسند تھا اور اپنے فرض کو کس طرح اپنے مذہب کا فرض سمجھتا تھا۔ وہ صرف ایک سال سی آئی اے میں رہا تھا۔ اس ایک سال میں ہمیں کندن کر گیا تھا۔

ایک روز اس نے مجھے اور میرے ایک انگریز ساتھ انسپکٹر ٹینیسن کو دفتر میں بلایا۔ یہ وہی انسپکٹر ٹینیسن تھا جس کی ایک کہانی ''عجیب لڑکی'' میں پہلے کبھی میں سنا چکا ہوں۔ اس واردات کی تفتیش ہم دونوں نے مل کر کی تھی۔ ایس پی تھامسن نے انسپکٹر ٹینیسن کو پیغام بھیجا کہ احمد یار خان کو ساتھ لے کر آؤ۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا ہوں کہ ٹینیسن نے میرے پاس آ کر کس طرح مجھے بتایا کہ ایس پی نے بلایا ہے۔

"Hey Malik! He Wants Us"

"Who?"

"That Bastard!"

میں ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ڈرا ہوا تھا کہ تھامسن نے ہماری کوئی غلطی پکڑ لی ہوگی۔ اس کے دفتر میں داخل ہوئے تو اس نے ہمیں بٹھا کر ایک کاغذ ہماری طرف سرکایا۔ ہم دونوں نے دیکھا۔ یہ ایک مسلمان عورت کی درخواست تھی۔ اس کا جوان بیٹا اینٹوں کے بھٹے کی آگ میں گر کر اور جل کر مر گیا تھا۔ دو مہینے گزر گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس درخواست پر کسی بڑے افسر کے ریمارکس یا حکم لکھا ہوا نہیں تھا کہ اس درخواست کی انکوائری یا تفتیش کرائمز برانچ کرے۔ باقاعدہ حکم کے بغیر سی آئی اے کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی۔

تھامسن نے ہمیں بتایا کہ یہ درخواست اسے براہ راست ایک معزز شخص نے دی ہے۔ یہ عورت متعلقہ تھانے میں جاتی رہی۔ اسے شک تھا کہ اس کا بیٹا خود بھٹے کی آگ میں نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔ تھانیدار اس عورت کو یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ وہ تفتیش کر چکا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کا بیٹا اتفاقیہ جلتے ہوئے بھٹے میں گرا تھا۔

جس معزز شخص نے ایس پی تھامسن کو اس عورت کی درخواست دی تھی، اس کا تعلق ہائی کورٹ سے تھا۔ مجھے آج اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ ہائی کورٹ میں ریڈر تھا یا ایڈووکیٹ

تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کی معرفت تھامسن سے ملاقات کی تھی۔ اس کا یہ دوست اینگلو انڈین تھا اور پولیس کا ڈی ایس پی تھا۔ اس شخص نے ایس پی تھامسن کو بتایا تھا کہ وہ بھٹے کے مالک کو ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ بھی اس نوجوان کی موت کو مشکوک سمجھتا ہے۔

تھامسن نے درخواست رکھ لی۔

''میں اس تھانے کے ایس ایچ او کے ساتھ فون پر بات کر چکا ہوں'' ـــــ ایس پی تھامسن نے ہمیں بتایا ـــــ ''اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ شک سا ہو گیا ہے۔ تم دونوں باقاعدہ تفتیش کرو۔ یہ نہیں دیکھنا کہ یہ عورت غریب ہے یا امیر ہے اور کون کیا ہے۔ اگر ایس ایچ او نے دانستہ کوتاہی کی ہے یا بغیر تفتیش اسے اتفاقیہ موت لکھ دیا ہے تو اسے گرفتار کر کے مجھے تحریری رپورٹ دو''۔

اس نے حسب معمول اور حسب عادت بڑی سخت ہدایات دیں جن کی ہمیں ضرورت نہیں تھی۔ میں اور ٹینیسن وہاں سے آ گئے اور تفتیش کا باقاعدہ پلان بنا لیا۔ سب سے پہلے ہم نے متعلقہ تھانے جا کر ایس ایچ او سے پوری معلومات لینی تھیں۔

آج اپنی ڈائری سے یہ کیس نکالا ہے تو وہ ساری فضا میری آنکھوں کے سامنے آ گئی ہے جو ایک انگریز ایس پی نے مجھے دکھائی تھی۔ آج ہم آزاد ہیں۔ ہمارا ملک اسلامی ملک ہے۔ اسلام کے عدل و انصاف کے نظام کی تعریف یورپ کے ان قانون دانوں نے بھی کی ہے جنہوں نے اپنے ملکوں کے لئے قانون بنائے تھے لیکن ہماری اسلامی مملکت میں عدل و انصاف کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے، وہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ دن دیہاڑے قتل ہوتے ہیں۔ لوگ جلوس نکالتے ہیں، مظاہرے کرتے ہیں، اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں۔ گورنر صاحب کہتے ہیں کہ قاتلوں کو دو دنوں میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ وزیراعلیٰ صاحب حکم دیتے ہیں کہ قاتلوں کو گرفتار کیا جائے لیکن پولیس کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ جنرل ضیاء کے دور حکومت میں بعض مقتولوں کے پسماندگان جنرل ضیاء تک بھی پہنچے۔ جنرل صاحب نے وعدہ کیا کہ قاتلوں کو بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ جنرل صاحب حکم دے دیتے تھے لیکن علاقہ تھانیدار کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ اب تو ہماری پولیس نے پاکستان کو اپنی ریاست بنا لیا ہے۔ اگر آپ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو علاقہ تھانیدار کے ساتھ پہلے سودا طے کر لیں۔

میں آپ کو ایک انگریز کا عدل وانصاف سنا رہا ہوں جس نے دفتری کارروائیوں میں الجھنے سے پہلے حکم دے دیا کہ اس عورت کا شک رفع کر دیا اس کے بیٹے کے قاتل کو پکڑو۔ ہمارے آج کے پولیس افسر یہ کہانی پڑھیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو پولیس کے ضابطے اور قانون کے خلاف ہے کہ کرائمز برانچ کا ایک ایس پی اوپر کے حکم کے بغیر ہی ایک کیس کی تفتیش کا حکم دے دے

ماں کے چہرے پر اُداسی

میں اور انسپکٹر ٹینیسن اس علاقے کے تھانے میں گئے جس علاقے میں بھٹہ تھا۔ تھانیدار ایک مسلمان تھا جو انبالہ کا رہنے والا تھا...... سب انسپکٹر صداقت علی خان...... جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس نے ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا تھا۔ اس کا سارا خاندان وہیں رہ گیا تھا صداقت علی خان عیش موج کرنے والا آدمی تھا۔ تجربہ کار تھانیدار تھا لیکن چار پیسے مل جاتے تو بچ بچا کر ڈنڈی مار جاتا تھا۔ وہ کسی بھوکے ننگے خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کے خاندان کی پوزیشن بہت اچھی تھی اور یہ اثر ورسوخ والا خاندان تھا۔

ہمیں اپنے تھانے کے احاطے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہمارے استقبال کو دوڑا آیا اور اپنے دفتر میں لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔

''اس عورت نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے''۔۔۔ صداقت علی نے کہا۔۔۔ ''وہ بیچاری اپنی جگہ سچی ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ وہ تو خدا کے خلاف بھی درخواست دے گی۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر تک پہنچ گئی ہے اور آپ صاحبان کو زحمت دی ہے''۔

''ماں تو مطمئن نہیں ہوگی''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آپ ہمیں مطمئن کر دیں۔ آپ نے جو تفتیش کی ہے اس کی فائل دکھا دیں اور زبانی بتا دیں کہ یہ کیا معاملہ ہے''۔

وہ فائل لے آیا جس میں اس نے تحقیقات کی کارروائی لکھی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ فلاں تاریخ فلاں شخص اس کے پاس یہ رپورٹ لے کر آیا کہ اس کا ایک ملازم جلتے ہوئے اینٹوں کے بھٹے میں پاؤں پھسلنے کی وجہ سے گر پڑا اور مر گیا ہے۔ پھر اس نے لکھا تھا کہ وہ موقعہ پر پہنچا اور لاش دیکھی جو ناقابل شناخت حد تک جل چکی تھی۔ پھر اس نے تین آدمیوں کے بیان لئے تھے۔ سب نے کہا کہ متوفی پاؤں پھسل جانے سے آگ میں گر پڑا۔

اس طرح اس تھانیدار نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے اس حادثے کو اتفاقیہ یا حادثاتی موت قرار دے دیا۔

''خان صاحب!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آپ نے زبانی جو معلومات اکٹھی کی تھیں وہ ہمیں سنا دیں''۔

پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ متوفی جمیل احمد بیوہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس نے اڑھائی تین سال پہلے میٹرک پاس کیا تھا اور اس بھٹے کے مالک کے پاس ملازم ہو گیا تھا۔ بھٹے کا مالک خلیل الرحمان ذرا بڑے پیمانے کا ٹھیکیدار تھا۔ وہ تعمیراتی کام کرتا تھا، گورنمنٹ کنٹریکٹر اور سپلائر بھی تھا اور اس کا یہ بھٹہ بھی تھا جہاں اینٹیں بنتی تھیں۔

میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار سنایا ہے کہ دوسری جنگ عظیم نے ہندوستانیوں کی قسمت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایک تو وہ ہندوستانی تھے جو فوج میں بھرتی ہو گئے، دوسرے زراعت پیشہ تھے جو اس طرح خوشحال ہو گئے کہ اناج فوجوں کے لئے حکومت خرید لیتی تھی اور قیمت بھی اچھی دیتی تھی۔ فوجوں کو سامان کی سپلائی کے ٹھیکے لوگوں کو ملنے لگے تعمیراتی کام بھی بہت بڑھ گیا۔ ایک تو سرکاری تعمیرات تھیں اور دوسری تعمیرات لوگوں کی ذاتی تھیں۔ روپیہ پیسہ آ جانے کی وجہ سے لوگوں نے مکان بنانے شروع کر دیئے، اور جو زیادہ امیر ہو گئے تھے، انہوں نے کوٹھیاں بنانی شروع کر دیں۔

یہ ٹھیکیدار خلیل الرحمان بھی جنگ عظیم کا بنایا ہوا ٹھیکیدار تھا۔ ہم نے سب انسپکٹر صداقت علی خان سے اس ٹھیکیدار کی فیملی بیک گراؤنڈ اور کردار وغیرہ کے متعلق پوچھا تو وہ ہمیں کچھ بھی نہ بتا سکا۔

''کیا متوفی جمیل بھٹے پر ملازم تھا؟''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔۔۔ ''اگر بھٹے کا ملازم تھا تو اس کے ذمے کیا کام تھا؟''

''میں نے یہ نہیں پوچھا تھا''۔۔۔ صداقت علی نے جواب دیا۔۔۔ ''میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی البتہ یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ بھٹے کا ملازم تھا''۔

''آپ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا؟''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا اور کہا۔۔۔ ''ہو سکتا ہے کسی کے ساتھ مرنے والے کی دشمنی ہو اور اسے دھوکے سے بھٹے کی آگ میں دھکا دیا گیا ہو''۔

''میں نے فائل میں نہیں لکھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''لیکن معلوم کیا تھا۔ کوئی

دشمنی کا اشارہ نہیں ملا''۔

میں نے نوٹ کیا کہ صداقت علی خان نے یہ جواب دیا تو اس میں وہ خود اعتمادی اور بولنے کے انداز میں پختگی نہیں تھی جو اس کے لہجے اور انداز میں پائی جاتی تھی۔ اس کی زبان کچھ ہلی ہوئی لگتی تھی۔

''صداقت بھائی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ہم تفتیش کے لئے آئے ہیں۔ اگر کوئی شک شبہے والی بات ہے تو ہمیں بتا دیں یا یہ کہہ دیں کہ آپ نے تفتیش میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی لینی چاہئے تھی۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ چونکہ وہ ماں ہے اس لئے وہ آپ کو پریشان کرتی رہی ہے''۔

صداقت علی بے چین سا ہو گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے اپنی غلطی یا کوتاہی کا احساس ہے۔ اگر میرے ساتھ انگریز انسپکٹر نہ ہوتا تو صداقت میرے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتا۔ یہ لوگ انگریز افسروں سے مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔ بہر حال ابھی کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت تھا۔ انسپکٹر ٹینیسن نے اسے کہا کہ وہ ہمیں اس عورت کے گھر تک پہنچا دے۔ اس کا ایڈریس تو تھا لیکن پرانی دلی میں کسی کا مکان تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔

صداقت علی نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ معلوم ہوا کہ صرف یہ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا جو اس عورت کے گھر سے واقف تھا۔

''ایک کام کرنا خان!''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے صداقت سے کہا۔۔۔ ''ٹھیکیدار خلیل الرحمان کو اطلاع دے دو کہ وہ تھانے میں آ جائے۔ ہم واپس تھانے میں ہی آئیں گے''۔

ہیڈ کانسٹیبل نے ہمیں اس عورت کے گھر پہنچا دیا اور ہم نے اسے کہا کہ وہ واپس چلا جائے۔ دروازے پر دستک دی تو چودہ پندرہ سال عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ میں نے اپنا اور انسپکٹر ٹینیسن کا تعارف کرایا اور لڑکے سے کہا کہ اندر جا کر کہو کہ آپ نے جو درخواست دی تھی ہم اس سلسلے میں آئے ہیں۔

لڑکا فوراً اندر گیا اور دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی۔ شکل و صورت اور ڈیل ڈول سے پتہ چلتا تھا کہ مڈل کلاس کی معزز عورت ہے۔ ابھی تک اس کے چہرے کی خوبصورتی باقی تھی۔ اس سے پہلے جو لڑکا باہر آیا تھا وہ بھی خوبصورت تھا۔ عورت کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی۔

یہ مڈل کلاس کا اچھا اور صاف ستھرا گھر تھا۔ عورت نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔

ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ چائے بنا کر لے آئی۔

بیٹا ماں کے خواب میں

سب سے پہلے تو یہ عورت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اپنے بیٹے کو یاد کرتی رہی۔ اس کے پاس ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ ہماری دستک پر یہی لڑکا باہر نکلا تھا۔ اس عورت کے خاوند کو فوت ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے۔ اس کا ایک بھائی اسے کچھ پیسے دے دیا کرتا تھا۔ یہ مکان اس کا اپنا تھا۔ جمیل احمد اس کا بڑا بیٹا تھا جسے اس نے دس جماعتیں پڑھا کر اس ٹھیکیدار کے پاس ملازم کرا دیا تھا۔ یہ بیٹا بھی نہ رہا۔ اس عورت نے اپنا نام راشدہ بتایا۔

''آپ یہ بتائیں''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''آپ کو یہ شک کیسے ہوا ہے کہ آپ کے بیٹے کو دھکا دے کر آگ میں گرایا گیا تھا اور وہ خود نہیں گرا''۔

''میرا بیٹا جمیل ہر رات خواب میں آتا ہے''۔۔۔ راشدہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔۔۔ ''ہر رات ایک ہی بات کہتا ہے کہ میرے قاتلوں کو پکڑو، میں خود نہیں گرا تھا''۔

''کیا وہ یہ نہیں بتاتا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ راشدہ نے جواب دیا۔۔۔ ''میں پوچھتی ہوں تو بھی نہیں بتاتا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خود نہیں گرا''۔

یہ تو ماں کے جذبات تھے جن کا اظہار وہ اس طرح کر رہی تھی کہ اس کا بیٹا ہر رات اسے خواب میں ملتا ہے۔ میں نے یا انسپکٹر ٹینیسن نے اسے ایسی بات نہیں کہی کہ یہ اس کا وہم ہے اور اس کے جذبات ہیں۔ اس وقت تک میں قتل کی بے شمار وارداتوں کی تفتیش کر چکا تھا اور ایسی بہت سی مائیں میرے سامنے آئی تھیں جن کے جوان بیٹے قتل ہو گئے تھے۔ وہ سب ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔

ہم دونوں پولیس آفیسر اس کے جذبات کا ساتھ دیتے رہے اور ہم نے اسے یہی تاثر دیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ہم حقائق معلوم کرنا چاہتے ہیں تا کہ ہم قاتل کو پکڑ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دکھیاری ماں کی باتیں سن کر مجھے یہ خیال آیا تھا کہ اس کے بیٹے کی موت حادثاتی ہے اور یہ اس غم زدگی کے اثرات ہیں کہ بیٹے کی موت کا ذمہ دار کسی نہ کسی کو ٹھہرا رہی ہے، مگر ذرا سا بھی اشارہ نہیں دے رہی کہ اسے کس پر شک ہے۔

ہمارا یہ فرض تھا کہ اس کیس کو ٹالنا نہیں اور پوری محنت کرنی ہے اور زمین کے دور نیچے تک نکل جانا ہے۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ بعض حادثاتی موت جس کے متعلق ڈاکٹر بھی اور ہر کوئی یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ موت اتفاقیہ یا قدرتی ہے، وہ قتل کی واردات نکلتی ہے، مثلاً کچھ زہر ایسے ہیں جو کسی کو روزانہ دودھ، چائے یا سالن وغیرہ میں تھوڑے تھوڑے دیتے رہو تو دو تین مہینوں بعد وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مر جاتا ہے۔ اس لڑکے کی موت بھی قتل کی واردات ہو سکتی تھی۔

ہم نے اس سے حقائق معلوم کرنے شروع کئے تو اس ٹھکیدار کا ذکر آ گیا جس کے پاس جمیل ملازم تھا۔ پتہ چلا کہ جمیل تین سال سے وہاں ملازم تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ بھٹے پر کیا کام کرتا تھا۔

''میرا بیٹا بھٹے پر ملازم نہیں تھا''۔۔۔ راشدہ نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ ٹھیکیدار کا کلرک تھا یا منشی کہہ لو۔ ٹھیکیدار کے گھر میں بھی جاتا تھا اور گھر کی کوئی ضرورت ہو تو وہ پوری کرتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اور بھی تھی۔ ٹھیکیدار کی بیٹی کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے لئے باپ نے تانگہ لگوایا ہوا ہے۔ میرا بیٹا صبح اس لڑکی کے ساتھ کالج تک جاتا تھا اور چھٹی کے وقت کالج سے اسے لاتا تھا۔ ٹھیکیدار اس کام کی اسے الگ تنخواہ دیتا تھا۔ پانچ چھ دنوں سے وہ بھٹے پر جا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ بھٹے کا منشی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ اس کے آنے تک جمیل نے بھٹے پر حساب کتاب کرنا تھا''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔۔۔ ''کہ ٹھیکیدار کو آپ کے بیٹے پر بہت ہی اعتماد تھا''۔

''ہاں جی!''۔۔۔ راشدہ نے کہا۔۔۔ ''یہ اعتماد کی ہی بات تھی کہ خلیل الرحمان میرے بیٹے کو اپنی لڑکی کے ساتھ بھیجتا تھا۔ اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ ٹھیکیدار ہمارا دور کا رشتہ دار بھی ہے۔ اس جنگ سے پہلے ٹھیکیدار کا صرف بھٹہ تھا جس کی کوئی آمدنی نہیں تھی۔ اتنے مکان بنتے ہی کہاں تھے۔ ہندو اور سکھ مکان بناتے تھے تو ہندوؤں اور سکھوں کے بھٹوں سے اینٹیں لیتے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو خلیل الرحمان کا بھٹہ بھی چل پڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹھیکیدار بن گیا۔ آدمی ہوشیار اور چالاک ہے۔ ہر کسی کو خوش رکھنا جانتا ہے۔ اس کا کاروبار بڑی جلدی پھیل گیا۔ دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے نئی دلی میں کوٹھی بنالی۔ میرا خاوند فوت ہو گیا تھا۔ ٹھیکیدار نے میرے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ جمیل نے میٹرک پاس کر لی تو ٹھیکیدار نے

اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اچھی تنخواہ دینے لگا۔ یہ تو آپ کو بتایا ہے کہ فوت ہونے سے پہلے وہ بھٹے پر جاتا تھا کیونکہ وہاں کا منشی چھٹی چلا گیا تھا اور ٹھیکیدار کسی اور پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ جمیل جل کر فوت ہو گیا تو ٹھیکیدار نے مجھے پانچ ہزار پیش کیا تھا۔ میں نے یہ رقم یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے بیٹے کی قیمت نہیں لوں گی''۔

''آپ کو ٹھیکیدار پر تو شک نہیں ہو گا''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا۔

''اس پر تو شک نہیں ہونا چاہئے''۔۔۔ راشدہ نے جواب دیا۔۔۔ ''لیکن ٹھیکیدار کے خلاف مجھے شکایت ضرور ہے''۔

''وہ کیا؟''

''میں نے پانچ ہزار کی رقم قبول نہ کی''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میں نے اسے کہا کہ مجھے تھانے لے چلے کیونکہ مجھے شک ہے کہ میرے بیٹے کو آگ میں جلایا گیا ہے۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ ایسے فضول شک نہ کرو، خوامخواہ تھانے میں خراب ہوتی پھرو گی۔ سب کہتے ہیں کہ تمہارا بیٹا پھسل کر گرا تھا۔ میں نے کہا کہ میں خود تھانے چلی جاؤں گی۔ ٹھیکیدار نے پھر مجھے سمجھایا بجھایا اور آٹھ ہزار روپیہ پیش کیا جو میں نے قبول نہ کیا۔ ٹھیکیدار کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ تم خود بھی خراب ہونا چاہتی ہو اور مجھے بھی خراب کرو گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اس ضد سے باز نہ آئیں تو دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ چھوٹے بیٹے کو میٹرک پاس کر لینے دو میں اسے جمیل کی طرح اپنے پاس رکھ لوں گا''۔

''ایک بات سوچ لیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اگر آپ کو ٹھیکیدار پر شک ہے تو ہمیں بتائیں یا صاف کہہ دیں کہ ٹھیکیدار پر آپ کو شک نہیں''۔

''ٹھیکیدار پر شک کی کوئی وجہ نہیں''۔۔۔ راشدہ نے کہا۔۔۔ ''اتنے امیر کبیر آدمی کو ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسے تو جمیل پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی جوان بیٹی کو میرے بیٹے کے ساتھ بھیجا کرتا تھا''۔

''یہ بھی دشمنی کی وجہ ہو سکتی ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس کی لڑکی جوان ہے اور آپ کا بیٹا بھی جوان تھا۔ ہو سکتا ہے ٹھیکیدار نے ان دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا ہو یا یہ دیکھا ہو کہ ان دونوں میں کچھ اور ہی قسم کی بے تکلفی ہے''۔

''میں یہ نہیں مان سکتی''۔۔۔ راشدہ نے کہا۔۔۔ ''میرا بیٹا اتنا ہوشیار اور چالاک نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ٹھیکیدار مجھ سے گلہ کرتا اور جمیل کو نوکری سے نکال دیتا۔ اسے معلو

تھا کہ ہمارے لئے یہی سزا بہت ہے کہ ہماری روزی بند ہو جائے۔ آپ پولیس کے افسر ہیں، ایسی باتیں باہر سے معلوم کر سکتے ہیں''۔

یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ ٹھیکیدار نے راشدہ کو پانچ ہزار روپیہ پیش کیا تھا پھر یہ رقم آٹھ ہزار کر دی۔ آج کل پانچ یا آٹھ ہزار کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی، میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت کا ایک ہزار آج کے ایک لاکھ کے برابر تھا۔

راشدہ نے یہ رقم قبول نہ کی اور وہ تھانے چلی گئی۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ اسے کوئی شک ہے تو گواہ ساتھ لائے اور اپنا شک ثابت کرے۔ ہم جانتے تھے کہ تھانیدار ایسی بات اس صورت میں کہا کرتے ہیں جب وہ کسی کو ٹالنا چاہتے ہوں۔ راشدہ گواہ کہاں سے لاتی، پھر بھی وہ روتی اور بھٹکتی رہی اور ہر رات خواب میں بیٹے کو دیکھتی رہی۔ اس کے پاس یہی ایک شہادت اور یہی ایک ثبوت تھا کہ اس کا بیٹا خواب میں اسے کہتا تھا کہ وہ آگ میں خود نہیں گرا تھا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ جمیل کا چالیسواں ہوا تو ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ راشدہ تین چار مرتبہ پھر تھانے گئی۔ اس نے بتایا کہ تھانیدار کبھی تو اسے بڑے پیار اور محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے اور کبھی غصے سے اسے تھانے سے نکال دیتا تھا۔

جس آدمی نے اس کی درخواست ایس پی تھامسن تک پہنچائی تھی وہ اس کے خاوند کا دوست تھا۔ ایک روز یہ دوست راشدہ کے گھر آ گیا تو راشدہ نے اسے بتایا کہ کیا شک ہے۔ دوست نے دوستی کا حق ادا کرنے کی خاطر خود ہی درخواست لکھی اور اپنے ڈی ایس پی اینگلو انڈین دوست کو دے دی اور اس ڈی ایس پی نے درخواست تھامسن تک پہنچا دیں۔

بھٹے کی آگ

اس غمزدہ ماں سے ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوئی جس سے کوئی شک واضح ہوتا۔ صرف ایک بات تھی جو کچھ شک پیدا کرتی تھی وہ یہ کہ جمیل ٹھیکیدار کی بیٹی کو کالج لے جاتا اور واپس لاتا تھا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جس شخص کو اچانک دولت مل جائے اور اس سے پہلے اس نے کبھی دولت نہ دیکھی ہو تو اس کا اپنا دماغ خراب ہو یا نہ ہو، اس کی اولاد کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ لوئر مڈل یا مڈل کلاس کا خاندان صرف دولت کے زور پر یک لخت اپر کلاس میں شامل ہو جائے تو اس خاندان کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور

اپنی اخلاقی حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ ٹھیکیدار کی یہ بیٹی اخلاقی لحاظ سے کیسی ہے۔

البتہ سوچنے والی بات یہ بھی تھی کہ امیر گھرانے کی لڑکی کو امیر گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ دوستی لگانی چاہئے تھی، جمیل تو اس کا باڈی گارڈ یعنی نوکر تھا۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن اسی مسئلے پر تبادلہ خیال کرتے تھانے چلے گئے۔ ٹھیکیدار خلیل الرحمان تھانیدار کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر کا آدمی تھا۔ شکل و صورت سے معزز لگتا تھا۔ وہ جس طرح مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن سے ملا، اس سے پتہ چلتا تھا کہ اچھی اور شائستہ سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والا آدمی ہے۔ میری رائے میں وہ شائستہ اور مہذب آدمی تھا یا پکا استاد تھا اور ہر ڈھنگ کھیلنا جانتا تھا۔ میں نے اور ٹینیسن نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ ٹھیکیدار کو بھٹے پر لے جانا ہے اور وہیں اس سے سوال و جواب کریں گے۔ بھٹہ دیکھنا بھی ضروری تھا۔

ہم نے اسے کہا کہ وہ ہمیں اپنے بھٹے پر لے چلے۔ بھٹہ دلی کے مضافات میں تھا۔ تھوڑا عرصہ گزرا، دلی سے آئے ہوئے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ جہاں کسی زمانے میں بھٹے اور بنجر علاقے تھے وہ سب کبھی کے آباد ہو چکے ہیں۔ وہاں کوٹھیاں اور نئے نئے نمونوں کے مکان بن گئے ہیں۔

ٹھیکیدار کے بھٹے پر پہنچے تو اسے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں وہ جگہ دکھائے جہاں سے جمیل آگ میں گرا تھا۔ اس نے وہ جگہ دکھائی۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اینٹوں والا بھٹہ نہیں دیکھا انہیں ذرا واضح طور پر بتا دیا جائے کہ بھٹہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ ایک خندق ہوتی ہے جو گولائی میں کھودی ہوتی ہے لیکن یہ گول دائرے میں نہیں ہوتی بلکہ لمبوتری ہوتی ہے۔ اس کی کم از کم گہرائی دس فٹ ہوتی ہے۔ چوڑائی بھی تقریباً اتنی ہی رکھی جاتی ہے۔ اس خندق میں کچی اینٹیں ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک تریب میں ڈھیر ہوتا ہے۔ ڈھیروں کے درمیان ایک خاص فاصلے پر جگہ خالی چھوڑی جاتی ہے۔ ایسی سب جگہوں پر کوئلے، لکڑیاں یا جلنے والی اور اشیاء رکھ کر انہیں آگ لگا دی جاتی ہے پھر اس ساری خندق کو اوپر سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں آگ جل رہی ہوتی ہے وہاں اوپر لوہے کے ڈھکن رکھ دیئے جاتے ہیں اور ایک جگہ چمنی رکھ کر ادھر ادھر سے باندھ دی جاتی ہے۔ اس سے تمام بھٹے کا دھواں باہر نکلتا ہے۔ جہاں ڈھکن رکھے

جاتے ہیں وہاں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ڈھکن اٹھا کر مزید کوئلے اور لکڑیاں پھینکتے رہتے ہیں۔

میں سنا رہا تھا کہ ٹھیکیدار نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں سے جمیل پھسل کر آگ میں گرا تھا۔ میں نے اور ٹینیسن نے بھٹے کا کنارا غور سے دیکھا۔ میں نے ٹینیسن کی طرف اور ٹینیسن نے میری طرف دیکھا۔ وہاں پھسلنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم دونوں نے ٹھیکیدار کو پتہ نہ چلنے دیا کہ ہمارا ردِعمل کیا ہے۔

آپ ایک دس فٹ گہری خندق کو تصور میں لائیں۔ اس میں آگ جل رہی ہے۔ خندق کے ذرا قریب جاؤ تو تپش اتنی زیادہ ہوگی کہ آپ خندق کے کنارے تک جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ بھٹے کی آگ تو خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا کہ جمیل کنارے پر چلا گیا تھا۔

''کیا وہ اکیلا تھا؟''___ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''___ ٹھیکیدار نے جواب دیا___ ''مزدوروں کا میٹ اس کے ساتھ تھا۔ میرے بھٹے پر مزدور بہت ہیں۔ میں نے ان پر ایک میٹ مقرر کر رکھا ہے۔ یہ میٹ ہی انہیں سنبھال سکتا ہے''۔

''کیا اس وقت آپ بھی یہاں موجود تھے؟''___ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

''نہیں!''___ ٹھیکیدار نے جواب دیا___ ''مجھے یہ باتیں میٹ نے بتائی تھیں''۔

''اور آپ نے ہر بات سچ مان لی''___ میں نے کہا اور پوچھا___ ''تھانے میں آپ نے کیا رپورٹ دی تھی؟''

''یہی کہ میرا ایک ملازم آگ میں گر کر جل گیا ہے''___ اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ آپ کے اس ملازم کو کسی نے کسی وجہ سے آگ میں گرایا ہوگا؟''___ میں نے پوچھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی''___ ٹھیکیدار نے کہا___ ''اس بے چارے کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ اسے اس بھٹے پر آئے چار ہی دن ہوئے تھے''۔

ٹھیکیدار کا پورا بیان تو ہم نے بعد میں لینا تھا، ابھی ہم موقعہ دیکھ رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ کوئی عینی شاہد تھا یا نہیں۔ یہ معلوم ہوگیا کہ مزدوروں کا میٹ جمیل کے ساتھ

تھا۔ میٹ وہیں تھا۔ ہم نے اسے صرف دیکھا، اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ ہم نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہاں پھسلنے والی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بھٹے میں کچی اینٹیں رکھی جا چکی تھیں اور آگ کی جگہوں پر آگ جلا دی گئی تھی۔ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اتنی زیادہ آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا۔ کنوئیں میں آدمی جھک کر دیکھ لیتا ہے کیونکہ اس میں آگ نہیں ہوتی، پانی ہوتا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مزدور چلے گئے تھے۔ میٹ وہیں تھا اور دو چوکیدار آ گئے تھے۔ ہم نے ٹھیکیدار خلیل الرحمان سے کہا کہ وہ رات نو بجے میٹ کو ساتھ لے کر کرائمز برانچ پہنچ جائے۔

میں اور انسپکٹر ٹینیسن وہاں سے ایک شک لے کر آ گئے۔ ہم دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ اتفاقی یا حادثاتی موت نہیں۔

بھیڑوں کا رکھوالا بھیڑیا

ہم دونوں انسپکٹر رات دس بجے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ ٹھیکیدار اور اس کا میٹ ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں نو بجے کا وقت دیا تھا اور ہم ایک گھنٹہ لیٹ پہنچے۔ یہ ہم نے اس لئے کیا تھا کہ یہ ہمارا طریقہ کار تھا۔ مشتبہوں کو ہم کئی کئی گھنٹے انتظار میں رکھا کرتے تھے تاکہ وہ ذہنی طور پر نڈھال ہو جائیں۔ یہ تو ہم نے ٹھیکیدار پر مہربانی کی تھی کہ ہم صرف ایک گھنٹہ لیٹ آئے تھے۔ پہلے ہم نے ٹھیکیدار کو اپنے پاس بٹھایا۔

ہمارے کچھ تعارفی قسم کے سوالوں کے جواب میں اس نے جمیل کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو جمیل کی ماں بتا چکی تھی۔

''جناب عالی!''___ اس نے کہا___ ''مجھے اس لڑکے کے مرنے کا اتنا زیادہ غم ہے۔ جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بیچارہ یتیم تھا اور چھوٹے بھائی کا اور بیوہ ماں کا سہارا تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذات باری نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں اس لڑکے کو نوکری پر لگا کر خاصی زیادہ تنخواہ دیتا رہا۔ بڑا شریف اور قابل اعتماد لڑکا تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے حساب کتاب اور روپے پیسے کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔ میں اسے اپنی جوان بیٹی کے ساتھ کالج تانگے پر بھیج دیا کرتا تھا۔ یہی لڑکا میری بیٹی کو کالج سے واپس لاتا تھا۔ خدا کی قسم میں اس کی ماں کا سامنا نہیں کر سکتا''۔

اس نے اپنے بیان کا یہ حصہ رونی سی صورت بنا کر ہمیں سنایا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی

روپڑے گا۔

''آپ نے اس کی ماں کو پانچ ہزار روپیہ دیا تھا'' ___ میں نے کہا ___ ''یہ رقم اس نے نہیں لی، پھر آپ نے اس میں تین ہزار کا اضافہ کر دیا۔ اس نے یہ رقم بھی نہیں لی پھر آپ نے اسے دھمکی دی کہ تم دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی ...... آپ نے اسے یہ دھمکی کیوں دی تھی؟''

''نہیں جناب!'' ___ اس نے ذرا گھبراہٹ کے لہجے میں کہا ___ ''میں نے اسے ایسی کوئی دھمکی نہیں دی بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تمہارا دوسرا بیٹا میٹرک پاس کر لے تو میں اسے اپنے ساتھ اتنی تنخواہ پر لگالوں گا جتنی تنخواہ پر جمیل کو لگا رکھا تھا ...... اصل بات یہ ہے جناب! بیچاری ماں ہے اور اس کا جوان بیٹا مر گیا ہے۔ اس پر تو پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ اسے شک ہے کہ اس کے بیٹے کو کسی نے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا تھا۔ بار بار تھانے کی طرف دوڑتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ہی اس کا والی اور وارث ہوں ......

''اس عورت کو میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے تھانے سے روکنے کے لئے کوئی سخت بات کہہ دی ہو جسے اس نے دھمکی سمجھا ہو۔ میں نے خود ہی پولیس کو اطلاع دے کر موقع پر بلا لیا تھا۔ سب انسپکٹر صداقت صاحب نے بڑی محنت سے تفتیش کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے ذہن میں یہ شک رکھ کر تفتیش کی تھی کہ کسی نے جمیل کو آگ میں دھکیلا ہو گا۔ جمیل بیچارے کو بھٹے پر آئے ابھی چار ہی دن گزرے تھے۔ یہاں اس کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی''۔

''جمیل آپ کے دوسرے کاروبار میں کام کرتا تھا'' ___ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا ___ ''اسے آپ نے بھٹے پر کیوں بھیج دیا تھا؟''

''یہ ایک عارضی تبدیلی تھی'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''بھٹے کا منشی سات آٹھ دنوں کے لئے چھٹی چلا گیا تھا۔ پیچھے جو میرے ملازم ہیں وہ پیسوں میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ بھٹے کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ بد دیانت ملازم جتنے پیسے چاہے مار سکتا ہے۔ یہ منشی جو چھٹی چلا گیا تھا، دیانت دار آدمی ہے۔ میں نے اس کی جگہ جمیل کو بھیج دیا کہ یہ بھی اسی جیسا دیانت دار اور میرے گھر کا اپنا فرد ہے''۔

''کیا یہ منشی پہلے کبھی چھٹی گیا تھا؟'' ___ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

''شاید ...... مجھے ...... ہو سکتا ہے'' ___ اس کی زبان ہکلا گئی پھر ذرا سنبھل کر

بولا ___ ''یہ میں پوچھ کر بتاؤں گا''۔

اس سوال پر اس کا جو ردِعمل اس کے چہرے پر اور اس کے انداز میں ظاہر ہوا، وہ ہمارے لئے ایک واضح اشارہ تھا۔ میں نے ذہن میں رکھ لیا کہ اس منشی کو بھی پوچھ گچھ کے لئے بلانا ہے۔ ہم دونوں انسپکٹروں نے اس پر اس طرح مختلف سوال پھینکنے شروع کر دیئے جیسے تیر برسائے جاتے ہیں۔ میں سوال و جواب کا یہ سلسلہ بیان نہیں کر رہا کیونکہ یہ بیان ہو ہی نہیں سکتا۔ ٹھیکیدار کی یہ حالت ہو گئی کہ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ پہلے کیا کہہ چکا ہے۔ ہم ابھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ جمیل کو اس کے حکم سے آگ میں پھینکا گیا ہے لیکن ہمارا یہ شک پختہ ہو گیا تھا کہ جمیل پاؤں پھسلنے سے آگ میں نہیں گرا بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔

''خلیل الرحمان صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''میں آپ کو ایک برادرانہ مشورہ دیتا ہوں۔ آپ کے پاس صرف یہ وقت ہے کہ آپ سچی بات بتا دیں گے تو آپ کو اس کا صلہ مل جائے گا۔ ہمیں دوسروں سے سچ بات معلوم ہوئی تو پھر آپ نہیں جانتے کہ آپ کا انجام کیا ہو گا۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ بھی جان لیں کہ اس کیس کی تفتیش سی آئی اے کر رہی ہے۔ ابھی تو آپ کے ساتھ باعزت طریقے سے باتیں ہو رہی ہیں۔ کوشش کریں کہ ہم دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں''۔

''آپ کے دل میں شک کیا ہے جناب؟'' ___ اس نے پوچھا۔

''شک نہیں جناب!'' ___ میں نے کہا ___ ''شک نہیں، یقین ...... ہم ایک یقین کو سامنے رکھ کر بات کر رہے ہیں۔ جمیل کو آگ میں گرایا گیا ہے اور اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے''۔

''لیکن حضور!'' ___ اس نے کھسیانے سے لہجے میں کہا ___ ''اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہئے''۔

''وجہ آپ بتائیں گے ٹھیکیدار صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''دولت کا نشہ اتنا بڑا ہے کہ ذہن اور دل سے خدا کو بھی نکال دیتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اس لڑکے نے آپ کی بیٹی کے ساتھ دست درازی کی ہو گی یا آپ کی بیٹی اس لڑکے کے ساتھ قابل اعتراض حد تک بے تکلف ہو گئی ہو گی اور آپ نے ان دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہو گا''۔

ٹھیکیدار نے اس بات پر ناچنا کودنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ آپ میری بیٹی کو ایسا بد

چلن نہ کہیں۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ میں جمیل کے چال چلن کے بارے میں ایسی کوئی بات گوارا نہیں کرسکتا۔

''پھر دوسری بات یہ ہے'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''آپ کا میٹ اور کوئی دوسرا آدمی بھٹے سے پیسے مارتے ہوں گے اور جمیل ان کے لئے رکاوٹ بن گیا ہوگا اور ہوسکتا ہے اس نے کسی کو پکڑ بھی لیا ہو اور کہا ہو کہ وہ اس کی رپورٹ آپ کو دے گا۔ جمیل کو خاموش کرنے کا طریقہ ان لوگوں نے یہ اختیار کیا کہ اسے آگ میں دھکیل دیا''۔

''اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا'' ـــــ ٹھیکیدار نے کہا ـــــ ''میں خود بھی جاسوسی کروں گا اور آپ بھی تفتیش کریں''۔

''ٹھیکیدار صاحب!'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''آپ سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی عزت قائم رہے۔ ہم آپ کو کل شام تک مہلت دیتے ہیں۔ اپنا بھلا برا سوچ لیں اور آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو وہ بتا دیں۔ اب آپ چلے جائیں''۔

دولت کا نشہ، ٹھیکیدار کی بیٹی

ٹھیکیدار کے جانے کے بعد ہم نے اس کے میٹ کو بلایا۔ وہ پینتیس چھتیس سال کا چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شریف آدمی نہیں۔ اس سے ہم نے پوچھا کہ وہ کب سے اس بھٹے پر کام کرتا ہے۔ خلیل الرحمان کا یہ بھٹہ خاصا پرانا تھا اور یہ میٹ اس بھٹے پر تقریباً دس سالوں سے تھا۔ اس نے اپنا نام سراج الدین بتایا لیکن وہ ساگری کے نام سے مشہور تھا۔

''ایک بات ذہن میں رکھ لو ساگری!'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''جھوٹ بولو گے تو پس جاؤ گے۔ یہ دولت مند لوگ اپنے جرم اور گناہ اپنے ملازموں کے کھاتے میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ تمہارے ٹھیکیدار صاحب بھی کچھ ایسی ہی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے تو پہلے ہی بتا دو۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا پھر تم ہمارے شکنجے سے نہیں نکل سکو گے...... یہ بتاؤ کہ جمیل کو ٹھیکیدار نے دوسرے کاموں سے ہٹا کر بھٹے پر کیوں لگا دیا تھا؟''

''بھٹے کا منشی چلا گیا تھا'' ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ ''اس کی جگہ جمیل آیا تھا''۔
منشی کب سے اس بھٹے پر ہے؟''

''چھ سات سالوں سے!'' ـــــ اس نے جواب دیا۔

''وہ پہلے بھی کبھی چھٹی گیا ہے؟''

''میرا خیال ہے'' ـــــ اس نے سوچ کر جواب دیا ـــــ ''تین سال پہلے چھٹی گیا تھا''۔

''کیا اس وقت بھی ٹھیکیدار نے جمیل کو یا کسی اور کو اس کی جگہ بھٹے پر بھیجا تھا؟''

''نہیں عالی جاہ!'' ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ ''ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی''۔

''بھٹے پر کون پیسے کھاتا ہے؟'' ـــــ میں نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں عالی جاہ!'' ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ ''باقاعدہ کیش میمو بنتے ہیں۔ پیسے مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''پیسے تم مارتے ہو'' ـــــ میں نے اسے بھڑکانے کے لئے جھوٹ بولا ـــــ ''اسی لئے ٹھیکیدار نے جمیل کو بھٹے پر بھیجا تھا''۔

''کیا یہ ٹھیکیدار صاحب کہتے ہیں؟'' ـــــ اس نے پوچھا۔

''ٹھیکیدار صاحب بہت کچھ کہتے ہیں'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''ٹھیکیدار نے صرف یہی ایک بات نہیں بتائی۔ وہ تمہاری اور کرتوت بھی بتا رہا ہے۔ میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان دولت مند ٹھیکیداروں اور جاگیرداروں کی وفاداری بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنے وفادار نوکروں اور مزاعوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ اگر تم کوئی بات اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہو تو وہ ہمیں بتا دو''۔

میں نے اس کے چہرے پر نمایاں تبدیلی دیکھی۔ میں نے اور ٹینیسن نے اس پر کئی اور سوال پھینکے۔ ہم اس کے جوابوں پر اتنی توجہ نہیں دیتے تھے جتنی توجہ ہم اس کے بدلتے ہوئے انداز اور چہرے کے تاثرات کو دیتے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس شخص کے دل میں کوئی بات ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص استاد ہے اور بغیر شہادت اور ثبوت کے ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسے ہم نے کچھ دیر کے لئے دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور ہم دونوں انسپکٹر اس کے متعلق آپس میں تبادلہ خیالات کرنے لگے۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن سے کہا کہ مزدوروں پر جو میٹ مقرر کئے جاتے ہیں وہ پکے جرائم پیشہ اور غنڈے ہوتے ہیں۔ بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں اور مالکوں کو تو میں بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ کچی اینٹیں بنانے کے لئے پورا پورا کنبہ کام کرتا تھا۔ ان میں

نوجوان عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ میٹ اور مالک ان کو مزدوری سے ہٹا دینے کی دھمکی دے کر اور کام کم کر دینے کا لالچ دے کر انہیں خراب کرتے تھے۔ تھے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اس وقت ہی ہوتا تھا، آج کل پاکستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی اخباروں میں کسی بھٹے کی یا بھٹے کے مزدوروں کے متعلق کوئی خبر آ جاتی ہے۔ بھٹوں پر مزدوروں کے ساتھ ناانصافی، حقوق کشی اور ان کی عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی شروع سے ہی ہو رہی ہے۔ ان بھیڑوں کی رکھوالی پر مالک دو تین بھیڑیئے رکھتے ہیں۔ نہ رکھیں تو مزدور قابو میں نہیں رہتے۔

ٹھیکیدار خلیل الرحمان کا یہ میٹ جس کا نام ساگری تھا، ایسے ہی بھیڑیوں میں سے تھا۔ اس نے خود اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ غنڈہ اور بدمعاش ہے، یہ رائے ہماری تھی جو ہم نے اس کی باتوں اور اس کے انداز سے قائم کی تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ اکیلا میٹ ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اکیلا ہے۔

میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے آپس میں تبادلہ خیال کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس شخص کو بھٹے پر نہ جانے دیا جائے ورنہ اس کے ڈر سے کوئی مزدور صحیح بات نہیں بتائے گا۔ ہم نے اگلے روز بھٹے پر جانا اور وہاں سے مزدوروں سے تفتیش کرنی تھی۔

ساگری کو دوسرے کمرے سے بلا کر ہم نے پھر اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس سے پوچھا کہ جمیل اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے کیسا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جمیل ٹھیکیدار صاحب کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھا اس لئے سب اس کی عزت کرتے تھے۔ میں نے اپنے شک کی بنا پر اس سے پوچھا کہ ٹھیکیدار کی بیٹی کے ساتھ جمیل کا کیا چکر چل رہا تھا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کوئی چکر تھا بھی یا نہیں، یہ بات اگلوانے کا ایک انداز تھا۔ میں ساگری کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

''میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں جانتا عالی جاہ!'' ـــــ ساگری نے جواب دیا ـــــ ''لڑکا ان کا اپنا تھا۔ ان کے گھر بھی جاتا تھا اور لڑکی کے ساتھ کالج جاتا بھی تھا اور آتا بھی تھا۔ میں نے کبھی کوئی بات نہیں سنی''۔

''اور لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟'' ـــــ میں نے پوچھا۔

''لڑکی پردہ نشین ہے'' ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ ''برقعے میں کالج جاتی ہے اور

میں نے سنا ہے کہ گھر سے باہر نہیں نکلتی ـــــ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں عالی جاہ! ٹھیکیدار صاحب کے اپنے خاندان کی عورتیں ہی نہیں بلکہ ان کی ساری رشتہ دار عورتیں پردے میں رہتی ہیں اور صحیح معنوں میں شریف عورتیں ہیں۔ ٹھیکیدار صاحب کو اچانک دولت مل گئی۔ انہوں نے تو شراب بھی پینی شروع کر دی اور دوسری عیاشیوں میں پڑ گئے لیکن ان کی عورتیں جیسے پہلے تھیں ویسی ہی اب ہیں''۔

''جمیل جب بھٹے میں گرا اس وقت تم اس کے ساتھ تھے؟'' ـــــ میں نے اس سے پوچھا ـــــ ''کیا تم نے اسے روکا نہیں تھا کہ آگے نہ جاؤ؟''

''ہاں عالی جاہ!'' ـــــ اس نے کہا ـــــ ''میں نے اسے روکا تھا لیکن پیچھے ہٹتے اس کا پاؤں ایسا پھسلا کہ وہ گر پڑا اور جل گیا...... میرا خیال ہے کہ اسے بھٹے کی آگ دیکھنے کا شوق تھا''۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ بے شمار سوال و جواب کے ذریعے ہم جان چکے تھے کہ یہ شخص پکا بدمعاش ہے، اس کے باوجود ہم نے اس پر سوالوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ یہ واضح ہو گیا کہ یہ شخص استاد غنڈہ ہے۔ اسے ہم نے باقاعدہ گرفتار نہ کیا، ڈیوٹی والے اے ایس آئی سے کہا کہ اسے ہیڈ کوارٹر میں ہی رکھا جائے اور ادھر ادھر نہ ہونے دیا جائے۔

ایک پردہ اُٹھ گیا

اگلے روز صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہم بھٹے پر چلے گئے۔ ٹھیکیدار کو ہم نے نہیں بتایا تھا کہ ہم وہاں جائیں گے۔ وہاں وہی منشی تھا جو چھٹی چلا گیا تھا اور اس کی جگہ جمیل آیا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جس طرح گپ شپ لگائی جاتی ہے۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ گزشتہ روز اس نے ہمیں دیکھا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ جوان سال آدمی خوداعتمادی سے بات کرتا ہے اور اس کا انداز کچھ دوستانہ سا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ مزدوروں کے میٹ ساگری سے مرعوب ہے۔ ساگری کا ذکر آتا تھا تو وہ جھینپ جاتا اور اپنی کوئی رائے نہیں دیتا تھا۔

''تم پچھلی چھٹی کب گئے تھے؟'' ـــــ میں نے سوچھا۔

''شاید تین سال ہو گئے ہیں'' ـــــ اس نے جواب دیا۔

''ان تین سالوں میں تمہیں چھٹی نہیں ملی یا خود ہی نہیں گئے؟'' ـــــ میں نے پوچھا۔

''میں کہیں دور کا رہنے والا نہیں'' ___ اس نے جواب دیا اور ایک ہاتھ لمبا کر کے اشارہ کیا اور بولا ___ ''وہ جو گلی نظر آ رہی ہے، اس میں میرا گھر ہے۔ کبھی کوئی نرمی گرمی ہو جائے تو ایک آدھ دن کے لئے گھر چلا جاتا ہوں''۔

''اب شاید کوئی لمبا کام آ پڑا تھا؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب!'' ___ اس نے کہا ___ ''ٹھیکیدار صاحب سے ذکر نہ کیجئے گا۔ کوئی کام نہیں تھا۔ ساگری نے ایک روز کہا کہ تم چھٹی لے سکتے ہو پھر لیتے کیوں نہیں؟ ٹھیکیدار نے تمہیں کب انعام دیا یا آئندہ انعام دے گا۔ کچھ دنوں کی چھٹی لو اور آرام کرو، گھومو پھرو''۔

میں اس کے ساتھ چھٹی کے متعلق کسی اور خیال سے یا شاید ویسے ہی بات چھیڑ بیٹھا تھا یا شاید چھٹی حس تھی کہ میں نے اس سے چھٹی کے متعلق پوچھا تھا لیکن اس نے ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو چونکا دیا۔ اس نے ہنستے مسکراتے ہوئے کہا کہ اسے چھٹی کی ضرورت نہیں تھی، ساگری اس کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ ضرورت نہیں تو بھی وہ چھٹی جائے، یہ اس کا حق ہے اور اپنے حق چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس نے بتایا کہ ساگری نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ٹھیکیدار سے چھٹی لے دے گا۔ ساگری نے اسے ایک ہفتے کی چھٹی لے بھی دی۔

''میں نے کہا چلو اچھا ہے'' ___ منشی نے کہا ___ ''سیر سپاٹا اور آرام کر کے میں چھٹی گزار آیا لیکن جمیل آگ میں گر کر راکھ ہو گیا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ نہ میں چھٹی جاتا نہ اسے میری جگہ بھٹے پر بھیجا جاتا''۔

وہ تو سادگی میں یہ بات کہہ گیا لیکن میرا ذہن اس انکشاف پر اٹک گیا کہ اسے ساگری نے چھٹی بھجوایا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ منشی کو چھٹی بھجوانا جمیل کے قتل کی سازش کی ایک کڑی تھی۔ اس بہانے جمیل کو بھٹے پر لانا اور اسے آگ میں پھینکنا تھا۔ ہمیں اب اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی کہ یہ سازش اور پلاننگ اکیلے ساگری کی تھی یا اس میں ٹھیکیدار خلیل الرحمان بھی شامل تھا۔ منشی نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اس نے کتنی اہم بات کہہ دی ہے۔ میں نے اور ٹینیسن نے اس سے کچھ باتیں پوچھیں لیکن اس کی زبان سے ہمیں اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔

''تم تو بڑے کام کے آدمی ہو یار!'' ___ میں نے منشی کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا ___ ''میرا خیال ہے کہ یہ بھٹہ تم ہی چلا رہے ہو۔ ساگری تو غنڈہ گردی کے سوا کچھ بھی

نہیں کرتا ہوگا''۔

اس طرح میں نے اسے خوب ہوا دی تا کہ وہ کچھ اور اگل دے۔ انسپکٹر ٹینیسن نے بھی اسے دانشمند اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے ڈالے۔

''ایک بات بتاؤ ادریس!'' ___ میں نے اس کہا ___ ''جمیل کو مرے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ تم چھٹی سے واپس آئے تو تم نے یہاں کے مزدوروں سے پوچھا ہوگا کہ جمیل آگ میں کیسے گرا تھا۔ تم نے ساگری سے بھی پوچھا ہوگا۔ یہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''سب حیران تھے'' ___ منشی نے جواب دیا ___ ''حیران اس پر کہ وہ آگ میں گرا کیسے! اتنی زیادہ آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا...... ساگری کہتا تھا کہ جمیل بیوقوف لڑکا تھا''۔

''ایک اور بات ادریس!'' ___ میں نے کہا ___ ''یہ بات بھی تم ہی بتا سکتے ہو۔ کیا ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ جمیل نے یہاں کسی لڑکی پر ہاتھ رکھا ہو اور ساگری اس لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو''۔

''اب میری ایک بات سن لیں صاحب!'' ___ منشی نے کہا ___ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کسی نے مجھے ایسا واقعہ نہیں سنایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساگری کے بارے میں یہاں کوئی آدمی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں''۔

''کہاں ہے ساگری؟'' ___ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

''وہ ابھی آ جائے گا'' ___ منشی نے جواب دیا ___ ''دس ساڑھے دس بجے آیا کرتا ہے''۔

''وہ اب نہیں آئے گا'' ___ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ___ ''وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ہماری حوالات میں بند ہے''۔

منشی نے آنکھیں پھاڑ کر ٹینیسن کے منہ پر نظریں جما دیں۔

''حیران مت ہو ادریس!'' ___ میں نے اسے کہا ___ ''ساگری کو ہم نے گرفتار کر لیا ہے''۔

انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے الگ کر کے کہا کہ ساگری کے متعلق اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ وہ اس واردات میں ملوث ہے۔ منشی ٹھیک کہتا ہے کہ ساگری کی موجودگی میں کوئی

مزدور اس کے خلاف بیان نہیں دے گا نہ ہی کوئی سچی بات بتائے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ساگری کو ہتھکڑی لگا کر بھٹے پر لایا جائے تاکہ سب کو یقین ہو جائے کہ ان کا میٹ گرفتار ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی یہ تجویز اچھی لگی لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اسی وقت اپنے آفس جائیں اور اسے ہتھکڑی لگا کر لے آئیں۔

''وہ کہاں کا معزز آدمی ہے ملک!''۔۔۔ ٹینیسن نے کہا۔۔۔ ''ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجتے ہیں کہ اسے ہتھکڑی لگا کر لے آئے۔ بعد میں اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ملی تو چھوڑ دیں گے''۔

ہمارے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل تھا جو ہماری جیپ کا ڈرائیور بھی تھا۔ میں نے انہیں بلایا اور کہا کہ ساگری کو ہتھکڑی لگا کر لے آئیں۔

مزدوروں کی خوفزدگی

منشی کو جب یقین ہو گیا کہ ان کا غنڈہ میٹ ساگری گرفتار ہو گیا ہے تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''یہ حادثہ میری غیر حاضری میں ہوا ہے''۔۔۔ منشی نے کہا۔۔۔ ''اگر میں یہاں ہوتا تو مجھے کچھ تو پتہ چل جاتا۔ مجھے اب کچھ سمجھ آ رہی ہے کہ ساگری کیوں میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ چھٹی جاؤ، اور پھر خود ہی ٹھیکیدار صاحب سے مجھے چھٹی دلوا دی۔ یقین کریں کہ مجھے ایک ہفتہ چھٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ساگری کے متعلق میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ بھٹے کے تمام مزدور اس سے ڈرتے ہیں اور یہ شخص من مانی کرتا ہے''۔

منشی نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ دلی کے کون سے علاقے میں رہتا ہے اور کس محلے اور گلی میں اس کا گھر ہے۔

میں نے منشی سے پوچھا کہ ہمیں ایسی باتیں کون بتا سکتا ہے کہ بھٹے میں کچی اینٹیں رکھی جا چکی تھیں اور آگ بھی جلا دی گئی تو اس وقت کون کون یہاں تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ کچی اینٹیں بنانے والے مزدور بھٹے سے کچھ دور اور گہرائی میں ہوتے ہیں...... منشی نے پانچ آدمیوں کے نام لئے۔ میرے کہنے پر اس نے ان آدمیوں کو بلا لیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو الگ کر لیا۔

''ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے بھائی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ بتاؤ کہ

جب جمیل آگ میں گرا، اس وقت تم کہاں تھے''۔

اس غریب سے آدمی کا ردِعمل یہ تھا کہ اس کے چہرے پر بے بسی صاف نظر آنے لگی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میری طرف یوں دیکھا جیسے رو پڑے گا۔ یہ التجا اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی کہ جناب مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔

''میں نے کہا ہے ڈرو نہیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''جس سے تم ڈرتے ہو وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ ابھی تمہارے سامنے آ جائے گا اور تم جو بھی بات بتاؤ گے، وہ کسی کو نہیں بتائی جائے گی''۔

پھر بھی وہ خاموش رہا۔ میں اس پر پولیس والا رعب جھاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ فلاں جگہ کھڑا تھا اور اس نے جمیل کو ساگری کے ساتھ بھٹے کی خندق کے ساتھ ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین اور مزدور وہاں کام کر رہے تھے اور ساگری نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سب کو ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، ادھر چلے جاؤ۔ وہ آدمی ہٹے تو فوراً بعد ساگری نے شور مچایا کہ لڑکا آگ میں گر پڑا ہے۔ یہ سب آدمی دوڑے گئے۔

جب یہ مزدور مجھے یہ باتیں بتا رہا تھا تو اس کی زبان رک رک کر چلتی تھی، اور جب اس نے بتایا کہ وہ بھی دوڑا گیا اور جمیل کو آگ میں جلتے دیکھا تو اس مزدور کی زبان رک گئی۔ اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا، ہونٹ کانپنے لگے اور میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے انگریزی میں کہا کہ اس شخص کو بٹھا دو اور اسے پانی پلاؤ ورنہ یہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ یہ غریب آدمی اس منظر کو بیان کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا جب جمیل اتنی ہولناک آگ میں جل رہا تھا...... میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور منشی سے کہا کہ اسے پانی پلائے۔ میں نے اسے بہت تسلی دی۔ اس نے پانی پی کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔

''حضور!''۔۔۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ''مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں''۔

پھر میں نے ان تینوں آدمیوں کو باری باری الگ کیا اور وہی سوال پوچھے جو اس مزدور سے پوچھے تھے اور ہر ایک کا ردِعمل وہی تھا جو پہلے مزدور کا تھا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ ساگری نے انہیں ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس وقت ساگری اور جمیل کس طرح چل رہے تھے، یعنی آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ؟...... انہوں نے بتایا کہ جمیل آگ کی

طرف تھا اور ساگری اس کے دوسری طرف کے پہلو کے ساتھ چل رہا تھا۔

میں نے ان سے ساگری کے متعلق کچھ اور باتیں پوچھیں تو سب نے گول مول سے جواب دیئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ڈر کے مارے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔

اتنے میں ٹھیکیدار آ گیا اور سیدھا ہمارے پاس آ کر اس طرح حرکتیں اور باتیں کرنے لگا جیسے ہمارا لنگوٹیا یار یا بے تکلف دوست ہو۔

''آپ یہاں سے غائب ہو جائیں'' ـــــ میں نے کہا۔

''یہاں رہوں تو کوئی حرج تو نہیں!'' ـــــ اس نے بے تکلفی سے کہا اور اس کے ساتھ ہی پوچھا ـــــ ''میرا وہ آدمی واپس نہیں آیا۔ آپ نے اسے تفتیش کے لئے میرے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں بلایا تھا''۔

''وہ ابھی آ جائے گا'' ـــــ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ـــــ ''آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ جب ہمیں ضرورت محسوس ہوگی آپ کو بلا لیں گے...... فوراً چلے جائیں''۔

''ایک بات یاد رکھنا ٹھیکیدار صاحب!'' ـــــ میں نے ذرا دبدبے سے کہا ـــــ ''یہاں کے کسی ورکر سے آپ نے یہ نہیں پوچھنا کہ ہم نے اس سے کیا پوچھا ہے اور اس نے کیا جواب دیئے ہیں۔ کسی ورکر کو یہ نہیں بتانا کہ وہ کیا جواب دے اور کس سوال پر خاموش رہے۔ اگر آپ نے کسی ورکر پر اس طرح کا دباؤ یا اثر ڈالا تو ہم آپ کو گرفتار کر لیں گے''۔

ٹھیکیدار سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

ان تین چار مزدوروں سے ہمیں دو اور آدمیوں کا پتہ چلا کہ وہ بھی یہاں موجود تھے۔ ہم نے انہیں بلایا اور دانستہ وقت ضائع کرنے لگے۔ ہمیں ساگری کا انتظار تھا...... اسے لانے کے لیے جیپ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے لے آئے۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور ویسے ہی ٹہلتے ٹہلتے بھٹے کے اردگرد گھومنے پھرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ مزدور کام چھوڑ کر حیرت زدگی کے عالم میں ساگری کو ہتھکڑیوں میں بندھا دیکھ رہے تھے۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرعون بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔ پھر ہم نے اسے ایک جگہ بٹھا دیا۔ پھر ہم نے ان دو مزدوروں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انہیں بتایا کہ دیکھ لو تمہارا میٹ ہتھکڑیوں میں بندھا ہوا ہے اب اس سے نہ ڈرو۔

انہوں نے وہی باتیں بتائیں جو پہلے مزدور بتا چکے تھے۔ ایک مزدور نے تو یہ بھی بتایا کہ اسے یقین تو نہیں لیکن اسے ایسے لگا تھا جیسے ساگری نے لڑکے کو آگ میں دھکیلا ہو۔ وہ

یقین اور شک کے درمیان بات کر رہا تھا۔ بہرحال اس کی اس بات سے یہ یقین ہو گیا کہ ساگری جمیل کو آگ کے بہت قریب لے گیا تھا۔

ہمیں کوئی ایسی شہادت تو نہ ملی کہ ساگری نے جمیل کو آگ میں دھکیلا تھا، یہ شک پختہ ہو گیا کہ جمیل کو جلانے میں ساگری کا ہاتھ ہے۔

اس کے بعد ہم نے مختلف مزدوروں سے ساگری کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے اس کے سارے اعمال سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے بھرے بیٹھے ہوں۔ انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ کچھ باتیں جو میں پہلے بتا چکا ہوں، ان میں ایک نئی بات کا یہ اضافہ ہوا کہ وہ ہر مزدور سے پانچ روپے فی مزدور ماہانہ کمیشن لیتا تھا۔ بعض پورے کنبے مزدوری کرتے تھے ان سے بھی پانچ روپے فی کس لیتا تھا، مثلاً ایک کنبے کے پانچ بڑے افراد اور دو بچے ہیں جو ایک ایک اینٹ اٹھا سکتے ہیں تو وہ بچوں کے بھی پانچ پانچ روپے اور بڑوں کے بھی پانچ روپے وصول کرتا تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت کے پانچ روپے آج کے سو روپے کے برابر تھے۔ مزدوروں کی نوجوان لڑکیوں کو وہ اپنی زرخرید لونڈیاں سمجھتا تھا۔

انسپکٹر ٹینیسن نے مجھے یاد دلایا کہ گذشتہ رات ساگری سے پوچھا تھا کہ وہ اس وقت جمیل سے کتنی دور تھا جب جمیل آگ میں گرا تھا۔ ساگری نے جواب دیا تھا کہ وہ اس سے دور تھا اور اس نے جمیل کو آگے جانے سے منع کیا تھا اور جمیل پیچھے ہٹنے لگا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ آگ میں جا پڑا، لیکن اب ہر وہ مزدور جس نے انہیں دیکھا تھا، وہ بتا رہا تھا کہ ساگری جمیل کے پہلو کے ساتھ لگا ہوا جا رہا تھا۔ ایک مزدور نے تو اس شک کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ ساگری نے جمیل کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔

ہم نے وہاں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ بہت حد تک حاصل کر لیا تھا۔ آدھا دن وہیں گزر گیا تھا۔ ہم نے ساگری کو گاڑی میں بٹھایا اور واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ ساگری کو تفتیش کے کمرے میں بٹھا کر کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے۔ اس نے وہی جواب دیا جو ملزم دیا کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے اور وہ اقبالی جرم کس جرم کا کرے۔ ہم نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ ہم دوسرے طریقے سے اس کی زبان کھلوا سکتے تھے لیکن اس کے متعلق پولیس کی رپورٹ لینا بہتر سمجھا۔

یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ وہ کون سے علاقے کا رہنے والا ہے۔ یہ پرانی دلی کا علاقہ

ہے۔ میں نے اس علاقے کے تھانے کے ایس ایچ او کو فون کیا اور اسے ساگری کا پورا نام اور عرفیت بتا کر کہا کہ اس کے متعلق مجھے پوری رپورٹ بہت جلدی چاہئے۔
میں نے یہ بھی کہا کہ اسے کوئی جاننے والا آدمی ہو تو اسے بھی میرے پاس بھیج دیا جائے۔

ایک طوائف، جوان اور حسین

ایس ایچ او نے مجھے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ شخص تھانے کے ریکارڈ پر ہے اور ایک بار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ اس کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ایک آدمی مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے گھر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک بند لفافہ دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔ یہ ساگری کی ہسٹری تھی۔ اسے دو سال سزا چاقو زنی کی واردات میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی جھگڑے میں دو بار پکڑا گیا تھا لیکن تھانے والوں نے راضی نامہ کرا دیا تھا۔ چاقو زنی میں ہی ایک بار پکڑا گیا لیکن عدم ثبوت کی بناء پر بری ہو گیا تھا۔ تھانیدار نے اپنی رائے لکھی تھی کہ پکا غنڈہ اور بدمعاش ہے اور دلیر بھی ہے۔ پولیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی رہی ہے۔
یہ رپورٹ طویل اور بڑی واضح تھی۔ جو آدمی یہ رپورٹ لایا تھا، وہ اس تھانے کا پرانا کانسٹیبل تھا۔ تھانیدار نے اس کانسٹیبل کو خاص طور پر بھیجا تھا کیونکہ اس کانسٹیبل کے ساتھ ساگری کی بڑی گہری یاری تھی۔ اس کانسٹیبل نے خود ہی کہا کہ وہ ساگری کی پوری رپورٹ دے سکتا ہے۔ اس نے ساگری کی زندگی کی پوری کہانی اور اس کے جرائم کی تفصیلات سنا ڈالیں۔ اس نے اجمیری گیٹ کی ایک طوائف کا نام بتایا جس کے ساتھ ساگری کے گہرے تعلقات تھے اور وہ فارغ وقت اسی کے ہاں گزارتا تھا۔
دلی میں اجمیری گیٹ کے اندر عصمت فروشی کا مشہور اور بہت بڑا بازار تھا۔ میں نے اس کانسٹیبل سے اس طوائف کا ایڈریس بھی معلوم کر لیا۔ کانسٹیبل کو میں نے واپس بھیج دیا۔
اگلے روز میں اپنے دفتر گیا تو میں نے ٹینیسن کو ایس ایچ او کی تحریری رپورٹ بھی دکھائی اور کانسٹیبل نے جو باتیں زبانی بتائی تھیں وہ بھی سنائیں۔ ٹینیسن نے کہا کہ اس طوائف کو ابھی بلایا جائے۔ ہم نے اپنے ایک اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ گاڑی لے جائے، ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے اور اس طوائف کو ساتھ لے آئے۔
یہاں میں آپ کو عادی مجرموں کی نفسیات بتاتا ہوں۔ ان لوگوں کی تفریح یہی ہوتی

تھی کہ طوائفوں کے پاس جا کر شراب پیتے تھے اور لوٹے ہوئے مال سے عیش و عشرت کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں تو ان لوگوں کی فطرت میں شامل تھیں اور یہی ان کی زندگی تھی لیکن قتل ایک ایسی واردات ہے جو کوئی بھی انسان ہضم نہیں کر سکتا۔ عموماً دیکھا گیا کہ عادی قاتل بھی قتل کی واردات کر کے اپنی مخصوص طوائف کے پاس جاتے اور شراب کے نشے میں بڑے فخریہ انداز میں طوائف کو بتاتے تھے کہ وہ قتل کی واردات کر آئے ہیں۔
ہم نے اس طوائف کو اسی توقع پر بلایا تھا کہ اس سے کوئی سراغ مل جائے گا۔
تقریباً ایک گھنٹے کے بعد طوائف آ گئی۔ وہ تقریباً تیس سال عمر کی اچھی خوبصورت طوائف تھی۔ ہم نے اسے بٹھایا۔ اس کی گھبراہٹ اور خوف قدرتی تھا۔ ہم نے اسے ذہنی طور پر نارمل حالت میں لانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں بلکہ ٹینیسن نے تو اس کے حسن کی تعریف شروع کر دی اور کہا کہ وہ اس کے پاس آنا چاہتا ہے۔ ٹینیسن اردو اچھی خاصی بولتا تھا۔
’’میں ایک بات بتا دیتا ہوں‘‘ — انسپکٹر ٹینیسن نے اسے کہا — ’’یہ نہ سمجھنا کہ ہم پولیس والے ہیں اس لئے تمہارے پاس مفت آئیں گے۔ ہم حسن کی قدر کرنے والے آدمی ہیں۔ تمہیں پوری اجرت اور بخشش بھی دیں گے‘‘ — ٹینیسن مجھ سے مخاطب ہو کر بولا — ’’کیوں ملک! تمہارا کیا خیال ہے‘‘۔
’’میرا خیال پوچھتے ہو؟‘‘ — میں نے کہا — ’’یہ پیشہ ور عورت تو لگتی ہی نہیں۔ یہ کسی بڑے اونچے گھرانے کی کالج میں پڑھنے والی نوجوان لڑکی لگتی ہے...... ہم اس کے گھر جائیں گے‘‘۔
وہ آخر طوائف تھی جس کا سوسائٹی میں نہ کوئی مقام تھا نہ کوئی وقار تھا، ہم نے اسے ہوا دینی شروع کی تو وہ غبارے کی طرح پھولتی ہی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا کہ ہم نے اسے کیوں بلایا ہے۔
’’تمہارا یار پھانسی چڑھ رہا ہے‘‘ — میں نے کہا۔
’’کون؟‘‘
’’ساگری!‘‘ — میں نے کہا — ’’اس رات وہ تمہارے پاس گیا تھا اور اس نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ وہ پورا بیان دے چکا ہے۔ تمہیں صرف تصدیق کے لئے بلایا ہے‘‘۔
’’ہاں!‘‘ — اس نے اس طرح کہا جیسے آہ لی جاتی ہے — ’’میرے پاس آیا تھا۔ اس رات وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ نشے میں وہی تباہی بکتا رہا اور اوٹ پٹانگ باتیں بھی کرتا

رہا۔ اس نے کہا کہ آج دولت کمائی ہے۔ ایک لڑکے کو جلا کر راکھ کر دیا ہے، ہے کوئی جو میرے سامنے آئے!...... میں سمجھی کہ ڈھینگیں مار رہا ہے''۔

''نہیں!''___ میں نے کہا___ ڈھینگیں نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا...... تمہیں اس نے کتنی رقم بتائی تھی؟''

''پانچ ہزار کہتا تھا''___ اس نے جواب دیا___ ''میں نہیں مانی تھی۔ اتنی زیادہ رقم کون دیتا ہے''۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگ یقین نہ کریں کہ اس طوائف نے فوراً راز اگل دیا۔ حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ دیکھیں کہ وہ طوائف تھی اور یہ بھی ذہن میں رکھیں کی طوائف اس کی بھی نہیں ہوتی جس سے وہ ہزار ہا روپیہ کھاتی ہے اور ایسے کہتی ہے کہ وہ بس اسی کی ہے۔ طوائف یا کوئی بھی فاحشہ عورت روپے پیسے اور اپنی عیش وعشرت سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کی ذات جذبات سے خالی ہوتی ہے اور جو لوگ اسے جذباتی سمجھتے ہیں وہ اس کی ایکٹنگ ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے آنسو نکال لیتی ہے اور جب چاہے قہقہے بکھیرنے لگتی ہے۔ ساگری نے اسے اپنی محبوبہ بنا رکھا تھا اور اس طوائف نے بھی اسے یہی تاثر دے رکھا ہوگا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اور اس پر مرمٹی ہے لیکن اسے دو نئے گاہک اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ دونوں پولیس انسپکٹر تھے اور ان میں ایک انگریز تھا۔ طوائف کو کیا پڑی تھی کہ وہ ساگری کے لئے جھوٹ بولتی۔

طوائف کو ہم نے اس طرح رخصت کیا کہ اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ یہ ہماری گواہ تھی۔

آتشِ نمرود اور عشق

طوائف کے جانے کے بعد ہم نے ساگری کو حوالات سے نکلوا کر اپنے سامنے بٹھایا اور اسے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے۔ ابھی تک وہ انکار پر ڈٹا ہوا تھا۔ ہم نے ساری شہادت اس کے آگے رکھ دی۔ تھانے میں سے جو رپورٹ آئی تھی، وہ اس کے آگے رکھی، طوائف کا حوالہ دیا۔

''دیکھ ساگری!''___ میں نے کہا___ ''اگر تم اقبالی بیان نہیں دو گے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا نقصان تمہارا ہوگا۔ بیان دے دو، تو پوری کوشش کریں گے کہ تمہیں کم

سے کم سزا ملے۔ اگر پریشان کرو گے تو ہم تمہیں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچائیں گے...... تم نے کس شخص پر بھروسہ کیا ہے؟ ٹھیکیدار نے بیان دیا ہے کہ تم نے جمیل کو اپنی کسی دشمنی کی بناء پر آگ میں دھکا دیا تھا۔ ٹھیکیدار نے ہمیں گواہ بھی دیئے ہیں...... اور پھر ایک طوائف پر تم نے بھروسہ کیا جو ابھی ابھی ہمیں بیان دے گئی ہے۔ اگر بیان نہیں دو گے تو ہم تمہیں باعزت طریقے سے تو رکھیں گے نہیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ سی آئی اے والے ملزموں سے کس طرح بیان لیا کرتے ہیں''۔

وہ خود جرائم پیشہ تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس کا ٹارچر کیسا ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے آگے جو شہادت رکھی تھی، وہ ایسا جال تھا جس سے وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹھیکیدار کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور اقبالی بیان دینے پر آ گیا۔ عموماً اقبالی بیان بہت لمبے ہوا کرتے ہیں۔ ساگری کا بیان بھی خاصا لمبا تھا۔ میں اس کے ضروری حصے سناتا ہوں۔

ساگری ٹھیکیدار کا محافظ تھا اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کو کنٹرول کرنا بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ کاروبار کے سلسلے میں ٹھیکیدار کو ضرورت پڑتی کہ فلاں شخص کو ڈرانا دھمکانا ہے یا رکی ہوئی رقم نکلوانی ہے تو وہ ساگری کو استعمال کرتا تھا۔ ایک روز ٹھیکیدار نے اسے کہا کہ جمیل کو زمین کے تختے سے اٹھا دینا ہے۔ ساگری نے وجہ پوچھی تو ٹھیکیدار نے وجہ یہ بتائی کہ اس کی بیٹی جمیل کے ساتھ تانگے پر کالج جایا آیا کرتی تھی۔ ٹھیکیدار خاندانی امیر کبیر نہیں تھا۔ یہ لوگ دِلی کے ایک پرانے محلے میں رہتے تھے اور ایک ہی برادری تھی۔ جمیل اور ٹھیکیدار کی بیٹی بچپن سے اکٹھے کھیلتے تھے۔ لڑکپن تک ان کا پیار ان کی روحوں میں اُتر چکا تھا۔ پھر یہ نوجوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ٹھیکیدار کی قسمت کا دروازہ کھل گیا اور وہ دولت مند ٹھیکیدار بن گیا۔ ادھر جمیل یتیم ہو گیا۔ گھر کی دال روٹی پوری کرنی بھی محال ہو گئی۔

جمیل نے دس جماعتیں پاس کر لیں تو ٹھیکیدار نے اس پر رحم کیا اور ملازم رکھ لیا۔ ٹھیکیدار نے جمیل کو یہ ڈیوٹی بھی دے دی کہ وہ ٹھیکیدار کی بیٹی کو تانگے پر کالج چھوڑ آیا کرے اور واپس بھی لے آیا کرے۔ ان دونوں میں پہلے ہی محبت تھی۔ انہیں بڑا اچھا اور جائز موقع مل گیا۔ ٹھیکیدار کی بیٹی نے دولت مندی سے اپنا دماغ خراب نہ ہونے دیا۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے مقابلے میں جمیل کی کوئی حیثیت ہی نہیں اور وہ اس کا نوکر ہے۔

شائستہ (ٹھیکیدار کی بیٹی) کے لئے رشتے کا ایک بڑا اچھا پیغام آ گیا۔ لڑکا تعلیم یافتہ

اور بڑے امیر تاجروں کا بیٹا تھا۔ٹھیکیدار نے ہاں کر دی۔شائستہ نے اپنی ماں کو اعلانیہ طور پر کہہ دیا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور اگر اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تو وہ نکاح کے وقت کہہ دے گی کہ میں اس شخص کو قبول نہیں کرتی...... شائستہ نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ جمیل کے ساتھ شادی کرے گی۔

اُسے ماں نے پھر باپ نے اور بہنوں نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔اس کا ایک ہی بھائی تھا جو ذہنی طور پر معذور تو نہیں تھا، کم عقل اور احمق سا تھا۔اس نے شائستہ پر رعب جھاڑا تو شائستہ نے کہا کہ وہ خودکشی کر لے گی۔یہ طریقہ آزمایا گیا کہ جمیل کو شائستہ کے ساتھ کالج جانے سے روک دیا گیا اور اس احمق بھائی کو اس کے ساتھ تانگے میں جانے کو کہا گیا۔شائستہ نے کالج جانے سے انکار کر دیا۔

باپ نے سوچا کہ اس کی شادی ہو جانی ہے، آگے پڑھ کر کیا کرے گی۔اسے کالج جانے سے روک دیا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔شائستہ نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور ساتھ یہ ضد کہ جمیل کو بلاؤ۔جمیل اس گھر میں آتا جاتا تھا لیکن اسے روک دیا گیا تھا۔بیٹی کی حالت دیکھ کر ٹھیکیدار نے جمیل کو اپنے گھر بھیجنا شروع کر دیا۔

باپ کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔اس نے ساگری کو بتایا اور کہا کہ جمیل کو اس طرح مارا جائے کہ شائستہ یہ نہ سمجھے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔یہ اتفاقی یا حادثاتی موت لگے۔ساگری نے دو تین طریقے بتائے جو ٹھیکیدار نے اس وجہ سے مسترد کر دیئے کہ ان سے اغوا اور قتل کا شک ہوتا تھا۔یہ طریقہ ٹھیکیدار نے سوچا کہ جمیل کو بھٹے کی آگ میں پھینکا جائے۔ساگری کو یہ طریقہ سب سے زیادہ اچھا لگا۔

''یہ کام تم کرو گے''۔۔۔ ٹھیکیدار نے ساگری سے کہا۔

''میرے سوا اور کون ہے جو یہ کام کر سکے؟''۔۔۔ ساگری نے کہا۔۔۔ ''لیکن عالی جاہ! یہ بھی سوچ لیں کہ کسی نے دیکھ لیا تو پھانسی کا تختہ ہی ہے''۔

''پانچ ہزار ساگری!''۔۔۔ ٹھیکیدار نے کہا۔۔۔ ''کام ہوتے ہی پانچ ہزار روپیہ نقد صدشکریہ پیش کروں گا۔میری عزت بچاؤ ساگری!''

''جمیل نہ رہا تو کیا لڑکی آپ کی پسند کی شادی کر لے گی؟''۔۔۔ ساگر نے پوچھا۔

''مجھے امید ہے کر لے گی''۔۔۔ ٹھیکیدار نے کہا۔۔۔ ''نہیں کرے گی تو میں اس کا پتہ بھی کاٹ دوں گا''۔

ساگری اور ٹھیکیدار نے جمیل کو بھٹے کی آگ میں پھینکنے کا پلان بنایا۔ساگری نے کہا کہ بھٹے کے منشی کو چھٹی بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ جمیل کو بھٹے پر یہ بتا کر بھیجا جائے کہ منشی کی غیر حاضری میں وہ بھٹے پر کام کرے گا۔

''باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں''۔۔۔ ساگری نے کہا۔

پانچ ہزار میں بڑی طاقت تھی۔ساگری نے بھٹے کے منشی کو جس طرح چھٹی بھجوایا، وہ میں منشی کی زبان سے سنا چکا ہوں۔جمیل کو بھٹے پر بھیج دیا گیا۔تین چار دن میں ساگری نے اس کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی پیدا کر لی اور ایک دن بھٹے میں کچی اینٹیں رکھوا کر جہاں جہاں آگ جلانی تھی جلا دی گئی۔

ساگری نے جمیل سے کہا کہ آؤ تمہیں دکھاؤں کہ بھٹے میں کچی اینٹیں کیسے رکھی جاتی ہیں اور آگ کہاں کہاں جلائی جاتی ہے۔پھر دیکھنا کچی اینٹیں اور آگ کو کس طرح ڈھانپ دیا جاتا ہے۔

جمیل کو موت ساگری کے ساتھ لے گئی۔ساگری نے وہاں سے ان ورکروں کو جن کا وہاں کچھ نہ کچھ کام تھا، بھگا دیا اور انہیں کوئی اور کام بتا دیا۔جمیل کو بھٹے کے کنارے کے ساتھ ساتھ لے جاتا ساگری اس کے پہلو کے ساتھ ساتھ رہا۔آگے آگ کی ایک جگہ آ گئی۔تپش اتنی زیادہ تھی کہ جمیل کنارے سے دور ہٹنے لگا۔ساگری نے اسے ہاتھوں سے آگ میں نہیں دھکیلا بلکہ جمیل کو اپنا کولہا اتنی زور سے مارا کہ جمیل آگ میں جا پڑا۔وہ جگہ دس فٹ گہری تھی۔جمیل کی صرف ایک چیخ سنائی دی۔

ساگری نے شور مچایا۔مزدور اکٹھے ہو گئے۔جمیل جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ٹھیکیدار کو اطلاع دی گئی۔وہ آیا اور اس نے تھانے اطلاع دی۔آگ پر پانی پھینکا گیا تھا۔پانی گھڑوں اور کنستروں میں آنا تھا۔آگ تو بجھ گئی لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جل جانے والا کوئی انسان تھا یا کسی درخت کا ٹھن تھا۔

ساگری نے اپنے بیان میں کہا کہ علاقہ تھانیدار سب انسپکٹر صداقت علی خان آیا اور رسمی سے بیان لے کر چلا گیا۔

''صداقت علی نے تفتیش تو کی ہو گی!''۔۔۔ میں نے کہا۔

''خاک تفتیش کی تھی''۔۔۔ ساگری نے کہا۔۔۔ ''پانچ سو روپیہ لے کر اس نے لکھ دیا تھا کہ گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات کی روشنی میں متوفی حادثاتی موت مرا ہے۔

ہم تو خوش تھے عالی جاہ، کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے لیکن جمیل کی ماں کی فریادیں خدا نے سن لیں''۔

ساگری کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ٹھیکیدار ساگری جیسے جرائم پیشہ، چرسی اور شرابی کے ساتھ اتنا بے تکلف تھا کہ اپنی بیٹی کی محبت کی اور اپنے گھر کی نازک باتیں بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔

باپ بیٹی عدالت میں

ٹھیکیدار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

''خلیل الرحمان صاحب!'' ___ میں نے اس سے کہا ___ ''آپ کے لئے انکار کی اب ذرا سی بھی گنجائش نہیں رہی۔ کہیں تو ساگری کا اقبالی بیان اور گواہوں کے بیان سنا دوں؟''

اس نے بڑی لمبی آہ لے کر پوچھا ___ ''میرے لئے حکم؟''

''اقبالی بیان دے دو'' ___ میں نے کہا۔

''اور اس بیان میں یہ ضرور شامل ہو'' ___ انسپکٹر ٹینیسن نے کہا ___ ''کہ تم نے سب انسپکٹر صداقت علی خان کو پانچ سو روپیہ دے کر لکھوایا تھا کہ یہ حادثاتی موت ہے...... ہم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ کچھ چھپاؤ گے تو ہم یہاں تمہاری ہڈیاں توڑیں گے پھر عدالت میں پیش کریں گے''۔

اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو ساگری نے دیا تھا۔

''واہ اوئے ٹھیکیدار صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''اپنی بیٹی کی شادی جمیل کے ساتھ کر دیتے تو کیا ہو جاتا۔ جمیل تمہارا رشتہ دار ہی تھا''۔

''یہ تو میری بے عزتی تھی صاحب!'' ___ اس نے کہا ___ ''رشتہ داری تو بعد کی بات ہے، اصل بات یہ تھی کہ وہ میرا نوکر تھا اور غریب تھا''۔

''تمہیں ایک حدیث سناؤں!'' ___ میں نے ٹھیکیدار سے کہا ___ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔ حقیقت کو جھٹلانے اور دوسروں کو حقیر جاننے کو تکبر کہتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں...... تمہیں تکبر کی سزا مل رہی ہے۔ تم نے دولت کو خدا بنا لیا تھا''۔

ٹھیکیدار نے مجھے اور انسپکٹر ٹینیسن کو رشوت پیش کی۔

''مجھے اس کیس سے نکال دو'' ___ اس نے کہا ___ ''جتنی رقم کہو گے فوراً دوں گا''۔

''یتیم کا خون ہضم نہیں ہو سکتا ٹھیکیدار صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''یہ خون ہمیں تو نہ پلاؤ یار!...... ایک بیوہ ماں کی آہوں کا عذاب دیکھ لو''۔

ہماری تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ ٹینیسن نے اسی وقت ایس پی تھامسن کو جا کر اپنی کامیابی کی خبر سنائی اور اسے کہا کہ سب انسپکٹر صداقت علی خان کو معطل کرانا ہے۔

صرف اقبالی بیان ملزم کو سزا نہیں دلا سکتا۔ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت عدالت میں پیش کرنے پڑتے ہیں۔ ساگری نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ فلاں طوائف کے پاس گیا تھا اور شراب کے نشے میں اس نے طوائف کو بتایا تھا...... طوائف بیان میں شامل تھی اس لئے طوائف کو عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ اسے اطلاع بھجوا دی کہ اگلے روز ہمارے پاس آ جائے۔

چونکہ یہ قتل ٹھیکیدار کی بیٹی کے باغیانہ رویے کی وجہ سے ہوا تھا، اس لئے اس لڑکی کا بیان بحیثیت گواہ ضروری تھا۔ اسے بھی ہم نے اطلاع بھجوا دی کہ اگلے روز یہاں آ جائے۔

یہ خیال رہے کہ جمیل کے قتل کے بعد ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی شادی وہیں کر دی تھی جنہوں نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ ہم نے ٹھیکیدار کو حوالات میں بند کر دیا۔ ہم دونوں انسپکٹروں نے اس روز کی تفتیش یہیں پر رہنے دی اور اپنے اپنے ٹھکانے کو چل دیئے...... میں نے کہا کہ ہماری تفتیش مکمل ہو گئی تھی لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس تفتیشی کہانی کا ایک انتہائی جذباتی، عجیب و غریب اور دلوں کو ہلا دینے والا حصہ ابھی باقی ہے۔

اگلے روز ہمارے پاس جو گواہ آئے، ایک تو وہ طوائف تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ایسی بے تکلفی سے ہمارے پاس آ کر بیٹھی اور شوخیاں کرنے لگی جیسے ہم نے اسے مجرے کے لئے بلایا ہے اور اسے یہاں ویلیں ملیں گی۔ ہم نے اسے بتایا کہ وہ گواہ ہو گی اور عدالت میں بیان دے گی۔ میں نے اس کا بیان لکھ لیا اور اسے فارغ کر دیا۔

دوسری گواہ ٹھیکیدار کی بیٹی شائستہ تھی جو اپنے خاوند کے ساتھ آئی تھی۔ میں اس وقت طوائف کا بیان لکھ رہا تھا۔ طوائف کو فارغ کر کے شائستہ کو بلایا۔ اس کی بجائے اس کا خاوند ہمارے پاس آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ شائستہ کا خاوند ہے۔

''آپ شائستہ کو ہمارے پاس بھیجیں''۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ ''اور آپ بالکل مطمئن رہیں۔ آپ کی بیگم سے ایک دو باتیں پوچھنی ہیں پھر انہیں آپ کے ساتھ ہی بھیج دیں گے''۔

''جی نہیں!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میرا یہ مطلب نہیں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیجنے سے پہلے میں آپ کو ایک دو ضروری باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ پھر آپ اسے الگ بٹھا کر جو چاہیں پوچھیں''۔

میں نے انسپکٹر ٹینیسن کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا کہ اس کی بات سن لی جائے۔ میں نے اسے بٹھایا اور یہ بہتر سمجھا کہ اسے بتا دیا جائے کہ ٹھیکیدار گرفتار ہو چکا ہے تا کہ اس نے جو بھی بات کرنی ہے اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کرے کہ اب ٹھیکیدار ان کے ساتھ نہیں بلکہ اب وہ ہمارا قیدی ہے۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو ہم نے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ اس نے چونک کر حیرت زدگی کے لہجے میں کہا۔۔۔ ''کیا واقعی؟''...... مجھے امید ہے کہ میری بیوی یہ خبر سن کر خوش ہوگی کہ اس کا قاتل باپ پکڑا گیا ہے''۔

''قاتل؟''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔۔۔ ''آپ کو کس نے بتایا کہ ٹھیکیدار قاتل ہے؟''

''میری بیوی کو یہی شک تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''میری بیوی سے آپ سب کچھ پوچھ ہی لیں گے۔ میں آپ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جو آپ سن کر شاید حیران ہوں گے...... ٹھیکیدار کی اس بیٹی کے ساتھ میری شادی ہوئی۔ میں بہت خوش تھا کہ ایک بڑی خوبصورت اور ہر لحاظ سے اچھی لڑکی کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے لیکن پہلی رات جب میں اس لڑکی شائستہ کے پاس بیٹھا تو اس نے بڑے ہی پیارے انداز سے یہ الفاظ کہے کہ آپ نے مجھے اغوا نہیں کیا نہ ہی آپ نے یا آپ کے والدین نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے، اس لئے میں آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کروں گی نہ آپ کو کسی اور طریقے سے پریشان کروں گی۔ میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے آپ کو دل سے قبول نہیں کیا لیکن میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرا جسم آپ کا ہے، آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں،

لیکن جذباتی طور پر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی......

''میں نے اس کی اس بات پر کوئی شدید یا بیہودہ ردِعمل ظاہر نہ کیا لیکن جناب میں مرد ہوں، میں تو سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ بیوی سے پوچھا کہ میں اس کی پسند کا خاوند نہیں یا وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ اس نے بلا جھجک کہا کہ آپ نے سنا ہوگا کہ میرے ابا جان کے بھٹے پر ایک نوجوان آدمی آگ میں گر کر جل گیا ہے...... میں نے اسے بتایا کہ میں جانتا ہوں اور میں اس لڑکے کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ میری بیوی نے کہا میں اس لڑکے کو چاہتی تھی اور میں نے اپنے والدین سے کہہ دیا تھا کہ میری شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔ میرے باپ نے جب دیکھا کہ میں نہیں مان رہی تو ایک روز خبر آئی کہ یہ لڑکا جس کا نام جمیل تھا بھٹے پر آگ میں گر کر جل گیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ اسے آگ میں گرایا گیا ہے۔ بھٹے پر جمیل کا کوئی کام نہیں تھا۔ اسے میری زندگی سے نکالنے کا یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ پھر میری بیوی نے مجھے یہ بھی کہا کہ آپ یہ نہ سمجھنا کہ جمیل کے ساتھ میرے تعلقات ناجائز تھے۔ میری عصمت محفوظ ہے۔ جمیل کو میری زندگی سے نکالا گیا ہے، اسے کوئی طاقت میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔ میں آپ سے باغی نہیں ہوں گی۔ آپ جو کہیں گے میں اسے حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کروں گی لیکن جذباتی طور پر میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ایک زندہ لاش ہوں جس کے ساتھ آپ کھیل سکتے ہیں......

''معلوم نہیں صاحب! کیا بات ہوئی کہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی کو پناہ دوں گا اور اسے کھلونا نہیں بناؤں گا اور اپنے ماں باپ کو یا کسی اور کو پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ اس نے میرے ساتھ یہ بات کی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں بغیر کسی گلے شکوے کے اسے اپنے ساتھ رکھوں گا، اس کے جسم کو خاوند بن کر استعمال نہیں کروں گا اور میں اسے اجازت دیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کھل کر باتیں کرے، جمیل کی باتیں کرے اور میں وہی کروں گا جو وہ کہے گی...... میں نہیں سمجھ سکتا کہ میرا یہ کہنا ایک نیکی ہے یا بزدلی لیکن یہ باتیں کہہ کر مجھے روحانی سی تسکین محسوس ہوئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اپنی آنکھوں سے لگائے اور پھر وہ بہت روئی۔ وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ آج ہماری شادی کو بیس اکیس روز ہو گئے ہیں، میں نے خاوند کی حیثیت سے اس کے جسم کو بیوی کا جسم سمجھ کر استعمال نہیں کیا یعنی جسمانی طور پر ہم ابھی تک میاں بیوی بنے ہی نہیں''۔

''کیا آپ ساری عمر اسی طرح گزار دیں گے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب!''۔۔۔ اس نے خود اعتمادی سے کہا۔۔۔ ''میں نے خدا کے نام پر اس لڑکی کو مظلوم سمجھ کر اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ مجھے خدا کی درگاہ سے پوری امید ہے کہ میری یہ نیکی ضائع نہیں جائے گی۔ اگر میں اسے طلاق دے دوں تو اس کا ظالم باپ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ لڑکی خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ سکتا ہے۔ اس ذہنی حالت میں یہ گھر سے نکل گئی تو بہت برے انجام کو پہنچے گی پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ مجھے اپنا سہارا اور پناہ سمجھ رہی ہے۔ شادی کے بعد ایک بار بھی اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ اس کے ماں باپ تین چار مرتبہ میرے گھر آئے تو یہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ جب بھی آ کر چلے جاتے تو میری بیوی کہتی کہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔ انہیں کہو کہ میرے گھر نہ آیا کریں...... اب میں اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں''۔

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے ہی رہے۔ میں نے اپنی سروس میں عجیب وغریب کردار دیکھے ہیں لیکن یہ شخص سب سے زیادہ انوکھا اور عجیب تھا۔ ہم دونوں انسپکٹر ابھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی، بڑے ہی سمارٹ جسم والی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔

''کیا آپ نے واقعی میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے؟''۔۔۔ شائستہ نے اداس سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں شائستہ!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کل اسے اور اس کے یار ساگری کو جمیل کو آگ میں پھینک کر قتل کر دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے''۔

''اللہ تیرا شکر!''۔۔۔ شائستہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دوپٹہ ہاتھوں میں پھیلا کر کہا۔۔۔ ''قاتل آخر پکڑے گئے۔ اب میری روح کی تسکین مل گئی ہے''۔

''کیا تمہیں اپنے والد صاحب کی گرفتاری کا افسوس نہیں؟''۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ شائستہ نے دانت پیس کر کہا۔۔۔ ''مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنا چاہتی ہوں''۔

ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں

[illegible] ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے، ہم نے اس سے یہ تصدیق کرانی تھی کہ یہ [illegible] چاہتی تھی اور مقتول کے قتل کا باعث یہی تھا۔ میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے دو چار [illegible] کر کے یہ تصدیق کر لی اور شائستہ سے پوچھا کہ وہ عدالت میں بیان دینے آئے [illegible]

''[illegible] یوں نہیں آؤں گی''۔۔۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔۔۔ ''میں چلا چلا کر لوگوں کو [illegible] یہ شخص قاتل ہے اور قتل کی وجہ یہ ہے''۔

ہم نے شائستہ اور اس کے خاوند کو رخصت کر دیا لیکن یہ دونوں مجھے جذباتی طور پر ہلا [illegible]

[illegible] کا بیان زیر دفعہ 164 مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کے اسے جوڈیشل لاک اپ [illegible] دیا۔ ٹھیکیدار نے مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ دو روز ہماری [illegible] میں رہا پھر خود ہی بیان دینے پر آ گیا۔ اس کا بیان لے کر ہم نے جوڈیشل لاک اپ [illegible] دیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ مقدمہ تو ویسے ہی چلتا رہا جیسے ہر مقدمہ چلا کرتا ہے لیکن شائستہ [illegible] دینے آئی تو کورٹ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ ہاتھ باپ کی طرف بڑھا بڑھا کر بیان [illegible] تھی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ دو تین مرتبہ سیشن جج نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی [illegible] اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے بیان تو ٹھیک دیا لیکن وہ آگ بگولہ بنی ہوئی تھی۔ [illegible] وکیل کی جرح کے جواب بھی اس نے پوری خود اعتمادی اور جوش و خروش سے [illegible] میں بطور نمونہ اس جرح کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں جو مجھے آج تک یاد ہے۔

''کیا تم جمیل کو چاہتی تھیں؟''۔۔۔ صفائی کے وکیل نے شائستہ سے پوچھا۔

''ہاں!''۔۔۔ شائستہ نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔۔۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے [illegible] جان سے چاہتے تھے''۔

''کیا تمہارے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے؟''۔۔۔ وکیل صفائی نے پوچھا۔

''لعنت تمہارے اس مکروہ چہرے پر!''۔۔۔ شائستہ نے جواب دیا۔

کورٹ میں جتنے لوگ تھے وہ سب ہنس پڑے۔ سیشن جج نے اسے کہا کہ وہ بدتمیزی [illegible] وکیلوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں۔

''پھر یہ حق مجھے بھی دیں کہ میں جو جواب چاہوں دوں''۔۔۔ شائستہ نے جواب دیا۔

یہ تو خاصی لمبی چوڑی باتیں ہیں میں آپ کو مقدمے کا انجام بتاتا ہوں۔ ٹھیکیدار کو آٹھ

"انسپکٹر صاحب!"۔۔۔ اس نے خود اعتمادی سے کہا۔۔۔ "میں نے خدا کے نام پر اس لڑکی کو مظلوم سمجھ کر اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔ مجھے خدا کی درگاہ سے پوری امید ہے کہ میری یہ نیکی ضائع نہیں جائے گی۔ اگر میں اسے طلاق دے دوں تو اس کا ظالم باپ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ لڑکی خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ سکتا ہے۔ اس ذہنی حالت میں یہ گھر سے نکل گئی تو بہت برے انجام کو پہنچے گی پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ مجھے اپنا سہارا اور پناہ سمجھ رہی ہے۔ شادی کے بعد ایک بار بھی اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ اس کے ماں باپ تین چار مرتبہ میرے گھر آئے تو یہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ جب بھی آ کر چلے جاتے تو میری بیوی کہتی کہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔ انہیں کہو کہ میرے گھر نہ آیا کریں...... اب میں اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں"۔

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں اور انسپکٹر ٹینیسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے ہی رہے۔ میں نے اپنی سروس میں عجیب و غریب کردار دیکھے ہیں لیکن یہ شخص سب سے زیادہ انوکھا اور عجیب تھا۔ ہم دونوں انسپکٹر ابھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی، بڑے ہی سمارٹ جسم والی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔

"کیا آپ نے واقعی میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے؟"۔۔۔ شائستہ نے اداس سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں شائستہ!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "کل اسے اور اس کے یار ساگری کو جمیل کو آگ میں پھینک کر قتل کر دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے"۔

"اللہ تیرا شکر!"۔۔۔ شائستہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دوپٹہ ہاتھوں میں پھیلا کر کہا۔۔۔ "قاتل آخر پکڑے گئے۔ اب میری روح کو تسکین مل گئی ہے"۔

"کیا تمہیں اپنے والد صاحب کی گرفتاری کا افسوس نہیں؟"۔۔۔ انسپکٹر ٹینیسن نے پوچھا۔

"نہیں!"۔۔۔ شائستہ نے دانت پیس کر کہا۔۔۔ "مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اس شخص کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنا چاہتی ہوں"۔

ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں

اور اس کی ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے، ہم نے اس سے یہ تصدیق کرانی تھی کہ یہ مقتول کو چاہتی تھی اور مقتول کے قتل کا باعث یہی تھا۔ میں نے اور انسپکٹر ٹینیسن نے دو چار سوالات کر کے یہ تصدیق کر لی اور شائستہ سے پوچھا کہ وہ عدالت میں بیان دینے آئے گی؟

"کیوں نہیں آؤں گی"۔۔۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔۔۔ "میں چلا چلا کر لوگوں کو سناؤں گی کہ یہ شخص قاتل ہے اور قتل کی وجہ یہ ہے"۔

ہم نے شائستہ اور اس کے خاوند کو رخصت کر دیا لیکن یہ دونوں مجھے جذباتی طور پر ہلا گئے۔

ساگری کا بیان زیر دفعہ 164 مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کے اسے جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا۔ ٹھیکیدار نے مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ دو روز ہماری حوالات میں رہا پھر خود ہی بیان دینے پر آ گیا۔ اس کا بیان لے کر ہم نے جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ مقدمہ تو ویسے ہی چلتا رہا جیسے ہر مقدمہ چلا کرتا ہے لیکن شائستہ جب گواہی دینے آئی تو کورٹ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ ہاتھ باپ کی طرف بڑھا بڑھا کر بیان دیتی اور کہتی تھی کہ یہ شخص قاتل ہے۔ دو تین مرتبہ سیشن جج نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکی اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے بیان تو ٹھیک دیا لیکن وہ آگ بگولہ بنی ہوئی تھی۔ صفائی کے وکیل کی جرح کے جواب بھی اس نے پوری خود اعتمادی اور جوش و خروش سے دیئے۔ میں بطور نمونہ اس جرح کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں جو مجھے آج تک یاد ہے۔

"کیا تم جمیل کو چاہتی تھیں؟"۔۔۔ صفائی کے وکیل نے شائستہ سے پوچھا۔

"ہاں!"۔۔۔ شائستہ نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔۔۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے"۔

"کیا تمہارے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے؟"۔۔۔ وکیل صفائی نے پوچھا۔

"لعنت تمہارے اس مکروہ چہرے پر!"۔۔۔ شائستہ نے جواب دیا۔

کورٹ میں جتنے لوگ تھے وہ سب ہنس پڑے۔ سیشن جج نے اسے کہا کہ وہ بدتمیزی نہ کرے، وکیلوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں۔

"پھر یہ حق مجھے بھی دیں کہ میں جو جواب چاہوں دوں"۔۔۔ شائستہ نے جواب دیا۔

یہ تو خاصی لمبی چوڑی باتیں ہیں میں آپ کو مقدمے کا انجام بتاتا ہوں۔ ٹھیکیدار کو آٹھ

سال سزائے قید ہوئی اور ساگری کو سزائے موت دی گئی۔ دونوں نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں۔ دونوں اپیلیں مسترد ہوگئیں۔

ہمارا ایک کیس ختم ہوگیا اور ہم نے ایس پی تھامسن سے داد و تحسین حاصل کی لیکن ہم نے سب سے زیادہ دعائیں شائستہ سے لیں۔ دو تین مہینوں تک شائستہ اور اس کا خاوند میرے ذہن پر سوار رہے۔

تقریباً ایک سال بعد میں اپنی بیوی اور بچوں کو سیر سپاٹے کے لئے آگرہ لے گیا۔ میری بیوی کو تاج محل بہت ہی پسند تھا۔ دو بار پہلے دیکھ چکی تھی۔ وہاں گئے تو وہاں شائستہ اور اس کا خاوند مل گئے۔ وہ بھی سیر کے لئے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ شائستہ کچھ زیادہ ہی خوش و خرم تھی۔ انہوں نے پہلی خبر یہ سنائی کہ ساگری تو پھانسی چڑھ گیا تھا اور ٹھیکیدار کو جیل میں تین مہینوں بعد فالج کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ وہ مر گیا۔

''اس کی لاش گھر آئی تو میں وہاں نہیں گئی تھی'' ـــــ شائستہ نے کہا ـــــ ''میرے سسرال کے سب لوگ گئے تھے، میں نہیں گئی...... میرا باپ جب گرفتار ہوا تھا تو میرا ذہن کچھ کچھ ٹھکانے آ گیا تھا۔ جب میرے باپ کو آٹھ سال سزا ہوئی تو میرا ذہن آدھے سے زیادہ بیدار ہوگیا اور جب اس کی موت کی اطلاع ملی تو میں پوری طرح اپنے آپ میں آ گئی۔ یہ میرا خاوند سن رہا ہے، میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا کہ میں اب جذباتی اور روحانی لحاظ سے آپ کی ہوں۔ ان سے پوچھ لیں، میں تو کہتی ہوں کہ یہ ایک فرشتہ تھا جو اللہ نے میری نجات کے لئے اتارا ہے۔ کون سا وہ خاوند ہے جو بیوی کی ایسی باتیں برداشت کر لے گا جو انہیں میں نے پہلی رات کہی تھیں۔ میں انہیں اس نیکی کا پورا پورا صلہ دے رہی ہوں''۔

میں نے اس کے خاوند کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔

''اب ہم صحیح معنوں میں میاں بیوی ہیں'' ـــــ شائستہ کے خاوند نے کہا۔

یہ ان کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی۔ چند مہینوں بعد پاکستان کے قیام کا اعلان ہوگیا اور میں یوم آزادی سے کچھ پہلے ہی پاکستان آ گیا۔

✦ ختم شد ✦